دھنک رنگ جذبوں کا نمائندہ

کتابی سلسلہ

دستخط

بارک پور

قیصر شمیم نمبر

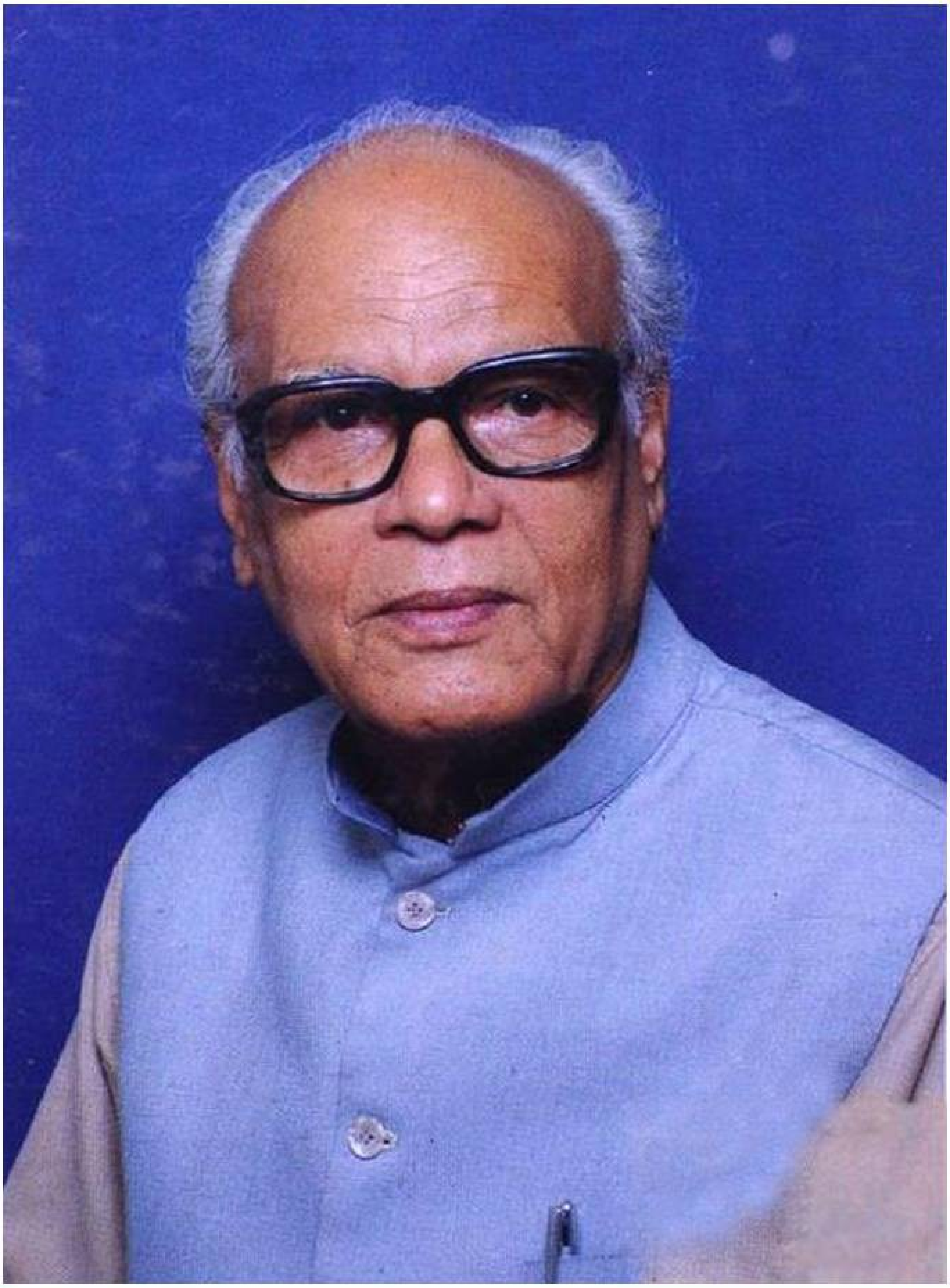

مدیر: اختر بارک پوری

مرتب: فراغ روہوی

www.taemeernews.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دو ماہی **دستخط** بارک پور

کی خصوصی پیشکش

قیصر شمیم نمبر

www.taemeernews.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیاد دادا حضور حضرت سیدنا سید حسین شاہ قادری حنفی حسنی الحسنی بلہاری بنگلوریؒ
و والد محترم سیدنا عبد العزیز شاہ قادریؒ

دھنک رنگ جذبوں کا تر.

دو ماہی **دستخط** بارک پور

کی خصوصی پیشکش

قیصر شمیم نمبر

اکتوبر ۲۰۰۵ء

مدیر : اختر بارک پوری   مدیر معاون : اکرم بارک پوری

مرتب : فراغ روہوی

رابطہ :

آدٹ پوسٹ روڈ، نئی بستی، پوسٹ : بارک پور، کولکاتا - 700120

فون (مدیر) : 2640 2593 (033)

فون (مرتب) : 58253 94331 (M) 2519 2235 (033)

www.taemeernews.com

دو ماہی **دستخط** بارک پور

Bi-Monthly *Dastkhat* Barrackpur

ادارہ "**دستخط**" غیر طلبیدہ مضامین شائع کرنے سے قاصر ہے۔
"**دستخط**" میں شائع ہونے والی تحریروں سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔
تمام تحریروں میں نام، مقام اور واقعات میں مطابقت کو محض اتفاقیہ سمجھا جائے گا۔
"**دستخط**" میں شائع شدہ تحریریں حوالے کے ساتھ نقل کی جا سکتی ہیں۔
"**دستخط**" سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حق سماعت صرف کلکتہ کی عدلیہ کو حاصل ہوگا۔

شرح برائے خریداری

اس شمارے کی قیمت	*	200	روپے
غیر ممالک کے لیے	*	10	امریکی ڈالر

پوسٹل آرڈر، چیک اور بینک ڈرافٹ پر
صرف FARAGH ROHVI تحریر فرمائیں۔

ترسیل زر اور مراسلت کا پتہ :

The Editor, *Dastkhat* Bi-Monthly
Out Post Road, Nal Bustee, Post. Barrackpur, Kolkata - 700 120

طابع، ناشر و مالک سید انور حسین نے گلوزی آرٹ پریس، 17/H/6/2- کنال ویسٹ روڈ، کولکاتا-9
سے چھپوا کر آؤٹ پوسٹ روڈ، نل بستی پوسٹ : بارک پور، کولکاتا - 700120 سے شائع کیا۔

www.taemeernews.com

دستخط اہلِ قلم

اداریہ	ادارہ	حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا	7
تعارفِ قیصر	سعدیہ صدف	صاحبِ اعزاز کا تعارفی خاکہ	10
چہرۂ قیصر	سید حسن	صاحبِ اعزاز	13
کلامِ قیصر	قیصر شمیم	مختلف اصنافِ سخن	17-63
قدرِ قیصر	علقمہ شبلی ، اعزاز افضل ، احمد رئیس ، ابوالخدر		64-67
	مشتاق جاوید ، ایم۔کے۔اثر ، انجم باروی ، حلیم صابر ، شبیر ابروی		68-71
	علیم الدین علیم ، معین الدین شاہین ، ہارون شارب ، بدرالدین بدر		72-73
	اشرف علی اشرف ، محمد رفیع احمد ، خالد قمر ، قمر رئیس بہرائچی		74-77
	احمد کمال حشمی ، نور اقبال ، شاہد فروغی ، محسن باعشن حسرت ، نسیم فائق		78-82
	مشتاق افضل ، شمس افتخاری ، اصغر ندیم نظامی		83-84
	شاہد اقبال ، اکرم بارک پوری ، اختر بارک پوری ، فراغ روہوی		85-86
پیکرِ قیصر	سید منیر نیازی	ہمارے شیخ	87
	زرانا	ہم سکھا دیں گے ہر اک قطرے کو طوفاں ہونا	93
	فراغ روہوی	میرے قلم کو تیشۂ فرہاد جانیے	99
عکسِ قیصر	محمود ایوبی	سرتاپا دل	104
	اشہر ہاشمی	خشک پتوں کے ڈھیر کی چرمراہٹ	112
	ڈاکٹر خالدہ حسینی	تو آں شاہے	115
	ڈاکٹر ہری کنور رائے	سوانح عمری قیصر شمیم	126
	ایم۔کے۔اثر	قیصر شمیم اور ان کی شخصیت	137
	اشرف جعفری	قیصر شمیم میری نظر میں	142
	نعیم انیس	قیصر شمیم : ایک شجر سایہ دار	162
غزلِ قیصر	مظہر امام	قیصر شمیم اور غزل کی نئی دھار	168
	پروفیسر علیم اللہ حالی	عرفانِ حیات کا شاعر : قیصر شمیم	173
	پروفیسر نصر غزالی	قیصر شمیم : شکستِ خواب کا نوحہ خواں	177
	ظہیر انور	قیصر شمیم : شخص اور شاعر	182

www.taemeernews.com

		ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	سانس کی دھار : استفسار......	191
		علیم صبا نویدی	قیصر شمیم کی شعری اڑانیں	195
		ف.س.ا.	قیصر شمیم کا لہجہ اور شعری رویے	199
		رؤف خیر	قیصرِ قصرِ ادب	203
		معین اعجاز	مجموعۂ غزلیات 'سانس کی دھار' کا شاعر : قیصر شمیم	207
		سید شعیب رضا فاطمی	گھوڑے کی ڈھائی چال سے آگے؟	209
		کمال جعفری	'ساعتوں کا سمندر' اور قیصر شمیم	213
		ابوذر ہاشمی	تخلیقی اظہار اور لسانی معیار کی کشمکش کا شاعر	215
		کلیم حاذق	قیصر شمیم : 'ساعتوں کا سمندر' سے......	226
		ڈاکٹر معصوم شرقی	قیصر شمیم : 'ساعتوں کا سمندر' سے آگے	232
		عادل حیات	قیصر شمیم کی غزلوں میں پیکر تراشی	236
		ڈاکٹر شکیل اختر	لطیف جذبوں کا شاعر قیصر شمیم	245
		محمد شمشیر عالم	قیصر شمیم : عصری حسیت کی کامیاب نمائندگی	249
نظم قیصر	*	ڈاکٹر سید احمد شمیم	قیصر شمیم : زندگی کی مہک کا شاعر	253
		عشرت ظفر	قیصر شمیم کی نظموں میں تیشہ گری	260
		ڈاکٹر مناظر عاشق	قیصر شمیم کی نظمیہ شاعری میں تخلیقی آگہی	263
		ڈاکٹر مولا بخش اسیر	جیون پتھ پر قیصر شمیم کی نظمیہ لکیریں	274
		شبیر احمد	قیصر شمیم اور ان کا اشتراکی شعور	292
		ڈاکٹر کوثر مظہری	قیصر شمیم کی نظمیں	306
		ڈاکٹر محمد نوشاد عالم	نظم نگاری کا فرہاد : قیصر شمیم	311
		اسلم حنیف	قیصر شمیم کی شاعری میں کرۂ ارضی کی محوری......	323
		ڈاکٹر سیفی سرونجی	قیصر شمیم : پہاڑ کاٹتے ہوئے	330
		خالق عبداللہ	قیصر شمیم کی شاعری یا کارگہِ شیشہ گری	334
		سلیم انصاری	قیصر شمیم کی نظموں پر ایک نظر	338
		ڈاکٹر افضال عاقل	انسانی تجربوں کے مزاج شناس : قیصر شمیم	342
نغمۂ قیصر	*	ڈاکٹر ناصر علی انصاری	گیت کا تصور اور قیصر شمیم	350
نثرِ قیصر	*	مشتاق انجم	قیصر شمیم کے نثری فن پارے	357
آئینۂ قیصر	*	ہم جس طرف چلے ہمیں پرچھائیاں ملیں		369

www.taemeernews.com

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قیصر شمیم ایک شخص کا نہیں، ایک فرد کا نہیں، ایک شخصیت کا نام ہے، ایک عہد کا نام ہے، ایک تہذیب کا نام ہے۔ بنگال کی ادبی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی، اس میں قیصر شمیم کا تذکرہ ناگزیر ہی نہیں نمایاں ہوگا۔ بنگال کی ادبی تہذیب اور قیصر شمیم ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط قیصر شمیم کے ادبی کارناموں کی شناخت تو اب بنگال سے باہر بھی کی جانے لگی ہے اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ بیسویں صدی کے آخری نصف میں جن شعراء کرام کے نام نمایاں ہوئے ہیں ان میں قیصر شمیم بھی شامل ہیں بلکہ بعض اعتبار سے قیصر شمیم کا قد کچھ نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے!

قیصر شمیم نے گذشتہ نصف صدی میں گیسوئے شعر و ادب کو سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ ان کی شاعری کے مقام و معیار کا تعین ہماری ذمہ داری نہیں کہ ملک کے جید اور نامور لکھنے والوں نے اس سے متعلق اپنی آراء پیش کردی ہیں جن سے ان کے ادبی مقام و معیار کے تعین میں یقیناً مدد ملے گی۔ لیکن ایک خاص گوشہ جس کی نشاندہی انتہائی ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی ذاتِ گرامی نے بنگال میں شعر و ادب کی ایک اعلیٰ سطح کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دراصل قیصر شمیم ایک شاعر نہیں، قلم کار نہیں بلکہ اردو زبان کے سپاہی ہیں، مردِ مجاہد ہیں، اس کے خادم ہیں، اور جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے شب و روز زبان و ادب کے فروغ میں ہی گزرتے ہیں۔ سرزمینِ بنگالہ میں انھوں نے ادبی و علمی فضا تیار کرنے میں خود کو ہر وقت لگا کر رکھا ہے، اور کئی نسلوں کی ذہنی و فکری آبیاری کی ہے۔

شخصی اعتبار سے بھی قیصر شمیم ایک فرد کا نہیں، ایک تحریک اور جہدِ مسلسل کا نام ہے، اور یہ تحریک ہے زندگی کی مثبت قدروں کو بچائے رکھنے کی۔ قیصر شمیم شہر کے اہلِ دول میں شمار نہیں ہوتے بلکہ ملازمت کے بعد پنشن ان کے لیے معاش کے حصول کا ذریعہ ہے۔ لیکن قلندر تو دولت کی پرستش نہیں کیا کرتے اور اس مردِ قلندر نے بھی اپنے اس قلیل آمدنی میں سے کئی گھروں کی کفالت کی ہے۔ خود تو کم کم کھانا، لیکن تعلق والوں کی خبر گیری کرنا اور ان کی ضرورتوں میں دستِ تعاون دراز کرتے رہنا، وہ اوصاف ہیں جو قحط الرجال کے اس دور میں ہر کس و ناکس کو نہیں

www.taemeernews.com

ملتے۔ سچ تو یہ ہے کہ قیصر شمیم تمام عمر تنگ دستی کا شکار اس لیے رہے کہ انھوں نے اپنوں کے ساتھ ساتھ اوروں کا بھی خیال رکھا۔ کسی نوجوان کی تعلیم' فیس کی کمی کی وجہ سے رک رہی ہے تو خاموشی کے ساتھ وہ رقم اس کی جیب میں آ گئی اس حکم کے ساتھ کہ فوراً جا کر فیس جمع کرو اور پھر ہمیں خبر کرو۔ ایسے کئی لوگ آج اچھے مقام پر ہیں جن کا تعلیمی سلسلہ صرف اور صرف قیصر شمیم کی اعانت یا بر وقت مداخلت ہی سے جاری رہ سکا۔ اس لیے قدرت نے ان کے حصے میں وہ چاہت بھی ڈال دی جس پر ان کے ہم عصروں کو رشک آتا ہے بلکہ کبھی کبھی حسد بھی ہوتا ہے!

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایک ایسی شخصیت جو ہشت پہلو ہو۔ اس پر کسی رسالے کا ایک گوشہ یا نمبر شائع ہو بھی جائے تو حق ادا نہیں ہوتا۔ قیصر شمیم کی ادبی خدمات کے اعتراف میں سہ ماہی "مژگاں" کلکتہ کا گوشہ شائع ہوا' اردو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کی راجدھانی دہلی میں گذشتہ سال ان کا جشن منایا گیا اور حال ہی میں ان کی ادبی خدمات کا جائزہ ایک کتاب" دیا ساگر' وِدیا ساگر" میں پیش کیا گیا۔ لیکن ان تمام کاوشوں کے باوجود قیصر شمیم کی مختلف جہات کا اعتراف ہونا ابھی باقی ہے۔ کاوشیں شروع ہوئی ہیں اور" دستخط" کا یہ شمارہ بھی اسی سلسلے کی ایک اہم اور مستحکم کڑی ہے۔ ہمارا مقصد ایک فنکار کی تمام عمر کی ریاضت و خدمات کو صرف خراج عقیدت یا داد و تحسین پیش کرنا ہی نہیں ہے' ہم نے کوشش کی ہے کہ اس مطالعے سے ان کی شخصیت کی مختلف جہتیں سامنے آئیں۔ ہماری یہ بھی کوشش رہی ہے کہ مضامین میں یکسانیت نہ ہو اور ان کی گراں قدر خدمات کو تحقیق و تنقید کا اعتبار بھی حاصل ہو۔ ادارہ اس خیال کا حامل رہا ہے کہ توصیف محض کسی شخصیت کی وقتی پذیرائی تو ہو سکتی ہے لیکن اصل اہمیت تخلیق کردہ ادب پاروں کے تجزیاتی مطالعے کی ہوتی ہے جو اس کا جائز مقام متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس رسالے میں ایسے مضامین بھی ملیں گے جو قارئین کے لیے بحث کے دروازے کھولتے ہیں۔ آنے والے وقتوں میں قیصر شمیم کی ادبی خدمات کے مطالعے کو سلسلہ در سلسلہ ہونا ہے۔ ہمارے خیال میں قیصر شمیم کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں' جو کسی شاعر کو وقت سے ماورا کرتی ہیں۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ان خصوصیات کا پتہ لگایا جائے' مباحث کے دروازے کھولے جائیں' قیصر شمیم نے اپنے عصر کی آواز کو کس حد تک سنا ہے' اپنی تہذیب کو اپنی شاعری میں کس درجہ برتا ہے اور ماضی کے ورثے سے کتنا استفادہ کیا ہے' اس کا جائزہ لیا جائے۔

یہ نمبر اسی مقصد کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سمت میں ہم کس حد تک کامیاب یا ناکام ہوئے ہیں اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ باشعور قارئین ہی بہترین ناقد ہوا کرتے ہیں اور ان کا فیصلہ ہی آخری اور معتبر ہوگا! ہماری تو صرف یہ خواہش ہے کہ نئی نسل کے جن لوگوں نے قیصر شمیم کو محسوس نہیں کیا' وہ اس

www.taemeernews.com

مطالعے کے ذریعہ انھیں دیکھیں، پرکھیں، سوچیں، جانیں اور سمجھیں، رواں صدی میں ان کی فکر ونظر کے ساتھ صبح وشام کرتے رہیں۔ یقین جانیے کہ قیصر شمیم کی شاعری نامساعد حالات میں بھی قاری کو روشنی فراہم کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ البتہ اس روشنی کو دیکھ پانے والی نظر چاہیے۔

ہم ان تمام قلم کار حضرات کے ممنون کرم ہیں جنھوں نے ہماری ایک آواز پر لبیک کہتے ہوئے "قیصر شمیم نمبر" کے لیے ہمیں اپنے گراں قدر مضامین اور مفید مشوروں سے نوازا۔ بالخصوص دیدہ ور مصور جناب محمد یوسف، ہیڈ ماسٹر محمد جان ہائر سیکنڈری اسکول کے شکر گزار ہیں جنھوں نے عدیم الفرصتی کے باوجود قیصر شمیم کا خوبصورت پورٹریٹ اسکیچ کیا۔

آپ کو یہ شمارہ کیسا لگا، مکمل کر اظہار فرمائیں۔ آپ کی بے لاگ رائے کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

انشاء اللہ

دوماہی "دستخط" بارک پور کا آئندہ شمارہ "عالمی حمد نمبر" ہوگا۔

اس نمبر کی اشاعت کا مقصد صرف حمدیہ شاعری کو فروغ دینا ہے۔ کیوں کہ ہندستان میں حمدیہ شاعری کے فروغ کے لیے اب تک خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا جب کہ پاکستان میں اس جانب بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ وہاں حمدیہ ادب پر کئی معیاری رسالے مخصوص ہیں جو باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ شائع بھی ہو رہے ہیں۔

امید کرتے ہیں کہ حسب روایات اس عظیم الشان شمارے کو بھی ہر اعتبار و جہت سے منفرد اور دلآویز بنانے میں ہمیں ایک بار پھر آپ کا ہر طرح سے تعاون حاصل ہوگا۔

(ادارہ)

www.taemeernews.com

سعدیہ صدف
کلکتہ

صاحبِ اعزاز کا تعارفی خاکہ

خاندانی نام	عبدالقیوم خاں
سابق ادبی نام	عمید انگسی (۱۹۵۱ء سے جون ۱۹۵۷ء تک)
موجودہ ادبی نام	قیصر شمیم (جولائی ۱۹۵۷ء تا حال)
والد	جناب عبدالرحیم خاں (مرحوم)
والدہ	محترمہ سکینہ خاتون (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	۲؍اپریل ۱۹۳۶ء (اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق)
جائے پیدائش	انگس (Angus) ضلع : ہگلی (مغربی بنگال)
آبائی وطن	غازی پور (یو. پی.)
تعلیم	(۱) ہگلی ہائی مدرسہ سے ہائی مدرسہ اگزامنیشن فرسٹ ڈویژن (بورڈ میں سیکنڈ پوزیشن) (۲) سینٹرل کلکتہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) سے آئی. اے. فرسٹ ڈویژن (۳) سینٹرل کلکتہ کالج ہی میں انگریزی آنرز لے کر بی. اے. کی تعلیم حاصل کی لیکن فائنل امتحان سے پہلے ہی ملازمت کرلی اور بعد میں آنرز کے بغیر بی. اے. پاس کیا (۴) کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم. اے. (فرسٹ کلاس)
شادی	۱۸؍اگست ۱۹۵۱ء کو پھوپھی زاد بہن محترمہ نجمہ قیصر سے ہوئی۔
اولاد	عرفان الحیات جن کی شادی ۱۹۹۳ء میں خالہ زاد بہن عشرت جہاں سے ہوئی اور اب ماشاءاللہ ایک بیٹی شفا حیات اور ایک بیٹے ارسلان حیات کے والد ماجد ہیں۔

www.taemeernews.com

زمت (۱) اسسٹنٹ ٹیچر، ہوڑہ مسلم ہائی اسکول (یکم مارچ ۱۹۵۷ء تا ۱۵؍اپریل ۱۹۶۸ء)

(۲) اسسٹنٹ ٹیچر، سی.ایم.او. ہائی اسکول، کلکتہ (۱۶؍اپریل ۱۹۶۸ء تا ۳۰؍اپریل ۱۹۹۶ء)

(۳) گیسٹ لیکچرار، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی (اپریل ۱۹۸۹ء تا مارچ ۲۰۰۱ء)

تلمذ پروفیسر عباس علی خاں بیخودؔ

تصانیف (۱) ساعتوں کا سمندر (نظم و غزل) اردو-ہندی ۱۹۷۱ء

(۲) ترِی دھارا (نظم، غزل اور گیت) ہندی

(۳) سانس کی دھار (غزل)

(۴) پہاڑ کاٹتے ہوئے (نظم و گیت)

تالیفات دھند اور کرن (شمس صابری مرحوم کے افسانوں کی تدوین و ترتیب) ۱۹۷۴ء

اس کے علاوہ متعدد درسی کتابیں

تراجم (۱) بنگلہ سے پرائمری بورڈ اور سیکنڈری بورڈ کی کئی کتابوں کے ترجمے

(۲) بنگلہ سے بعض مشہور ڈراموں کے ترجمے

(۳) بنگلہ، انگریزی اور ہندی سے کہانیوں اور نظموں کے ترجمے

صحافتی وابستگی (۱) اعزازی مدیر معاون، ماہنامہ "کہانی" کلکتہ

(۲) پارٹ ٹائم سب ایڈیٹر، روزنامہ "اخوت" کلکتہ

(۳) پارٹ ٹائم سب ایڈیٹر، روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ

(۴) اعزازی مدیر، پندرہ روزہ "ہوڑہ ٹائمز" ہوڑہ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۱ء

(۵) سرپرست، سہ ماہی "ترکش" کلکتہ ۲۰۰۲ء تا حال

(۶) اعزازی رکن مجلسِ ادارت، سہ ماہی "روحِ ادب" کلکتہ مئی ۲۰۰۲ء تا حال

اعزازات و انعامات: (۱) مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ ۱۹۹۶ء

(۲) بنگلہ رسالہ "ابھینو اگرنی" سنیہہ لتا چودھری میڈل

(۳) "سانس کی دھار" پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا انعام

(۴) "پہاڑ کاٹتے ہوئے" پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا انعام

(۵) بھارتیہ بھاشا پریشد، کلکتہ کا سلور جبلی اعزاز ۱۹۹۹ء

www.taemeernews.com

(۶) ''قیصر شمیم کا ادبی شعور'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر ناصر علی انصاری نے بابا بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی' مظفر پور (بہار) سے پی ایچ. ڈی. کی ڈگری حاصل کی۔

دیگر سرگرمیاں (۱) سابق وائس چیئرمین' مغربی بنگال اردو اکاڈمی (مئی ۲۰۰۲ء تا اگست ۲۰۰۵ء)

(۲) فاؤنڈر رائٹرز ایسوسی ایشن' ہوڑہ ۱۲ ر ستمبر ۱۹۶۶ء

(۳) سابق سکریٹری (فاؤنڈر) ادبی سوسائٹی (انکس - چاپدانی)

(۴) سابق رکن اساسی' ادبی سوسائٹی ہائی مدرسہ (انکس)

(۵) سابق رکن اساسی' اتحاد الطلباء مسلمین لائبریری (انکس)

(۶) سابق رکن' انجمن ترقی پسند مصنفین (کلکتہ)

(۷) رکن' جن وادی لیکھک سنگھ (کلکتہ و ہوڑہ)

(۸) رکن' ڈیموکریٹک فارم فار نیشنل انٹیگریشن (کلکتہ)

(۹) رکن' بزم احباب (کلکتہ)

بنگال اور بیرونِ بنگال اندازاً سو سے زائد جن میں ادبا' شعرا اور شاعرات شامل ہیں' جن کا تعلق شاعری' ڈراما' افسانہ' ناول' سیر و سیاحت' تنقید و تحقیق' انشائیہ' طنز و مزاح یا ادب کی کسی اور صنف سے ہے۔

مستقل پتا 10- ہیم گھوش لین' شیب پور' ہوڑہ-711102 (مغربی بنگال)

فون نمبر (033) 2642 6723 موبائل 93309 24089

فراغ روہوی کے زیرِ ادارت پابندی سے شائع ہونے والا ادبی رسالہ

سہ ماہی **ترکش** کلکتہ

اشاعت کے پانچویں سال میں

ہر شمارہ کسی نہ کسی ادیب و شاعر کے نام معنون ہوا کرتا ہے۔

فی شمارہ : ۳۰ روپے ☆ سالانہ : ۱۲۰ روپے

رابطہ : 67 مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کلکتہ-700073

www.taemeernews.com

سیّد حسن
کلکتہ

صاحبِ اعزاز

چمکتی پیشانی مثلِ قمر' مختلف علوم کا نمایاں اثر۔ نصف سر سے شروع موئے تیمیں کی بہار' کم و بیش ستر سال کے تجربات کا مکمل اظہار۔ بینی و گوش پر عینک ہر لمحہ سوار' عینک سے نمایاں چشمِ بینا کا وقار۔ کھڑی ناک سے خاندانی وجاہت کا اظہار' مشکل حالات سے نبرد آزما ہونے کا ایک خاص کردار۔ بڑے بڑے کان' خودداری کی شان۔ لبوں پر پان کی سرخی نمایاں' بروقت مسکراہٹ رقصاں۔ تہذیب پارینہ کی مثال' طبعاً خوش خصال۔ رعب اور ٹھسے جیسے عیب سے پاک' شخصیت غم گسار اور بے تپاک۔ قامت بلند' میانہ روی پسند۔ اسکول سے یونیورسٹی تک درس و تدریس میں سُرخرو' دنیائے علم و آگہی میں ہمیشہ محوِ جستجو۔

بے لاگ مبصر' بااثر مقرر۔ آپ ہیں مغربی بنگال اردو اکادمی کے سابق وائس چیئر مین' ہمیشہ تمام معاملات میں واقعی ایک فیئر مین۔ مختلف اصنافِ شعر و ادب پر مکمل عبور' فروغ علم و ادب کے لیے دل میں ہمہ وقت جوش کا وفور۔ جہاں بھی دیکھیے' کرتا پاجامہ میں نظر آئیں گے' کندھے سے لٹکتا ہوا جھولا اپنے ساتھ ضرور لائیں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ جھولا آپ کے انٹیلکچول یا کمیونسٹ ہونے کی نشانی ہے' اس کی شاید کوئی دوسری ہی کہانی ہے۔ آپ صحافت کی دنیا کی بھی سیر کر چکے ہیں' روزنامہ "آزاد ہند" 'پندرہ روزہ" ہوڑہ ٹائمز" وغیرہ میں اخبار نویسی کے تجربوں سے اپنا دامن بھر چکے ہیں۔ اپنے اخلاقِ حسنہ سے خرد و کلاں کے دلوں میں مقیم' آپ ہیں قادر الکلام، بزرگ و معتبر شاعر حضرت قیصر شمیم۔

2 اپریل 1936ء کو آپ کی ولادت سے پدرِ بزرگوار عبدالرحیم خاں کی طبیعت شاد ہوئی' زمانہ شیر خواری ہی میں آپ کی والدہ محترمہ سکینہ بی بی کی روح خلد آباد ہوئی۔ پھوپھی محترمہ اسلام النساء نے ماں کی طرح آپ کی پرورش کی' مگر بچپن کی شرارتوں پر نہ کبھی سزا دی نہ کبھی سرزنش کی۔ جائے پیدائش انکس (ضلع ہگلی) میں ابتدائی تعلیم کی تحصیل ہوئی' وہاں سے 30 کیلو میٹر دور شہر کلکتہ کی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ آپ کی تعلیمی راہ میں مالی دشواریاں ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کرتی تھیں' انھیں دور کرنے اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے آپ کے دن ہی

www.taemeernews.com

نہیں آپ کی راتیں بھی بڑے کرب سے گزرتی تھیں۔ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ امتحان میں پورے مغربی بنگال میں سیکنڈ آنے پر وظیفہ ملا تھا' جس نے کلکتہ کے سینٹرل کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) میں آپ کے لیے تعلیم کا راستہ ہموار کیا تھا۔ مگر اس سے ایک سال پہلے ہی پھوپھی زاد بہن نجمہ قیصر کو آپ کی دلہن بنا کر گھر لایا گیا تھا' یعنی آپ کے کاندھے پر پہلے ہی سے ذمہ داریوں کا جو بوجھ تھا' اسے اور بڑھایا گیا تھا۔ مگر واہ ری ہمت! آپ نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھا' ساتھ ہی ذوقِ شعر و ادب کو دل و دماغ پر طاری رکھا۔ حصولِ تعلیم کے ساتھ کسبِ معاش کی غرض سے اپنی جائے پیدائش انکس کو چھوڑا اور اپنے افسانہ نگار دوست شمس صابری (مرحوم) کا سہارا پا کر ضلع ہوڑہ کے علاقہ شیب پور سے اپنا رشتہ جوڑا۔ وہیں رہتے ہوئے آئی۔اے۔ فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور انگریزی آنرز کے ساتھ بی۔اے۔ میں داخل ہو گئے لیکن فائنل امتحان میں ابھی تین ماہ باقی تھے کہ بے حد پریشان کن حالات کے دباؤ میں آ کر ہوڑہ مسلم ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کر لی اور وہاں کے معلموں میں شامل ہو گئے۔ بعد میں ملازمت کے دوران ہی کلکتہ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس میں ایم۔اے۔ کیا اور جب انتظامیہ اور اساتذہ کی رسہ کشی بڑھنے لگی تو استعفیٰ دے کر اپنے آپ کو ہوڑہ کے اسکول سے الگ کر لیا۔ ہوڑہ مسلم ہائی اسکول کے بعد سی۔ایم۔او۔ ہائی اسکول (کلکتہ) میں ساری زندگی تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ علاوہ ازیں مختلف کالجوں اور کلکتہ یونیورسٹی میں عرصے تک کلاس لیتے رہے۔ اب ہر جگہ سے سبک دوش ہو گئے ہیں' مگر معروفیت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے اور آپ کی اپنی زندگی اردو زبان و ادب کی ترقی کے گوناگوں کاموں میں بالکل کھو گئی ہے۔ اوائلِ عمری ہی سے آپ تعمیری کاموں کی طرف مائل رہے ہیں' انفرادی و اجتماعی ترقی کے لیے عملِ پیہم کے قائل رہے ہیں۔ اسکول کے زمانے ہی میں ادبی سوسائٹی (انکس) کی بنیاد ڈالی' اپنے علاقے میں ذوقِ ادب پیدا کرنے کی راہ نکالی۔ لیکن اس وقت وہاں ادب سے زیادہ تعلیم کی ضرورت تھی' علم سے محروم علاقے کے لیے ایک درس گاہ کی حاجت تھی۔ چناں چہ ادبی سوسائٹی نے ایک مدرسہ قائم کیا' جو بعد میں "ادبی سوسائٹی ہائی مدرسہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی زمانے میں آپ ہی کی تحریک پر انکس میں ایک لائبریری وجود میں آئی' جو طلبہ سے خاص تعلق کے باعث "اتحاد الطلباء مسلمین لائبریری" کہلائی۔

انکس کے بعد شیب پور (ہوڑہ) میں بھی آپ نے ایک ادبی ادارہ قائم کیا' اور اس کا دروازہ مختلف زبانوں کے ادبا و شعرا کے لیے کھول دیا۔ "رائٹرز ایسوسی ایشن ہوڑہ" کے نام سے یہ ادارہ تقریباً چالیس سال سے ایک سہ لسانی ادبی پلیٹ فارم بنا ہوا ہے' اور شعر و ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ اردو' ہندی اور بنگلہ کے لکھنے والوں کو یکجا اور متحد کر کے باہمی محبت و قومی یک جہتی کو بخوبی فروغ دے رہا ہے۔

www.taemeernews.com

صرف اِن اداروں ہی سے نہیں بلکہ ان کے علاوہ کلکتہ میں " پی ژبلوائے"، " بزم احباب" ، " ڈیمو کریٹک فورم فار نیشنل انٹیگریشن" اور " ایشیاٹک سوسائٹی" سے بھی آپ کی وابستگی رہی ہے اور یہ وابستگی بھی ادبی، علمی، ثقافتی اور سیاسی اعتبار سے آپ کے لیے باعثِ آسودگی رہی ہے۔ " رائٹرز ایسوسی ایشن ہوڑہ" کے آپ ہی روحِ رواں ہیں اُس چالیس سالہ ادبی ادارے کی ترقی کے لیے آج بھی آپ کے حوصلے جواں ہیں۔

آپ کا 66 صفحات پر مشتمل پہلا شعری مجموعہ " ساعتوں کا سمندر" 1971ء میں ہندی تنظیم " سپرنا" نے بیک وقت اردو اور ہندی میں شائع کیا، مجموعے کی ایک ہزار کا پیاں صرف 28 دنوں میں فروخت ہو جانے پر " سپرنا" کے روحِ رواں شمبھو پرساد سری واستو نے کلا مندر (کلکتہ) میں ایک جلسے کا اہتمام کر کے شاعر کو ایک ہزار روپے کا چیک دیا۔ آپ نے اپنے دیرینہ رفیق مرحوم شمس صابری کے افسانے یکجا کیے جو 1973ء میں " دھند اور کرن" کے نام سے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر ہری کنور رائے کنور نے آپ کی غزلوں، نظموں اور گیتوں کا ایک انتخاب تیار کیا، جسے دیوناگری میں " ترِی دھارا" کا روپ دے کر ادبی دنیا کو اپہار دیا۔ اس ہندی مجموعے کے بعد اردو میں آپ نے خود اپنی غزلیہ شاعری اپنی " سانس کی دھار" پر رکھ کر پیش کی پھر دوسرے سال ہی فرہادی طرح " پیاز کاٹتے ہوئے" اپنے گیتوں اور نظموں کی داد شائقینِ ادب سے لی۔ علاوہ ازیں جدید طریقۂ تعلیم کی روشنی میں آپ کی متعدد سرکاری و غیر سرکاری کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ یہ تمام کی تمام کتابیں درسی کتابوں میں آپ اپنی نظیر ہوئیں۔ آپ نے جتنے " تنقیدی و تحقیقی مضامین" سپردِ قلم کیے ہیں انھیں ہم " لفظ بولتے ہیں" کی شکل میں دیکھیں گے، پھر مشہور ڈراما نگار منوج مترا کے بنگلہ ڈراموں کو آپ کے تراجم کی شکل میں پڑھیں گے۔ آپ کے ادبی تبصروں کا ایک مجموعہ بھی منتظرِ اشاعت ہے، بلاشبہ اس میں بھی سامانِ مسرت و بصیرت ہے۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آپ تمام عمر اپنے علم و ادب سے روشنی پھیلاتے رہے ہیں اور صرف بنگال ہی میں نہیں بلکہ بیرونِ بنگال بھی بہت سے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کو فیض پہنچاتے رہے ہیں۔ خدا کرے آپ کے شاگرد ہمیشہ کی طرح آپ سے فیض پاتے رہیں اور آئندہ آسمانِ ادب پر مہر و ماہ بن کر جگمگاتے رہیں۔

آپ کی حیات و خدمات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ہگلی ہائی مدرسہ کے ممتاز معلم جناب ناصر علی انصاری بی۔ آر۔ امبیڈکر بہار یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں، سنا ہے کہ بعض دوسرے مقامات پر بھی اس طرح کے تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں جہاں مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے آپ کو " مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی" ایوارڈ دیا ہے وہیں بھارتیہ بھاشا پریشد، کلکتہ نے اپنے سلور جبلی اعزاز سے اور بنگلہ رسالہ " ابھیپوا گرنی" نے " سلیمہ لتا چودھری میڈل" سے آپ کو سرافراز کیا ہے۔

www.taemeernews.com

1979ء میں پہلی بار بنگال میں رائٹرس سرکل (ٹکیہ پاڑہ) کے زیر اہتمام آپ کا جشن منایا گیا تھا، جس میں اظہار خیال کرنے کے لیے جاوید نہال اور ظفر اوگانوی جیسی علمی وادبی شخصیتوں کو بطور خاص بلایا گیا تھا۔ دوسری بار آپ کا جشن گذشتہ سال بیرونِ بنگال دہلی میں منایا گیا، جس کا اہتمام "اردو پریس کلب دہلی" نے انجمن ترقی اردو ہند کے "اردو گھر" میں کیا تھا۔ بزرگوں میں سابق گورنر بھیشم نرائن سنگھ کے علاوہ قمر رئیس، مظہر امام، پیغام آفاقی اور وسیم الحق نے اور جواں سال ادیبوں میں دہلی کے مولا بخش اسیر، ابرار رحمانی، کوثر مظہری، سید شعیب رضا فاطمی، اشہر ہاشمی، شکیل اختر اور طارق فیضی، نیز کلکتہ کے فراغ روہوی، مشتاق انجم، شبیر احمد اور خاکسار راقم الحروف نے اس جشن میں حصہ لیا تھا۔ اس موقعے پر جتنے مقالے پڑھے گئے تھے انھیں اشہر ہاشمی نے اپنے طویل واثر انگیز دیباچے کے ساتھ "دیا ساگر وِدّیا ساگر" کے نام سے اپنی مرتب کی ہوئی کتاب میں پیش کر دیا ہے، آپ کے سفرِ دہلی اور جشنِ دہلی کے تعلق سے ایک دوسری کتاب "غالب کے شہر میں" بھی منظرِ عام پر آ چکی ہے، جس میں مصنف شبیر احمد نے رپورتاژ کے انداز میں روداد سفر کے علاوہ دہلی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔

کلکتہ کے سہ ماہی "مژگاں" کے "گوشۂ قیصر شمیم" کے بعد اب دو ماہی "دستخط (بارک پور)" کے "قیصر شمیم نمبر" کی باری ہے، فراغ روہوی اور اختر بارک پوری کی طرف سے آپ کے شایانِ شان نمبر نکالنے کی پوری پوری تیاری ہے۔

ہوں آپ زمانے میں سرافراز زیادہ
اللہ کرے اور بھی اعزاز زیادہ

www.taemeernews.com

حمد

صبح تیری عطا، شام تیری عطا
کام کے بعد آرام تیری عطا

قصۂ غم کا آغاز تیرا کرم
نیک پھر اس کا انجام تیری عطا

ایک شب کا سماں، راہ کی تیرگی
روشنی پھر ہر گام تیری عطا

حوصلوں کی بلندی پہ تیری نظر
آزمائش کے ایام تیری عطا

لامکاں تو ہے، لیکن مکاں کے لیے
در نوازش ترا، بام تیری عطا

ذکر جس کا ترے نام کے بعد ہے
میرے ہونٹوں کو وہ نام، تیری عطا

آنسوؤں کی زباں میں حکایاتِ دل
چشمِ تر کو یہ انعام تیری عطا

کاسۂ فن میں قیصر کے اے ذوالکرم
دولتِ عز و اکرام تیری عطا

اے خدا

میں اندھیرے میں ہوں، روشنی دے خدا
آگہی دے خدا، آگہی دے خدا

تیرے بندے کا دل بجھ نہ جائے کہیں
غم دیئے ہیں بہت، کچھ خوشی دے خدا

یا خدا، یا خدا کی صدا لب پہ ہو
وجد کرتی ہوئی زندگی دے خدا

میں طلب گار دریا کا تجھ سے نہیں
کب سے پیاسا ہوں اک بوند ہی دے خدا

در پہ تیرے رہوں آخری سانس تک
اس طرح کی مجھے بندگی دے خدا

ایک دنیا خودی میں گرفتار ہے
بے خودی دے خدا، بے خودی دے خدا

ساز قیصر کو تو نے دیا ہے تو پھر
اس کی آواز کو سوز بھی دے خدا

www.taemeernews.com

نعت پاک

نبیؐ من! شفیعِ من!

گناہ گار ہوں بہت، میں شرمسار ہوں بہت
میں بےقرار ہوں بہت، میں بےقرار ہوں بہت
نبیؐ من! نبیؐ من! شفیعِ من! شفیعِ من!

تری نگاہ چاہیے، مجھے پناہ چاہیے
جو تیری راہ خاص ہے، وہ خاص راہ چاہیے
نبیؐ من! نبیؐ من! شفیعِ من! شفیعِ من!

عجیب گمرہی تھی وہ کہ اپنی کچھ خبر نہ تھی
جدھر تھے تیرے نقشِ پا، اُدھر مری نظر نہ تھی
نبیؐ من! نبیؐ من! شفیعِ من! شفیعِ من!

لبوں پہ تیرا نام تھا تو صرف ایک نام تھا
جو دل میں احترام تھا تو کیا احترام تھا
نبیؐ من! نبیؐ من! شفیعِ من! شفیعِ من!

میں ایسے نقشِ خام سے ہنوز شرمسار ہوں
بچا مجھے! بچا مجھے! گنہ سے زیرِ بار ہوں
نبیؐ من! نبیؐ من! شفیعِ من! شفیعِ من!

فیضِ شمعِ حرم چاہیے
روشنی دم دم چاہیے

وادیٔ دل چمکنے لگے
صبح کوہِ اِضم چاہیے

خاک جب ان کے در کی ملے
کس کو دام و درم چاہیے

راہ تاریک ہے نبیؐ
ایک نقشِ قدم چاہیے

ہاتھ میں جو اُسامہ کے تھا
آپ کا وہ علَم چاہیے

ہو جہاں شانِ عبدِ نبیؐ
وہ عرب، عجم چاہیے

وہ شفاعت کریں گے، مگر
عاصیو، چشمِ نم چاہیے

ذکر ان کا ہے قیصر میاں
معجز رقم چاہیے

www.taemeernews.com

سجدہ

خدا میں سربہ سجدہ ہوں
کہ تو نے کارگاہِ خیر و شر میں
میری عمرِ شصت و یک سال آشنا کو
شر سے ــــ شر کی شرمناکی سے
بچایا ہے
رہِ صبر آزما پر میرے دل کو
دولتِ صبر و قناعت سے
سدا معمور رکھا ہے
مجھے باوصفِ عجز و خاکساری
جرأتِ پنہاں عطا کی ہے
سلیقہ میر کی مانند
ناکامی سے اپنی کام لینے کا
سکھایا ہے
خدا میں سربہ سجدہ ہوں
ترے احسان کے آگے
مرے سجدے نہیں کچھ بھی
میں تیرے بندگانِ نیک کی
خاکِ کفِ پا سے بھی ہر حالت میں کمتر ہوں
مگر میں منکرِ احسانِ ربانی نہیں ہرگز
خدا میں سربہ سجدہ ہوں
کہ تیرا شکر ادا کرنے کو میں نے سر
جھکایا ہے

ثنا

جہت جہت، طبق طبق
اُفق اُفق، شفق شفق
صدا صدا، ورق ورق
نمو نمو، رمق رمق
قلم قلم، سبق سبق
بس اک نشاں، بس اک نسق
بس ایک نام، نامِ حق
بس ایک نام، نامِ حق

www.taemeernews.com

دعا مانگو

دعا مانگو
کہ خالق آتش و آب و ہوا کا
کچھ تو جد دے

(جو میرے سینۂ سوزاں میں کب سے قید ہے
منہ بند بھٹی کی بھڑکتی آگ کی صورت)
مرے سینے کو شق کر دے
بہا کر صاف کر دے ہر طرف پھیلی کثافت کو
دلوں کے آئینے پر تہہ بہ تہہ بیٹھی کدورت کو!

فضا ہے زہر آلودہ
میں سانسیں لوں تو کیسے لوں
میں اندر اور باہر سے
بہر صورت پریشاں ہوں
کہ جینے کی تمنا میں
یہاں ہر روز مرتا ہوں!
سنا ہے شہرِ کوچی میں
سیہ کاری کی شب جب بڑھ گئی حد سے
تو بھڑکا کوہ کوچی کا
صفایا ہو گیا پھر کالے کرتوتوں کی دنیا کا!

اگر یہ واقعہ سچ ہے
تو میرے سینۂ سوزاں کا لاوا
رائیگاں کیوں ہو؟

دعا مانگو
کہ خالق آتش و آب و ہوا کا
کچھ تو جد دے

شامِ غم

ہے یہی فکر شام ہی سے مجھے
آج کی رات کیسے گزرے گی؟
آج کی رات ہے بہت تاریک
بجھ گئے ہیں سبھی زمیں کے دیئے
اور بے نور ہیں فلک کے چراغ
سناٹا میرا بہت بھیانک ہے!

آج میرا دلِ حزیں مجھ کو
کھینچ لایا ہے کس بیاباں میں
جس جگہ کوئی ہم سفر بھی نہیں
دور و نزدیک اک شجر بھی نہیں
جس کے قدموں میں رات کٹ جائے!

www.taemeernews.com

۳۲واں پہاڑ کٹنے کے بعد

ہاتھوں پہ میرے برف کی بارش ہوئی مگر
یہ ہاتھ ہی رکے نہ مرا تیشہ ہی رکا
بتیسویں پہاڑ کی چوٹی بھی کٹ چکی
لیکن وہ آرزو وہ طرح دار آرزو
جس کو کھلی فضا کا تبسم پسند ہے
پنچھیوں کا ترنم پسند ہے
جس نے مری حیات کا نقشہ بدل دیا
جس سے مری رگوں میں لہو آگ بن گیا
جس نے دی میرے ہاتھوں کو تیشے کی زندگی
پتھر جو کاٹ ڈالے وہ شیشے کی زندگی
اس آرزو کے پاؤں میں تھیں سخت بیڑیاں
جب بیڑیوں سے چھوٹی تو جنگل ملے اسے
ان جنگلوں کے ساتھ ہی کالے پہاڑ تھے
جنگل، پہاڑ، بھیڑیے، سب دیکھتی رہی
بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے قبل تک
وہ آرزو مگر نہ ہراساں ہوئی کبھی
لیکن وہ آرزو وہ طرح دار آرزو
بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے بعد ہی
گھبرا کے پوچھتی ہے کہ کیا آگے جاؤ گے؟
کیا دوسرے پہاڑ پہ تیشہ چلاؤ گے؟
کب تک یہ پہاڑوں سے پنجے لڑاؤ گے؟
فرہاد کا یہ قرض کہاں تک نبھاؤ گے؟
جس نہر کی تلاش ہے، وہ نہر پاؤ گے؟
ان ناگہاں سوالوں پہ پل بھر رکا ہوں میں
پھر مسکرا کے تیشہ لیے چل پڑا ہوں میں

خلیج

''میں'' سے ''ہم'' تک کی دوری کو
ہم تم کیسے پاٹ سکیں گے؟
کتنے ''میں'' جب مل جاتے ہیں
تب ''ہم'' کی منزل آتی ہے
ورنہ ہر ''میں''
ایک اکیلے پیڑ کی صورت
اپنے آپ میں گم رہتا ہے
جھنڈ میں پیڑوں کے رہ کر بھی
دور کھڑا رہتا ہے سب سے!
ہم تم کیسے پاٹ سکیں گے
''میں'' سے ''ہم'' تک کی دوری کو؟
ہم تم بھی تو ایک نہیں ہیں!

www.taemeernews.com

نئے کوہ قاف کی کھوج میں

مہ و سال کتنے گزر گئے
کئی راستے، کئی پیچ و خم
کفِ پا سے لے کے خراجِ خوں
ہوئے خوش تو اور ستور گئے
مگر، آنکھ ان سے نہ خوش ہوئی
نہ ٹھہر سکی، نہ چمک سکی
مہ و سال دوشِ ہوا پہ تھے
وہ ستم ستم کئی راستے، وہ الم الم کئی پیچ و خم
لیے اپنے ساتھ گزر گئے
ہمیں دے گئے
نئی ساعتوں کے دیار میں
نئی رہ گزر، نئے پیچ و خم
نئے منظروں کی نمائشوں میں گھرے ہوئے نئے بام و در
نئی کلفتیں، نئی حسرتیں اسی ہاؤ ہُو کے مقام پر
اسی ہاؤ ہُو کے مقام پر
نئے حوصلوں کا ہے امتحاں
نئی منزلوں کے جو خواب ہیں
نئے کوہ قاف کی کھوج میں کہیں گم نہ ہوں، کبھی گم نہ ہوں
ابھی مرحلے کئی اور ہیں
ابھی مسئلے کئی اور ہیں

آج کا انسان

نہ صبح، صبحِ مسرت
نہ شام، شامِ الم
نہ کوئی حرفِ تمنا
نہ کوئی آہٹِ غم
نہ دل میں جوشِ توقع
نہ جاں کو بیمِ قنوط
نہ زندگی کا تموج
نہ موت ہی کا سکوت
کہاں ہے آج کا انساں، اسے خبر بھی نہیں
قیام بھی نہیں اس کا، کہیں سفر بھی نہیں!

آدمی اور آئینہ

دونوں اپنے آپ سے پوچھیں
کیا دیکھا ہے؟
دونوں گونگے بن جائیں گے!

www.taemeernews.com

سرِ راہے

یہ سرد شب ہے

یہ سرد شب ہے
لبوں پہ اس کے نہیں کوئی نغمۂ حرارت
جو نخل بھی ہے
عجیب یخ بستگی کا نوحہ سنا رہا ہے
نہ جھیل ایسی
کہ جس میں چھوٹی سی کوئی کشتی رواں دواں ہو
نہ کوئی دریا
کہ جس کی موجیں ہوں رقص فرما
ہر ایک منظر ہے مرگ آسا

طیور اپنے نشیمنوں میں چھپے ہوئے ہیں
نہیں ان میں کوئی بھی تنفس
جو نغمہ چھیڑے
تو اس کے شعلوں سے برف پگھلے

حسیں مناظر کو دیکھنے کی فسردہ خواہش فغاں بہ لب ہے
غضب کی شب ہے

بعد مدت کے ملاقات ہوئی ہے تم سے
آؤ، کچھ دیر کہیں بیٹھ کے ہم بات کریں
کیا خبر، پھر کسی منزل میں ملیں یا نہ ملیں
کیا خبر، دوسرے دن زیست کہاں لے جائے
کیا خبر، کون سے غم اور ہمیں دے جائے
کیا خبر وقت بھلا دے سب کچھ
دل کے نقشے سے مٹا دے سب کچھ
اور پھر ہم جو ملیں بھی تو نہ پہچان سکیں
آؤ، کچھ دیر کہیں بیٹھ کے ہم بات کریں
بعد مدت کے ملاقات ہوئی ہے تم سے

ناتمامی

آڑی ترچھی کتنی لکیریں
روز بنایا کرتا ہوں
اپنے آنسو اپنے دل کے خون سے
ان میں
رنگ آمیزی کرتا ہوں
لیکن وہ تصویر کبھی بنتی ہی نہیں
جو کچھ مجھ سے بول سکے
مجھ کو پورا کھول سکے

www.taemeernews.com

پرازرپائن کی واپسی

اب کے برس بھی پرازرپائن[1]
پلوٹو[2] کے پاتالی گھر سے
سیرس[3] کے گھر آئی نہیں ہے
(کتنا بھیانک سناٹا ہے!)
پلوٹو شاید اپنا وعدہ بھول گیا ہے
یا دھرتی کے داتو جیسے بھگوانوں نے
اس پر سایہ ڈال دیا ہے!
کچھ بھی ہو لیکن یہ سچ ہے
بھول نہیں سکتی ہے عورت اپنا میکہ
اُس کی اپنی کوکھ ہی اُس کو
ماں کی کوکھ نظر آتی ہے
ماں کے درد کا اک اک لمحہ
اس کو یاد آتا رہتا ہے
کیسا ہے یہ درد کا رشتہ!
یہ رشتہ ہی پرازرپائن کو ماں کے گھر لے آئے گا
اور اسی دن سونی دھرتی کا سناٹا چھٹ جائے گا

1. Proserpine, 2. Pluto, 3. Ceres.

تاش کے پتے

ہم سب کیا ہیں؟ تاش کے پتے!
جانے کتنی صدیوں سے ہم
انگلی انگلی ناچ رہے ہیں
(جیسے پتلی ناچ رہی ہو)
اور ہمارے ناچ کی دھن پر
کھیلنے والے جھوم رہے ہیں
اپنی تجوری چوم رہے ہیں!

تہذیب کا زندانی

اپنے گرد و پیش ابھی تک
میں نے کتنی ہی دیواریں چن رکھی ہیں
میری ترقی کے زینے بھی
دیواروں سے اوپر اٹھنا بھول چکے ہیں
میری بلندی کے پیروں میں
میری پستی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں
آپ ہی اپنا زندانی ہوں!

www.taemeernews.com

نیا سال

اے وقت کی رقاصہ
پھر سال گرہ، تیری
کس شان سے آئی ہے!
اس سال گرہ پر ہم
کرتے ہیں دعاؤں سے:
'اس سال ترا جوبن'
کچھ اور نکھر جائے
اس سال ترا گیسو
کچھ اور سنور جائے
پھر، تیری اداؤں سے
اس سال کے آخر تک
جو کچھ بھی گزرنا ہے
وہ ہم پہ گزر جائے!

نئی روایت

اگلے وقتوں کے یہ کاغذ
بوسیدہ ہیں
جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے ہیں،
ان کی تحریروں میں ـــــ
حقائق کی شکلیں بھی مسخ شدہ ہیں
لے جاؤ!
میرے قلم کو
شبنم جیسے کچھ شعلوں سے
آج بہت کچھ لکھنا ہے،
ایسا کاغذ دو مجھ کو
جس کے جسم پہ
پہلے سے کوئی چھاپ نہ ہو!

بے وجودی

ان گنت پرچھائیوں کے درمیاں
رہتے رہتے ایک دن
میں بھی بجھ کر رہ گیا!
اور میرے نام پر
ایک پرچھائیں نے پایا اشتہار ـــــ
دیکھیے، کب کرب کی اس قید سے
مجھ کو حاصل ہو نجات
دیکھیے، کب کوئی آگ
پھر مجھے دے دے مری اپنی صفات
اور پھر،
ہو ختم میری بے وجودی کا عذاب ـــــ
ایک بے معنی سے ناول کا یہ اک گھٹیا سا باب!

www.taemeernews.com

سمندر بے کراں ہے

سمندر کو
کئی ندیوں میں
جب ہم بانٹ دیں گے
تو یہ ندیاں بھی
سفر میں روز و شب کے
دیکھتے ہی دیکھتے
چھوٹی بڑی کتنی ہی نہروں میں بٹیں گی
اور سوتے "بے مروت آسماں کا منہ تکیں گی
پھر کسی دن یوں بھی ہوگا:
سر برہنہ پیاس
جب نکلے گی پانی ڈھونڈنے
تو ہر طرف
اس کو چمکتی ریت کے ذرے ملیں گے!

انفکشن

پاؤں میں ہوں
یا سر میں ہوں
یا سینے میں
زخم بہر صورت ہیں زخم
کیوں تم ان کو روز کریدا کرتے ہو؟
کیوں تم ساتھ لیے پھرتے ہو
خون میں لت پت یادوں کو؟
"حال" کی رگ رگ میں
ان سے
زہر سرایت کرتا ہے
"ماضی" کا!

www.taemeernews.com

آگہی کا وسیلہ

اب آتے رہے
خواب جاتے رہے
زندگی اپنی یوں ہی گزرتی رہی
میرے احساس میں
زہر گھلتا رہا ـــــ
زہر گھلتا رہا
اس جہاں کا'
جہاں کی ہر اک بات کا
بھید کھلتا رہا ـــــ
آگہی کس وسیلے سے ملتی رہی
کرب کا یہ وسیلہ رہا عمر بھر
کام میں نے اسی سے لیا عمر بھر
موت آئی تو وہ ہاتھ ملنے لگی
اس کو میری ادا جیسے کھلنے لگی

میرا ساتھ کہاں تک دو گے؟

میرے سپنو!
ننھی منی کلیوں جیسے کومل سپنو!
دبلے پتلے بچوں جیسے نربل سپنو
میرا ساتھ کہاں تک دو گے؟
میں تو ہوں اس پتھ کا راہی
جس پر کتنے چلتے چلتے
اپنا سب کچھ کھو بیٹھے ہیں
اور نہ جانے کتنے ہیں جو
گرتے پڑتے بڑھ تو رہے ہیں
لیکن ان میں جان نہیں ہے
ایسے جان کے دشمن پتھ پر
جیون گھاتک جیون پتھ پر
میرے سپنو!
ننھی منی کلیوں جیسے کومل سپنو
دبلے پتلے بچوں جیسے نربل سپنو
میرا ساتھ کہاں تک دو گے؟

www.taemeernews.com

درد' آنسو' مسکان

درد نہ گورا ' درد نہ کالا
درد نہ ہندو' درد نہ مسلم
درد جہاں ہو' جس دل میں ہو
ہی اس کا نام
دل میں رہنا' دل کو ستانا' جگ میں اس کا کام
درد ہی اس کا نام

آنسو پورب ' آنسو پچھم
آنسو اتر آنسو دکھن
دیش دشا کا بھید نہ مانے
آنسو کوئی دھرم نہ جانے
آنسو چاروں دھام
دکھ سکھ کا کچھ حال سنانا جگ میں اس کا کام
آنسو چاروں دھام

ہونٹوں پر مسکان کھلے تو
روپ نہ دیکھے' رنگ نہ دیکھے
نام نہ پوچھے' ذات نہ پوچھے
کوئی نر ہو یا ناری ہو
عمر بڑی ہو یا چھوٹی ہو
سب کے لئے اس کی شوبھا ہے
صبح رہے یا شام
سب کے من میں جوت جگانا جگ میں اس کا کام
صبح رہے یا شام
سب کے لیے ہیں جگ میں تینوں — درد' آنسو' مسکان
کاش یہی اک بات سمجھ لیں آج کے ہم انسان!

کبھی کبھی

جب کبھی میرے تپتے جسم کے ساتھ
کوئی جھونکا ہوا کا لپٹا ہے
جب کبھی میری جلتی آنکھوں کو
سایۂ زلف یاد آیا ہے
جب کبھی میرے خشک ہونٹوں پر
اپنی ہی آنکھ سے چھلکتے ہوئے
اشک کا کوئی قطرہ پہنچا ہے

میرے دل کو ہوا ہے یہ محسوس:
کسی ویران سے جزیرے میں
کوئی آسیب رکھ گیا ہے مجھے!

www.taemeernews.com

ایک دن اور ملا!

صبح کے ساتھ ہی جب آنکھ کھلی
دل نے چپکے سے کہا :
ایک دن اور ملا
زندگی!
تیرے خرابے میں مجھے جینے کا
اپنی آنکھوں میں کسی خواب کا خمیازہ لیے
زہر حالات کا' یا خونِ جگر پینے کا
ایک دن اور

ایک دن اور ملا
درد کے ایک سمندر میں مجھے
سانس پہلے کی طرح لینے کا'
اور ٹوٹی ہوئی کشتی اپنی
کسی انجان کنارے کی طرف کھینے کا
ایک دن اور ملا!

ایک دن اور ملا
قرض لمحوں کا چکانے کے لیے۔
عمرِ رفتہ کی طرح یہ بھی نہ ٹھہرے برباد
کاش! اک دن بھی تو ایسا گزرے
جو سدا آتا رہے
دشتِ فریاد میں ہر شخص کو یاد!

جیون پتھ پر

اونچے نیچے' ٹیڑھے میڑھے
گھور اندھیرے جیون پتھ پر
ننھی منی آشاؤں کے
جلتے بجھتے دیپ لیے میں
جانے کب سے بھٹک رہا ہوں

اپنے پرائے سنگی ساتھی
اونچے نیچے' ٹیڑھے میڑھے
گھور اندھیرے جیون پتھ پر
اک اک کر کے بچھڑ گئے ہیں

آج اکیلے اندھیارے میں
ننھی منی آشاؤں کے
جلتے بجھتے دیپ لیے میں
اپنی منزل ڈھونڈ رہا ہوں!

www.taemeernews.com

عید

عید ___

جیسے لو لگے، تپتے بدن پر
آم کے گودے کا ٹھنڈا ٹھنڈا لیپ!

عید ___

جیسے آنسوؤں سے سر بہ سر
بھیگے ہوئے اک نامۂ محبوب پر
جگمگا اٹھے اسی کی مسکراہٹ کی لکیر!

عید ___

جیسے دور تک پھیلے ہوئے کالے سمندر میں معاً
روشنی کے اک جزیرے کا ظہور!

عید ___

جیسے ماں کی آنکھوں میں چمک
گود میں لیٹے ہوئے معصوم بچے کی ہمک
اور آنگن میں یکایک جیسے چڑیوں کی چہک!

عید ___

گویا اپنی بے خودی کا ایک نام
اپنے دل کی سرخوشی کا ایک نام!

وہ چاند تو تم نے دیکھا ہے

وہ چاند تو تم نے دیکھا ہے
جو چاند تمھاری انگلی کے ترشے ہوئے اک ناخن کی طرح
جو چاند تمھارے کان کی لو سے لٹکی ہوئی بالی کی طرح
جو چاند تمھاری گردن کی چاندی سے بنی ہنسلی کی طرح
آکاش کے پٹ پر چمکا ہے
دھرتی سے پرے
آنگن میں کھڑے پیپل سے پرے
سرحد پہ تنے پربت سے پرے
پربت پہ رکے بادل سے پرے
آکاش ہی جس کی دنیا ہے!
وہ چاند تو تم نے دیکھا ہے
وہ آنکھیں بھی کیا دیکھی ہیں
جو چاند کو چوم کے لوٹی ہیں،
تو ڈوب گئی ہیں اشکوں میں!

www.taemeernews.com

غزلیں

اک رہ گزر شعلۂ جوّالہ ملی ہے
زیست ملی ہے مجھے قتالہ ملی ہے

پہنچا ہے کہاں ہاتھ مرا دامنِ گل تک
کب راہِ طلب میں کوئی حمالہ ملی ہے

بے غسل نہیں اٹھتی کوئی میّتِ حسرت
قسمت سے مجھے چشم ہی غسالہ ملی ہے

دے آیا ہوں کچھ گرمیِ اخلاص کے لیے
جب اس کی نظر ہم صفتِ ژالہ ملی ہے

گلگونۂ عارض کا ترے عکس ہے دل پر
یا سرخیِ داغِ جگر لالہ ملی ہے

میں نغمہ گرِ غم ہوں مرے سازِ الم کو
تاثیرِ نوائے دلِ بنگالہ ملی ہے

ملتی ہے کہاں شور ہر راہِ طلب سے
قیصر کو جو توقیرِ شب نالہ ملی ہے

جو کچھ مرے خیال کی پہنائیوں میں ہے
کس کس طرح وہ انجمن آرائیوں میں ہے

رکھتی ہیں اپنے پاس کہاں نیک نامیاں
وہ لطفِ خاص جو مری رسوائیوں میں ہے

نادانیوں پہ کھلتے ہیں اسرارِ زندگی
تیری نظر تو گم تری دانائیوں میں ہے

اس پر بھی قہر کی ہے نظر کیوں مری طرح
وہ شخص تو جناب کے شیدائیوں میں ہے

پسپا کبھی نہ ہوتا تھا لشکر یہ کیا ہوا
شاید اشارہ فتح کا پسپائیوں میں ہے

حاصل نہ ہوگی قوتِ ظالم کو وہ کبھی
جو بات ضبطِ غم کی توانائیوں میں ہے

قیصر نگاہ جس کی تھی ہمت شکن بہت
مصروف وہ بھی حوصلہ افزائیوں میں ہے

www.taemeernews.com

غزلیں

وہ لطف جو کبھی جسموں کے اتصال میں تھا
ملا جو اس سے میں اب کے تو بس خیال میں تھا

ملن کی راتوں نے دیکھا نہ تھا کبھی پہلے
عجب کھنچاؤ سا کل اس کے خط و خال میں تھا

لیے ہوئے تھی مرے سر کو گود میں دیوار
مرا جنونِ تصادم عجیب حال میں تھا

گرفت سخت نہ تھی مجھ پہ اس کی زلفوں کی
میں پر شکستہ سا اپنے ہی دل کے جال میں تھا

غروب ہونے لگا میں تو روشنی پھیلی
عروج پر مرا سورج مرے زوال میں تھا

ہر اک حصار سے باہر تھا شب کو میں لیکن
کھلی جو آنکھ تو پھر حدِ اعتدال میں تھا

ہوئی ہے کیسی یہ بارش کہ اب نمایاں ہوں
چھپا ہوا میں بہت گردِ ماہ و سال میں تھا

ہمارے جسموں کو موجیں نگل گئیں قیصر
کہ ساحتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

لکھ رہی ہے کیا ہوا منظر بہ منظر
حرف سب ہیں بے صدا منظر بہ منظر

آنکھ چاہے بھی تو شاید کچھ نہ دیکھے
تن گئی ہے اک ردا منظر بہ منظر

نغمۂ رنگ، خوشبو، اشکِ شبنم
ڈھونڈتی ہے کیا صبا منظر بہ منظر

صبح سے تا شام ہم بٹتے رہے ہیں
تم نے دی ہے کیا سزا منظر بہ منظر

اے دلِ برباز کیسے بھول جائیں
ثبت ہے جو سانحا منظر بہ منظر

نیند کی ماتی ہوئی آنکھوں سے کہہ دو
کربلا ہے، کربلا منظر منظر

دیکھنے والے کہاں سنتے ہیں قیصر
بے نوائی کی نوا منظر بہ منظر

www.taemeernews.com

غزلیں

کچھ بھی نہیں ہے اک قلبِ سرد کے سوا
سوغات کیا ملے گی یہاں، درد کے سوا

احساس کے خرابے میں اُڑنے لگی ہے دھول
چہرے پہ کچھ نہ ڈھونڈیے اب، گرد کے سوا

ہے کتنی تیز دھوپ کے پتوں پہ آج کل
چڑھتا نہیں ہے رنگ کوئی، زرد کے سوا

تاریکیاں ہیں اور ہیں بے چین کروٹیں
میری حیات کیا ہے، شب درد کے سوا

پھرتا ہوں شہر شہر ہواؤں کے ساتھ ساتھ
میں اور کیا ہوں، ایک جہاں گرد کے سوا

کیا دکھ ہے میرے دل کو، کہوں بھی تو کیا کہوں
سمجھے گا کون اسے، کسی ہمدرد کے سوا

دے شہرِ کاروبار میں جو، جان بے غرض
ہے اور کون، مجھ سے جواں مرد کے سوا

قیصر خود اپنی ذات سے کیا کیا نہ تھا مگر
سمجھا گیا نہ کچھ بھی وہ، اک فرد کے سوا

خواہش ہے عیش کی، مرے کردار سے الگ
بیٹھا ہوں، تیرے سایۂ دیوار سے الگ

کچھ اور نقش دل پہ بنائے ہیں وقت نے
تیرے نقوشِ شوخیِ ر سے الگ

اک یادگار یہ بھی ہے سیاح، دیکھنا
دل کا کھنڈر ہے شہر کے آثار سے الگ

لمحوں کے سیلِ تند سے پھیلے نہ چار سو
وہ درد، جو ہے لفظوں کے انبار سے الگ

ہر سر بریدہ لاش ہے اس کی تلاش میں
جو سر ہوا ہے وقت کی تلوار سے الگ

جس کے بغیر دل کی زباں گنگ سی لگے
وہ لفظ کیوں رہے لبِ اظہار سے الگ

قیصر خدا کا شکر کہ مفلس ہوں، پھر بھی ہوں
ہر صاحبِ رسوخ کے دربار سے الگ

www.taemeernews.com

غزلیں

سلگ رہی ہے زمیں یا سپہر آنکھوں میں
دھواں دھواں سا ہے کیوں تیرا شہر آنکھوں میں

کھلے دریچے سے باہر ہے کون سا موسم
کہ آگ بھرنے لگی سرد لہر آنکھوں میں

کہاں ہے نیند کہ ہم خواب دیکھیں امرت کا
جو شام گزری ہے اس کا ہے زہر آنکھوں میں

خفا ہوئے بھی کسی سے تو کیا کیا ہم نے
بہت ہوا تو رہا دل کا قہر آنکھوں میں

کوئی اتارنے بیٹھے تو ہاتھ جل جائے
کھنچی ہے اب کے وہ تصویرِ دہر آنکھوں میں

وہی ہے پیاس کا منظر وہی لہو قیصرؔ
ہنوز بھرتی ہے کوفے کی نہر آنکھوں میں

اُبلتے پانیوں میں ہوں کہاں ابال کی طرح
میں آج بھی ہوں تہہ نشیں گزشتہ سال کی طرح

دلوں میں سب کے چبھ رہی ہے اک سوال کی طرح
تری نگاہِ یاس بھی ہے میرے حال کی طرح

کروں گا تجھ سے گفتگو، ذرا ٹھہر، نمٹ تو لوں
کھڑا ہے کوئی بیچ میں ابھی سوال کی طرح

نہ پوچھ مجھ سے حالِ دل کہ ان دنوں ہے زندگی
کسی عروج دیدہ کی شبِ زوال کی طرح

وہ ایک یاد جو ابھی ہے داغِ دل بنی ہوئی
پھسل نہ جائے ذہن سے کسی خیال کی طرح

نہ پوچھ قیصرؔ حزیں، عجیب سی وہ چیز ہے
بچھی ہوئی ہے شہر میں جو ایک جال کی طرح

www.taemeernews.com

غزلیں

شکستہ خواب کے ملبے میں ڈھونڈتا کیا ہے
کھنڈر کھنڈر ہے، یہاں دھول کے سوا کیا ہے

نظر کی دھند میں ہیں بھولی بسری تصویریں
پلٹ کے دیکھنے والے، یہ دیکھنا کیا ہے

ابھی تو کاٹ رہی ہے ہر ایک سانس کی دھار
اجل جب آئے تو دیکھوں کہ انتہا کیا ہے

رہے گی دھوپ مرے سر پہ آخری دن تک
جواں ہے پیڑ مگر اس کا آسرا کیا ہے

تجھے پسند کہاں حال پوچھنا میرا
تری نگاہ میں لیکن سوال سا کیا ہے

دھواں نہیں، نہ سہی آگ تو نظر آئے
یوں چپکے چپکے سلگنے کا فائدہ کیا ہے

رات کی خاموشیوں میں اے قیصر
قریب آتی ہوئی دور کی صدا کیا ہے

یقیں پہ میرے گماں سایہ ڈالتا ہی رہا
مگر میں ایک سمندر کھنگالتا ہی رہا

اگرچہ بھرتی رہی ریت میری مٹھی میں
میں سیپ سیپ سے موتی نکالتا ہی رہا

ہوا تھی تیز تو فانوس میرے ہاتھوں کا
تمھاری شمع کی لو کو سنبھالتا ہی رہا

میں کیا کہوں کہ اُداسی کی دھند چھٹ نہ سکی
ترا خیال تو دل کو اجالتا ہی رہا

ہمارے شہر کا مشکل کشا تھا وہ لیکن
بلا سمجھ کے ہمیں سر سے ٹالتا ہی رہا

زمانہ پایا تھا خوابوں کے ٹوٹ جانے کا
مگر وہ شخص تو اک خواب پالتا ہی رہا

www.taemeernews.com

غزلیں

دور زخموں کا ہے مرہم کا نہیں
یہ زمانہ ابنِ مریم کا نہیں

کربلا سے بھی سوا ہیں سانحے
آج لیکن وقت ماتم کا نہیں

زندگی کی برہمی ہے اور ہم
مسئلہ کچھ زلفِ برہم کا نہیں

کیا ہواؤں کو ہوا ہے باغ میں
کوئی موسم ربطِ باہم کا نہیں

اب کہاں وہ گل، کہاں دل کا گداز
کچھ اثر پھولوں پہ شبنم کا نہیں

کیا حوالے ہیں کتابِ زیست کے
کوئی ٹکڑا قصۂ غم کا نہیں

تم سمیٹو اپنا دامن شوق سے
حق تو کچھ بھی چشمِ پرنم کا نہیں

دوستو اہلِ علم ہیں قیصرؔ مگر
کوئی عالم دل کے عالم کا نہیں

دل کش و دل نواز منظر لا
خشک ماحول ہے گلِ تر لا

غسل دے پھر ہماری دنیا کو
نوح کے عہد کا سمندر

ہر نفس ایک حشر ہے واعظ
لا ذرا دیکھیں تیرا محشر لا

حوصلہ دیکھنا ہے بڑھ کر دیکھ
میری گردن پہ اپنا خنجر لا

آئینہ لے کے میں تو نکلا ہوں
ہاتھ میں اپنے تو بھی پتھر لا

باغ تیرا ہے برق تیری ہے
راکھ کے ڈھیر سے مرا گھر لا

چیخ تجھ تک ابھی نہیں جاتی
آسماں کو ذرا زمیں پر لا

امامت سنبھال پھر اپنی
اپنے ہمراہ پھر بہتر لا

www.taemeernews.com

غزلیں

احترامِ غمِ ایام ہی کرتے گزری
زندگی یوں سحر و شام ہی کرتے گزری

اک ترے درد کی بخشش تھی کہ کچھ ہوش نہ تھا
اس طرح اپنی تو آرام ہی کرتے گزری

کیا غضب تھا کہ شبِ تشنہ لبی بھی اپنی
مدحتِ بادۂ گلفام ہی کرتے گزری

کسی منزل میں بھی حاصل نہ ہوا دل کو قرار
زندگی خواہشِ ناکام ہی کرتے گزری

فرصتِ جلوہ نمائی جو کبھی تم کو ملی
وہ بھی تزئینِ در و بام ہی کرتے گزری

مری صبح یاد رکھنا، مری شام یاد رکھنا
میں ہوں پر بُریدہ طائرٗ تہہِ دامٗ یاد رکھنا

یہ ہجومِ سنگ باراں تجھے یاد تو رہے گا
مرا سر بھی آ رہا ہے ترے کامٗ یاد رکھنا

مرے ساتھ دفن کیوں ہو مرے غم کی وضع داری
مرا ضبط یاد رکھنا، مرا نام یاد رکھنا

مرے بعد تجھ کو ساقی، کہیں تشنہ لب نہ ڈھونڈیں
مرے نام کا بھی ہوگا کوئی جامٗ یاد رکھنا

مرے حرف حرف میں تھی مرے دل کی پیاس کتنی
شبِ غم تھا جو لبوں پرٗ وہ کلام یاد رکھنا

کوئی ہم خیالِ قیصرؔ ہو مری طرح تو سیکھے
رہِ خاص بھول جانا، رہِ عام یاد رکھنا

www.taemeernews.com

غزلیں

اک نظر تو مری طرف بھی دیکھ
پھر مرے دشمنوں کی صف بھی دیکھ

دیکھ خلوت میں سر خمیدہ مجھے
اور جلوت میں سر بکف بھی دیکھ

اے کماں دار! وار سے پہلے
تیر جب دیکھ تو ہدف بھی دیکھ

ابرِ نیساں! گزر نہ جا یوں ہی
تہی آغوشیِ صدف بھی دیکھ

شہ کے گنجینۂ گہر پہ نہ جا
میرا سرمایۂ خزف بھی دیکھ

دیکھ فہرستِ اہلِ دل قیصرؔ
میری عزت، مرا شرف بھی دیکھ

تھوڑی سی شہرت بھی ملی ہے، تھوڑی سی بدنامی بھی
میری سیرت میں اے قیصرؔ، خوبی بھی ہے خامی بھی

کتنے عاشق سنبھل گئے ہیں میرا فسانہ سن سن کر
میرے حق میں جیسی بھی ہو، کام کی ہے ناکامی بھی

محفل محفل ذکر ہمارا سوچ سمجھ کے کر واعظ
دیکھ، مخالف بھی ہیں کتنے اور ہیں کتنے حامی بھی

ایسا تو ممکن ہی نہیں ہے، چاند میں کوئی داغ نہ ہو
جس میں ہوگی کچھ بھی خوبی، اس میں ہوگی خامی بھی

میرا مذہب عشق کا مذہب، جس میں کوئی تفریق نہیں
میرے حلقے میں آتے ہیں تلسیؔ بھی اور جامیؔ بھی

یوں تو سکوں کے لیے قیصرؔ ہوتے ہیں اصول، مگر
اکثر میرے کام آتی ہے دل کی بے آرامی بھی

www.taemeernews.com

غزلیں

میری اپنی کتھا ہے بابا، تیرا کیا
میرا دکھ میرا ہے بابا، تیرا کیا

میرے پاس نہ بیٹھ تو اپنا رستہ لے
دل تو مرا ٹوٹا ہے بابا، تیرا کیا

کیوں ہے پرائی آگ کی اتنی فکر تجھے
گھر میرا جلتا ہے بابا، تیرا کیا

اس کا ہنسنا رونے سے تو بہتر ہے
وہ مجھ پر ہنستا ہے بابا، تیرا کیا

چھوٹا سا گھر اور بڑی سی تنہائی
یہ میری دنیا ہے بابا، تیرا کیا

ناپ رہا ہے کیوں تو اونچے عہدوں سے
میرا قد چھوٹا ہے بابا، تیرا کیا

جیسا بھی ہے، اس میں نقلی پن تو نہیں
یہ میرا چہرا ہے بابا، تیرا کیا

لفظوں کے رس گھلتے میرے پاس نہیں
تلخ اگر لہجہ ہے بابا، تیرا کیا

دھندلا پن ہے اے قیصر یا اجلا پن
میرا آئینہ ہے بابا، تیرا کیا

موسم تو بدلتے ہیں لیکن، کیا گرم ہوا، کیا سرد ہوا
اے دوست، ہمارے آنگن میں رہتی ہے ہمیشہ زرد ہوا

سب اپنے شناسا چھوڑ گئے رستے میں ہمیں غیروں کی طرح
چہرے پہ ہمارے ڈال گئی لا کر یہ کہاں کی گرد ہوا

چھوٹے نہ ابھی پھولوں کا نگر، کوشش تو یہی ہے اپنی، مگر
اک روز اڑا لے جائے گی پتوں کی طرح بے درد ہوا

کیا بات ہوئی، کیوں شہر جلا اب اس کے سوا کچھ یاد نہیں
اک فرد سراپا آگ ہوا، پل بھر میں ہوا اک فرد ہوا

آئی ہے گھنے جنگل میں ابھی، جو کھیل بھی چاہے کھیلے، مگر
کل میرے ساتھ اڑائے گی پھر صحرا صحرا گرد ہوا

آنکھوں کی چمک موہوم ہوئی، لو دیتے بدن افسردہ ہوئے
در آئی ہے قیصر گھر میں مرے یہ کیسی رُتوں کی سرد ہوا

www.taemeernews.com

غزلیں

ہر ساعت کا اپنا چہرہ ہر لمحے کا اپنا رنگ
شام وسحر کے "جادوگھر" میں ڈھونڈ رہے ہو کیسا رنگ

جو منظر بھی دل کو لبھائے، بھر لو اس کو آنکھوں میں
کیا جانے کل کی بارش تک اُڑ جائے کس کس کا رنگ

پھول، شجر، انسان، سبھی کے چہرے ہم نے دیکھ لیے
سامنے آئیں جو تصویریں، سب میں نکلا کچا رنگ

پتھرائی پتھرائی سی کیوں آج وہ آنکھیں لگتی ہیں
جن میں جھلکار رہتا تھا کل جھیلوں جیسا گہرا رنگ

ہم چننے بیٹھے ہیں کرچیں اپنے سنہرے خوابوں کی
رات کے آنگن میں پھیلا ہے جس دم چاند کا اجلا رنگ

ایک سماں ہے دل کے اندر جیسے کہ جلتے جنگل کا
آنکھیں بند کیے میں دیکھوں کب تک اپنے گھر کا رنگ

نیلا، پیلا، لال، ہرا، ہر رنگ دھنک میں تھا قیصرؔ
پھر کیوں آخر غالب آیا سب رنگوں پر کالا رنگ

رات دن کلیاتِ میرؔ نہ دیکھ
وقت کو دیکھ، دل کے تیر نہ دیکھ

اے دلِ سادہ لوح، کچھ تو سمجھ
اب کسی شخص کا ضمیر نہ دیکھ

مٹی مٹی میں فرق ہوتا ہے
صورتیں دیکھ لے، خمیر نہ دیکھ

مسئلہ بیسویں صدی کا ہے
جانِ منَ، داستانِ ہیر نہ دیکھ

کون جانے افق سے کیا نکلے
خواب میں صبح دل پذیر نہ دیکھ

آئینہ دل بجھا بھی دیتا ہے
اپنے چہرے کی ہر لکیر نہ دیکھ

ترکِ اسلوبِ غم نہ کر قیصرؔ
طرزِ مرغانِ ہمصفیر نہ دیکھ

www.taemeernews.com

غزلیں

دھندلکے کا سماں بدلے تو دیکھوں
کوئی چہرہ کہیں چمکے تو دیکھوں

ابھی تو منظروں پر ہے سیاہی
افق سے روشنی چھلکے تو دیکھوں

ہوں اپنی قبر میں یا اپنے گھر میں
کوئی آوازِ پا ابھرے تو دیکھوں

ہرے پتوں کا موسم ہے تو کیا ہے
کہیں اک پھول بھی مہکے تو دیکھوں

ابھی ہر شخص لگتا ہے ادھورا
کوئی پورا بشر نکلے تو دیکھوں

سرِ راہے کسی کو دیکھنا کیا
کبھی وہ میرے گھر ٹھہرے تو دیکھوں

بہت سنبھلی ہوئی رفتار کیوں ہے
قدم اس کا کہیں بہکے تو دیکھوں

کہاں میں ہوں، کہاں منزل ہے قیصر
کوئی بڑھ کر مجھے ٹوکے تو دیکھوں

سر پٹکنے والی کوئی موجِ دریا میں نہیں
کٹنے والے ساحلوں کا یہ تماشا میں نہیں

ٹوٹتا جاتا ہوں میں تو رنج کیوں دنیا کو ہو
کوئی کعبہ میں نہیں، کوئی کلیسا میں نہیں

ختم ہوتا ہے کہاں مجھ پر سرابوں کا عذاب
تیرے صحرا کے سرابوں میں تنہا میں نہیں

اے مری دیوانگی میں کون سے عالم میں ہوں
ایک مدت سے شریکِ بزمِ دنیا میں نہیں

زندگی کرتی ہے مجھ سے سرد مہری کا سلوک
دشمنوں کی طرح اس کو بھی گوارا میں نہیں

مدتوں سے ہے مری کشتی تلاطم آشنا
میں سمندر سے ڈروں، اے دوست ایسا میں نہیں

www.taemeernews.com

غزلیں

پلکوں پہ شبِ غم کی، کچھ تارے لرزتے ہیں
کس خوف کے مارے یہ بے چارے لرزتے ہیں

طوفان کے ماروں کو ہوتی ہے خبر اس کی
کب ناؤ لرزتی ہے، کب دھارے لرزتے ہیں

آنکھوں میں کسی کی بھی اب نیند نہیں آتی
یہ کون سی لوری ہے، گہوارے لرزتے ہیں

کیا ان دنوں سورج کا کنبہ بھی ہراساں ہے
کیوں دل کی طرح آخر سیارے لرزتے ہیں

ہر قطرے کو یہ ڈر ہے، اُڑ جائے نہ دم بھر میں
کیا دھوپ ہے شہروں میں فوّارے لرزتے ہیں

ہے کون یہاں گاہک، بستی ہے لٹیروں کی
بھولے سے جو آتے ہیں بنجارے لرزتے ہیں

ہر خواب جو ٹوٹا ہے، نشتر سا جگر میں ہے
اب نام سے بھی سکھ کے دُکھیارے لرزتے ہیں

اب گاؤں سے آتی ہے یہ کیسی خبر قیصرؔ
دیتے ہوئے ہم کو ہرکارے لرزتے ہیں

ایک سمندر سے نکلے ہم، ایک سمندر میں ڈوبے
دن بھر باہر تیرتے رہتے شام ہوئی گھر میں ڈوبے!

شہر سے گھبرا کر جنگل کو نکلے تو کھنڈر میں ٹھہرے ہم
کون سے منظر دیکھنے نکلے تھے، کون سے منظر میں ڈوبے

جادو گھر کی چیز بنا کر، چھوڑا سنگ تراشوں نے
پانی سے تو بچ نکلے ہم، لیکن پتھر میں ڈوبے

کوئی جھلک ملتی تھی شاید اپنے شکستہ ڈھانچے کی
جو پیکر بھی سامنے آیا، ہم اس پیکر میں ڈوبے

کیسے لمحوں کی آوازیں چاروں جانب گونج اٹھیں
ہم مردے، اٹھنے سے پہلے شورِ محشر میں ڈوبے

گھٹتی بڑھتی موجوں ہی کے رحم و کرم پر سب کچھ تھا
کتنی بار نہ جانے قیصرؔ ہم تو دن بھر میں ڈوبے

www.taemeernews.com

غزلیں

دکانِ شیشہ گری میں سجا ہوا ہوں میں
مگر یہ کیا کہ ہَوا سے بچ رہا ہوں میں

سنے نہ غور سے جب تک ' ہوں لفظ بے معنی
اگر ہو چشمِ توجہ تو دیکھ کیا ہوں میں

تمہارے خواب بھی اب مجھ سے روٹھے رہتے ہیں
"مرا گناہ یہی ہے کہ جاگتا ہوں میں"

تھکن تو راہ کا اک موڑ ہے' ٹھہرنا کیا
اسی خیال سے پھر اٹھ کے چل پڑا ہوں میں

ز سہارے" ہوا کے ساتھی ہیں
اب اپنے آپ کو خود ہی سنبھالتا ہوں میں

ہوس کا چہرہ چھپائے ہوئے جو ملتی ہے
پناہ ایسی محبت سے مانگتا ہوں میں

سنے وہ یا نہ سنے' اس سے کیا غرض قیصر
دلِ شکستہ سے نکلی ہوئی صدا ہوں میں

اے روشنیِ طبع ترا نام کون لے
دانستہ اپنی ذات پہ الزام کون لے

اہلِ ہنر کی جان پہ بن آئے بھی تو کیا
خیرات میں عطا ہو تو انعام کون لے

پتھر کے بت نہیں ہیں الم دیدگانِ شہر
پیہم سکوتِ لب سے یہاں کام کون لے

ہم تھے تو تھے نشانۂ صد تیرِ آسماں
سوغات ایسی اب سحر و شام کون لے

شاید شریکِ بزم سبھی ہیں بریدہ دست
ساقی ! بڑھا کے ہاتھ یہاں جام کون لے

سرمایۂ حیات ہمارا یہی تو ہے
میراث میں یہ کثرتِ آلام کون لے

قیصر نگاہِ طائرِ معصوم بھی ہے تیز
دانہ تو ہے' مگر ہے تہہِ دام' کون لے

www.taemeernews.com

غزلیں

خطا نہ تھی، یہ سچ سہی، ملی سزا تو کیا ہوا
مرے لہو کا مول کیا، لہو بہا تو کیا ہوا

لگا کے آگ مطمئن ہے کون، یہ بھی دیکھیے
کسی غریب کا مکان جل گیا تو کیا ہوا

سروں کے ازدحام میں ہے فکر انھیں کلاہ کی
یہ سر کٹا تو کیا ہوا، وہ سر کٹا تو کیا ہوا

پرند آ کے اڑ گئے کہ شاخ تھی جلی ہوئی
فضا میں اس کے بعد ایک شور تھا تو کیا ہوا

کلی سے پھول بننے تک قیامتیں گزر گئیں
چمن چمن جو صبح دم چلی صبا تو کیا ہوا

وہ اک نوائے زندگی جو چیخ بن کے کھو گئی
اب اس کی یاد میں کوئی قلم اٹھا تو کیا ہوا

برگشتہ اور پاتا ہوں اس کی نظر کو میں
نالوں کو اپنے روؤں کہ روؤں اثر کو میں

اپنی طرف نہ پاؤں گا اس کی نظر کو میں
کیوں چاہتا ہوں ایک مہِ خود نگر کو میں

جاں سے عزیز رکھتا ہوں زخمِ جگر کو میں
زحمت کبھی نہ دوں گا کسی چارہ گر کو میں

رہنے دو اپنے کلبۂ احزاں میں شادکام
ٹھکرا چکا ہوں عیش گہِ سیم و زر کو میں

پھر انتظار میں ہے مرا خرمنِ امید
آواز دینے نکلا ہوں برق و شرر کو میں

زحمتِ سفر لٹا تو مجھے ہوش آ گیا
آساں سمجھ رہا تھا رہِ پُر خطر کو میں

ہمراہ چلتے چلتے جو مجھ سے بچھڑ گیا
لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے اس ہم سفر کو میں

معلوم تھیں کہاں مجھے پرواز کی حدیں
قیصر حقیر سمجھا تھا اک مشتِ پر کو میں

www.taemeernews.com

غزلیں

کمان ساتھ ہے میرے نہ تیر میرے ساتھ
مگر ہے سلسلۂ دار و گیر میرے ساتھ

میں جانتا ہوں کہ ان کا مزاج کیا ہے، مگر
کبھی کبھی نظر آتے ہیں میرؔ میرے ساتھ

نگاہ کس کی ہے کیسی، ذرا پرکھ کے تو دیکھ
امیر ساتھ ہیں اس کے، فقیر میرے ساتھ

مرے خلاف ہی دیتے ہیں مشورے مجھ کو
خلوص رکھتے ہیں میرے مشیر میرے ساتھ

برا کسی کا میں چاہوں، یہ میرا شیوہ نہیں
جو چاہیں، کرلیں مرے حرف گیر میرے ساتھ

مرے عزیزو! مجھے چھوڑ دو ورنہ دنیا میں
تمام عمر رہو گے حقیر میرے ساتھ

میں اپنے گوشے میں تنہا تڑپ رہا ہوں مگر
عجب طرح کا ہے جمِ غفیر میرے ساتھ

چلوں زمانے کے ہمراہ کس طرح قیصرؔ
ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ

ایک میں تھا در پہ تیرے، اور تو کوئی نہ
کون آتا منہ اندھیرے، اور تو کوئی نہ ـ

رات کی سونی گلی میں گونج اٹھی تھی کس کی چیخ
میں تھا یا تھے میرے پھیرے، اور تو کوئی نہ تھا

بستیوں سے دور بھی پھیلا رہا تھا زہر کون
تھے پرندوں کے بسیرے، اور تو کوئی نہ تھا

کون تھا، جس کو لگا کر میں گلے رونے لگا
سامنے تھے کچھ لٹیرے، اور تو کوئی نہ تھا

دشمنوں کا غول آنکلا کہاں سے راہ میں
چند سائے تھے گھنیرے، اور تو کوئی نہ تھا

پشت پر تھا وار کس کا، یہ بتاؤں کس طرح
دوست ہی پیچھے تھے میرے، اور تو کوئی نہ تھا

اس جگہ کس کے لیے رہتا تھا قیصرؔ جس جگہ
سانپ تھے یا تھے سپیرے، اور تو کوئی نہ تھا

www.taemeernews.com

غزلیں

میں ہوں ناچیز، مگر ایک نظر مجھ پر بھی
تو ہے اکسیر تو کچھ ڈال اثر مجھ پر بھی

تو مرے شہر کا حاتم ہے تو پھر بات ہے کیا
کیوں لٹاتا نہیں کچھ لعل و گہر مجھ پر بھی

میں ہوں صحرا میں تو پھر باغ کی راحت کیسی
کیوں رہے سایہ فگن کوئی شجر مجھ پر بھی

خاک ہوجانا، مگر دوشِ ہوا پر رہنا
فرض ہے دشت میں یہ بعدِ سفر مجھ پر بھی

جس کو ملتی نہ تھی فرصت کبھی آئینے سے
وہ نظر رہتی ہے اب شام و سحر مجھ پر بھی

بے حسی مجھ کو لیے پھرتی اسی کے پیچھے
اس کے افسوں کا اثر ہوتا اگر مجھ پر بھی

شعلے بھڑکائے تھے اس نے تو بہت دور کہیں
آ پڑے اُڑ کے مگر چند شرر مجھ پر بھی

تیر لفظوں کے چلاتا ہے وہ غیروں پہ، مگر
وار کرتا ہے بہ اندازِ دگر مجھ پر بھی

میں بھی دیکھوں کہ کمالات ہیں کیا کیا قیصر
آزمائے وہ ذرا اپنا ہنر مجھ پر بھی

بدلا ہوا لہجہ ہے نہ تقریر نئی ہے
پھر بھی تری ہر بات میں تاثیر نئی ہے

مضموں ہے نئے عہد کا، تفسیر نئی ہے
ر سے، دیوار پہ تحریر نئی ہے

الجھے ہوئے منظر پہ ذرا گہری نظر ڈال
ہے ترچھی لکیروں میں جو تصویر، نئی ہے

بڑھ کے لپٹنے لگا تجھ سے
ٹوٹے ہوئے خوابوں کی یہ تعبیر نئی ہے

پُرکھوں سے ملا تھا جو روایات کا ترکہ
ہاتھوں میں مرے آج وہ جاگیر نئی ہے

اس بحث سے کیا فائدہ ہم اہلِ خطا کو
قانون پرانا ہے کہ تعزیر نئی ہے

گویا ہے یہی میرے لیے تحفۂ زنداں
کیا خوب کہا آپ نے "زنجیر نئی ہے"

سنتے ہیں کہ کل رات زمیں چیخ اٹھی تھی
دیکھو تو افق پر کوئی تنویر نئی ہے

رقت نہیں، حیرت ہے اسے، دیکھ لو قیصر
شاید مری آواز گلوگیر نئی ہے

www.taemeernews.com

غزلیں

سب کا بھلا ہو جس سے ا۔ ارادہ رکھیے
نظریں بلند رکھیے دل کو کشادہ رکھیے

سب سے دراز دستی کرنے لگا ہے موسم
اس سے ذرا بچا کر اپنا لبادہ رکھیے

رکھتا نہیں ہے کوئی اب ہاتھ اپنے دل پر
لفظوں میں دھار والے نشتر زیادہ رکھیے

اک پل میں ہم جو چاہیں رکھ دیں بساط الٹ کر
شہ زد پہ آچکا ہے اپنا پیادہ رکھیے

آنکھیں اگر نہیں ہیں منزل نہ مل سکے گی
اب خواہ پیر رکھیے یا پیرزادہ رکھیے

آنے لگے ہیں ملنے سے خوار شہر بھر کے
ہر وقت اپنے گھر میں اب جام و بادہ رکھیے

ہر شخص پر بھروسہ کرنے کے دن نہیں ہیں
اپنا مزاج قیصر اتنا نہ سادہ رکھیے

ایک پودا جو اگا ہے اسے پانی دینا
اپنے آنگن کو نئی رت کی کہانی دینا

تیری آواز سے جب تو نے مرے گھر کا سکوت
و دیوار کو بھی سحر بیانی د۔

پونچھ لینا مری پلکوں سے لہو کی بوندیں
میری آنکھوں کو اگر منظر ثانی دینا

کشتیاں دینا مگر اذن سفر سے پہلے
ٹھہرے پانی کو بھی دریا کی روانی دینا

یوں جلوں میں کہ نہ شرمندہ رہوں سورج سے
کچھ اور مجھے سوختہ جانی دینا

ریت پر نقش کف پا نہیں رہنے پاتے
اہل صحرا کو کوئی اور نشانی دینا

www.taemeernews.com

غزلیں

قدم قدم پہ مرے یہ اثر کہاں کا ہے
بہت اداس ہے رستہ سفر کہاں کا ہے

سفر کے زخم بدن پر ہیں اور کچھ بھی نہیں
ہوا کی زد میں یہ برگِ شجر کہاں کا ہے

نکل رہی ہے یہاں ریت دم بہ دم ہم کو
یہ ریگ زار خطر در خطر کہاں کا ہے

ترے دیار میں یہ کون پوچھنے جائے
کہ دل سے چپکا ہوا ہے جو ڈر کہاں کا ہے

صدا کی بھیک بھی اونچے مکاں سے مل نہ سکی
یہ دستکوں کو سمجھتا تھا در کہاں کا ہے

جو دل نہ سلگے تو مر جائے شاعری قیصر
جلائے جاں کی طرح یہ ہنر کہاں کا ہے

ہم نقش گرِ خطرۂ فردا تو نہیں ہیں
شورش کو چھپائے جبہِ دریا تو نہیں ہیں

کیوں خاطرِ نازک پہ گزرتے ہیں گراں ہم
سب کچھ ہیں مگر شکوۂ بیجا تو نہیں ہیں

آساں نہیں، جو چاہے جسے بخش دے ہم کو
حافظ کے سمرقند و بخارا تو نہیں ہے

کیوں شام سرِ راہ گزر ہنستی ہے ہم پر
واماندہ سہی، نقشِ کفِ پا تو نہیں ہیں

بازیچۂ طوفاں کہے کیوں ہم کو زمانہ
دیوانے ہیں، گردِ رہِ صحرا تو نہیں ہیں

مے خانے میں محرومِ توجہ ہیں تو کیا ہے
ہم بادۂ رد کردۂ مینا تو نہیں ہیں

ہم کشتۂ بے داد گری ہی تو ہیں قیصر
کیا دیکھنے آئے ہو، تماشا تو نہیں ہیں

www.taemeernews.com

غزلیں

میں کہاں تک آگیا ہوں' یہ بتا تو دے مجھے
دور ہی سے دے مگر' کوئی صدا تو دے مجھے

رات' جنگل' خامشی' تنہا سفر' سو وسوسے
دے نہ منزل کا نشاں' پر نقشِ پا تو دے مجھے

میری آنکھوں کو بہت کچھ دیکھنا ہے اس کے بعد
میرا چہرہ ہی سہی' لیکن دکھا تو دے مجھے

زندگی کا کوئی موسم ہو' بدل ہی جائے گا
میں پنپ سکتا ہوں' مٹی میں دبا تو دے مجھے

سرد ہے سورج بھی کتنا' یہ پتا چل جائے گا
آزمائش کے لیے پہلے بجھا تو دے مجھے

کیا کروں احساس کے ہاتھوں بہت مجبور ہوں
میں بھی چپ ہو جاؤں گا' پتھر بنا تو دے مجھے

ہم جس طرف چلے' ہمیں پرچھائیاں ملیں
یعنی ہجومِ شہر میں تنہائیاں ملیں

تنہا اگر نہ چلتے تو بچنا محال تھا
ہر ہر قدم پہ ہم کو نئی کھائیاں ملیں

اک خواب تھا کہ ٹوٹ گیا اور اس کے بعد
دل کو ہمارے درد کی انگڑائیاں ملیں

سر میں ہمالہ بننے کا سودا لیے ہوئے
اے دوست تیرے شہر میں کچھ رائیاں ملیں

اتھلی ندی کو عیب ملا تنگ ظرف کا
ہم ایک بحر تھے' ہمیں گہرائیاں ملیں

قیصر کا وہ بھی دشمنِ جانی ہے ان دنوں
جس شوخ کے لیے اسے رسوائیاں ملیں

www.taemeernews.com

رباعیات

ہے سب کے لیے سنگ و شجر کی دنیا
اللہ کی مخلوق، بشر کی دنیا
وہ بھی اسی دنیا میں تو رہتے ہیں، مگر
ہوتی ہے الگ اہلِ نظر کی

کیا کرتے ہو تم بات نئی مٹی کی
کچھ اور ہے تاثیر مری مٹی کی
جس مٹی سے جنما ہوں نہیں ہے وہ حقیر
ہر سانس میں خوشبو ہے اسی مٹی کی

کچھ حرص و ہوا جھانک رہی ہو جیسے
یا موجِ بلا جھانک رہی ہو جیسے
اس طرح چمک اٹھتی ہیں آنکھیں اس کی
رہ رہ کے ریا جھانک رہی ہو جیسے

ہوتا نہیں احساس کہ کیا کھوتے ہیں
جو چیز نہیں بونے کی وہ بوتے ہیں
کانٹے ہی نظر آئیں گے اک روز یہاں
نادان چمن بیچ کے خوش ہوتے ہیں

جب خوف نہیں دل میں، ہراساں کیوں ہے
پتے کی طرح بزم میں لرزاں کیوں ہے
دامن ہے اگر پاک حقیقت میں تو پھر
الزام سے وہ اتنا پریشاں کیوں ہے

ہر گھونٹ کے پینے میں نیا جوش آئے
غم آئے بھی تو حوصلہ بردوش آئے
پینا ہے یہی کام کا پینا قیصر
بے ہوش اگر ہوں تو ہمیں ہوش آئے

جاتی ہے کہاں، بات کیا کرتی ہے نگاہ
اس کا بجز اللہ نہیں کوئی گواہ
ہوتا ہے اسی دم کسی آیت کا نزول
شاعر کا قلم کہتا ہے جب بسم اللہ

www.taemeernews.com

رباعیات

ہر زخم نہیں ہوتا دکھانے کے لیے
کچھ چیزیں تو ہوتی ہیں چھپانے کے لیے
ڈھلتے ہی جا چھپتا ہوں اک گوشے میں
ہر شام اب آتی ہے رُلانے کے لیے

کرنے ہیں بہت کام ابھی، کرنے دے مجھے
اک عمر کے جو قرض ہیں، بھرنے دے مجھے
اے رکتی ہوئی سانس! مرے ہاتھ نہ روک
مرنا ہے تو کچھ کرکے ہی مرنے دے مجھے

شکوے کا کوئی حرف نہ آنے پائے
یہ شعلہ لبوں کو نہ جلانے پائے
جو رنج بھی ہو، جھیل لے ہنس کر اے دوست
دنیا نہ ہنسی تیری اڑانے پائے

لفظوں میں جہاں زہر بھرا جاتا ہے
اک قہر وہیں چپکے سے آجاتا ہے
اس نکتے سے واقف نہیں شاید کچھ لوگ
ہونا جو نہیں تھا، وہ ہوا جاتا ہے

آنسو تو نکلتے ہیں، دکھاتا کب ہوں
با دیدۂ تر سامنے آتا کب ہوں
ہر دکھ ہی سہے جاتا ہوں چپکے چپکے
دکھڑا میں کسی کو بھی سناتا کب ہوں

رکھتا ہے اگر ایک خدا اپنے لیے
دنیا کو ضرورت نہ بنا اپنے لیے
کیوں روح کو لگ جائیں ترے جسم کے داغ
بہتر ہے کہ باطن کو بچا اپنے لیے

جلنے نہ دیا موم کی بتی کی طرح
لَو میری بھی ہوتی کسی بتی کی طرح
لٹو ہوں ترے ہاتھ کا یارب، اب تک
ہر سانس ہے لپٹی ہوئی لتی کی طرح

www.taemeernews.com

رباعیات

[بیادِ غالب]

دیوانے رہے دشت و دمن پر غالب
بلبل بھی رہے اپنے چمن پر غالب
لیکن تھی عجب شان کہ فکر و فن میں
غالبؔ ہی رہا شعر و سخن پر غالب

اظہار میں صادق تھا کہ کاذب غالبؔ
دنیا سے نہ داد کا طالب غالبؔ
جب تاجِ سخن دینے کو انصاف بڑھا
ہر سمت سے اک شور اٹھا' غالبؔ غالبؔ

[بیادِ جوشؔ]

آنکھوں میں وہ رکھتا تھا چمک بجلی کی
چہرے پہ بھی رہتی تھی جھلک بجلی کی
کھلتی تھی زباں جوشؔ کی جب غصے میں
آواز میں ہوتی تھی کڑک بجلی کی

الفاظ کے سینے میں وہ کیا رکھتا تھا
جو کچھ بھی وہ رکھتا تھا' سچا رکھتا تھا
تھی اس کی زباں اس کی ہی پروردہ زباں
ہر شعر میں وہ اپنی ادا رکھتا تھا

قطعات

[تضمین غالبؔ کے مصرعے پر]

ہونٹوں پہ اک ہنسی تھی' مگر دل میں درد تھا
عرضِ ہنر کی بات نہ پوچھو کہ فرد تھا
غالبؔ کی گرد کو بھی پہنچنا محال ہے
"حق مغفرت کرے' عجب آزاد مرد تھا"

انقلاب آئے گا' بدلے گی یہ ہستی ایک دن
خندہ زن ہوگی بلندی پر یہ پستی ایک دن
وقت خود بے باق کردے گا ہمارا سب حساب
"رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن"

بہار لائے ہیں ہم اپنے گلستاں کے لیے
بہت عجیب سا ہے وقت یہ خزاں کے لیے
اٹھائیں جام' کریں رقص' نغمہ پیرا ہوں
"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"

www.taemeernews.com

عید کے دوہے

بول مبارک باد کے، گونجیں چاروں اور
چاند اشارہ کر گیا، ناچیں آج چکور

ساجن ہیں پردیس میں، پردیسن کے سات
برہن کاٹے چین سے، کیسے عید کی رات

آگ لگے اس بھاگ میں، ٹوٹ گئی امید
سوتن کے گھر شان سے، پیا منائیں عید

نندوئی جب آ گئے، نندیں ہوئیں نہال
عید کے دن بھی کل نہ دے، برہن کو سسرال

گاؤں سے شہر میں لے گئی، روٹی کی امید
گھر آئیں جب لعل تو، ہو بیوہ کی عید

چہرے پر ہر طفل کے، عید کا کیا ہے رنگ
حور، فرشتے دیکھ کے، رہ جائیں گے دنگ

بھیا عیدی دے گئے، دے کر جوڑا لال
من میں بہن کے جاگ اٹھا، سپنوں بھرا سوال

www.taemeernews.com

ماہیے

رم جھم کی یہ رت کیا ہے
آگ ہے پانی میں
تن بھیگ کے جلتا ہے

ہریالی ہے ہریالی
کھیت میں سب کچھ ہے
کیوں گھر میں ہے بدحالی

کیوں کچا گھڑا رکھا
ڈوب گئی بیٹی
پھل باپ نے کیا چکھا

یہ کیا ہوا بن مالی
دل میں تو پت جھڑ ہے
اور آنکھوں میں ہریالی

بیٹھا ہے تھکا ہارا
پیڑ تلے باؤل
چپ چاپ ہے اکتارا

جھرنے کا ہے مدھم سُر
ترائی کے
سینے میں ہے پنچم سُر

آوارہ گھٹائیں ہیں
پیاس کے ہونٹوں پر
پانی کی دعائیں ہیں

دکھ جھیل رہے ہیں ہم
کھیل ہی نیارے ہیں
کیا کھیل رہے ہیں ہم

آنکھوں میں چبھن کیوں ہے
سرد ہوا آئی
پھر دل میں جلن کیوں ہے

پنگھٹ پہ کوئی گائے
بجنے لگی بنسی
گوکل کا مزا آئے

کھونٹوں سے بندھی گائیں
مانگ نہیں سکتیں
گھٹ گھٹ کے ہی رہ جائیں

سورج کو منا لانا
سرد ہے گھر آنگن
اب دھوپ ذرا لانا

گلشن کی ہوا بہکی
پھول لگے ہنسنے
گوری کی کلی مہکی

ڈالی سے اڑی چڑیا
لوٹ کے جب آئی
تھی بدلی ہوئی چڑیا

برہن کے لیے کیا ہے
پوس ہو یا ساون
ہر حال میں رونا ہے

www.taemeernews.com

ماہیے

برسات ہے رنگوں کی
چڑھتی جوانی ہے
ہولی ہے اشکوں کی

تھی رات اماوس کی
پار ندی کرنا
اک بات تھی ساہس کی

پربت پہ جو بادل ہے
کون بتائے گا
کس بیوہ کا آنچل ہے

جو ہار تھا پھولوں کا
کام کیا اس نے
کل رات ببولوں کا

ہم شہر کے باشندے
گاؤں کی خوشبو کے
اب تک ہیں نمائندے

صدمات ہوں جیسے بھی
ہم نہ جدا ہوں گے
حالات ہوں جیسے بھی

کیا بول گیا رہتا
دن کے نکلتے ہی
چھجے پہ مرے کاگا

کیا کام کیا تم نے
دل کو مرے آخر
اک روگ دیا تم نے

پچھلی ملاقاتیں
جب آئیں تو
پھر دل سے ہوئیں باتیں

چھولے تو ذرا آکر
جاگ اٹھے مورت
ہاتھوں کی چھون پاکر

جب پاس تجھے پاؤں
پیار بجے میرا
میں سپنوں میں کھو جاؤں

دنیا کو میں کیا دیکھوں
تو ہے مرا سب کچھ
کیا تیرے سوا دیکھوں

گرمی ہے رضائی کی
کچھ بھی نہ پگھلے گی
ہے برف جدائی کی

ہلچل سی مچی من میں
دیکھ لیا ہم نے
کیا یاد کے درپن میں

ہر سانس الجھتی ہے
وقت کی ہر گتھی
کب ہم سے سلجھتی ہے

www.taemeernews.com

جیون گیت

میں ایسے راگ اٹھاؤں' کچھ پھول کھلیں ہر بن میں
میں ایسی تان لگاؤں' اک لہر اٹھے ہر من میں
میں ایسے بول سناؤں' بل آئے نربل تن میں
میں گن جیون کے گاؤں
میں جیون کا متوالا' میں جیون گیت سناؤں

میں ایسے بھاؤ بتاؤں' سب بھید بھاؤ ڈھ جائیں
میں ایسے ساز۔ ؤں' مٹ جائیں سب شنکائیں
میں ایسی گت پر گاؤں' خود ناچ اٹھیں آشائیں
میں گن جیون کے گاؤں
میں جیون کا متوالا' میں جیون گیت سناؤں

میں گاؤں تو گیتوں سے چھٹ جائے گھور اندھیرا
میں گاؤں تو گیتوں سے ہو سارا جگ اجیارا
میں گاؤں تو گیتوں سے دکھ بھولے ہر دکھیارا
میں گن جیون کے گاؤں
میں جیون کا متوالا' میں جیون گیت سناؤں

www.taemeernews.com

وہ پانی ہو گیتوں میں، پتھر کا کلیجہ دھڑکے
جب برف گرے اُپون پڑ، ہر پھول میں شعلہ بھڑکے
جب ظلم اٹھائے سر تو، اوپر سے بجلی کڑکے
میں گُن جیون کے گاؤں
میں جیون کا متوالا، میں جیون گیت سناؤں

میں گاؤں تو اک بھے سے، سر پاپی تیرہ کا کھوے
میں گاؤں تو خوش ہو کر، دل کل دھرتی کا جھومے
میں گاؤں تو ماں اپنی سنتان کا ماتھا چومے
میں گُن جیون کے گاؤں
میں جیون کا متوالا، میں جیون گیت سناؤں

میں گاؤں، تم بھی گاؤ، یہ ساری دھرتی گائے
میں گاؤں، تم بھی گاؤ، یہ دنیا پریت بڑھائے
میں گاؤں، تم بھی گاؤ، یہ جیون بڑھتا جائے
میں گُن جیون کے گاؤں
میں جیون کا متوالا، میں جیون گیت سناؤں

www.taemeernews.com

گیت

رو رو کر اک عمر گنوائی' آج مجھے کچھ گانے دو
اپنے بے کل' پاگل من کو گیتوں سے بہلانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو

جیون کے دکھ سکھ کی کہانی کہتے کہتے جگ بیتے
آنکھوں کے جھرنوں سے پانی بہتے بہتے جگ بیتے
بہتے پانی کی دھارا کو آج ذرا رک جانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو

نیلے ساگر میں اک کشتی ہولے ہولے بہتی ہے
اس کشتی میں چاند کی رانی تاروں سے کچھ کہتی ہے
جو کچھ کہتی ہے وہ رانی' کھل کے اسے کہہ جانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو

اپنے بھولے بسرے سپنے آج مجھے یاد آتے ہیں
میرے کومل ہردے کو پھر تڑپاتے' برماتے ہیں
ان بھولے بسرے سپنوں کو اور مجھے تڑپانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو

ان ہونٹوں کی نیلاہٹ سے ماند ہوا جاتا ہے گگن
ان ہونٹوں کا مدھ پی پی کر جھوم رہی ہے آج پون
آج تو اس متوالی پون کو امرت رس چھلکانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو

www.taemeernews.com

ہائے یہ آگ بجھائے کون؟

ہائے یہ آگ بجھائے کون؟
میری سوکھی آنکھوں میں اب پانی کی اک بوند نہیں
میرے من میں آگ لگی ہے' ہائے یہ آگ بجھائے کون؟
ہائے یہ آگ بجھائے کون؟

کیسا بادل' کیسا ساگر' کیسی گنگا' کیا جمنا
اپنی اپنی سب کو لگی ہے' ان سے آس لگائے کون؟
ہائے یہ آگ بجھائے کون؟

بستی بستی کرودھ کپٹ ہے' نگری نگری مورکھتا
ایسی مورکھ دنیا میں اب' اپنی جان گنوائے کون؟
ہائے یہ آگ بجھائے کون؟

مایا کا بندھن ہے پرانا' من من میں ہے لوبھ کا روگ
اس لوبھی سنسار میں رہ کر' تیاگ کا راگ سنائے کون؟
ہائے یہ آگ بجھائے کون؟

اپنی آگ میں جلتے رہنا' میں نے کس سے سیکھ لیا
جگ کا بھید بتانے والے! من کا بھید بتائے کون؟
ہائے یہ آگ بجھائے کون؟

www.taemeernews.com

کب تک نیر بہائے کوئی

کب تک نیر بہائے کوئی

جتنا ہے
چوٹ تو لگتی ہی رہتی ہے
جیون میں چوٹوں سے کوئی کیسے جان بچائے
کب تک نیر بہائے کوئی، کب تک نیر بہائے

سپنے ٹوٹا ہی کرتے ہیں
دیپک بجھتے ہی رہتے ہیں
آشاؤں کے بجھتے دیپک کیسے کوئی جلائے
کب تک نیر بہائے کوئی، کب تک نیر بہائے

نیر بہانے سے کیا ہوگا
من کی آگ کہاں بجھتی ہے
آنکھوں کا پانی تو من میں اور بھی آگ لگائے
کب تک نیر بہائے کوئی، کب تک نیر بہائے

www.taemeernews.com

گیت

• کیا جانے کیسی چھایا کا بستی پھیرا ہے
گھر گھر رات اتر آئی ہے' گھر گھر آج اندھیرا ہے
آؤ دیپ جلائیں سکھی ری' آؤ' دیپ جلائیں
دیپ جلائیں

کیا جانے وہ کیسی رُت تھی' جس کا سپنا دیکھا تھا
رُت جب بدلی' تب یہ جانا' وہ سپنا تو جھوٹا تھا
وہ سپنا بھی ٹوٹ چکا ہے' کس سے من بہلائیں
دیپ جلائیں
جانے کب اوشا کا رتھ پھر جیون پتھ پر پائے
جانے کب جیون پھر اپنی جوبن مدرا چھلکائے
جانے کب آشائیں پھر سے گھر گھر جوت جگائیں
دیپ جلائیں

جب تک رات نہیں کٹ جاتی' دیپ جلاتے جائیں گے
جانے کب پردیسی بالم اس نگری میں آئیں گے
وہ آئیں یا آئے سویرا' پگ پگ نین بچھائیں
دیپ جلائیں

www.taemeernews.com

ٹوٹے سپنے

ایک تمھیں پانے کی خاطر، نیند گنوائی چین گنوایا
تم کو اپنے دل میں بسا کر، جی کو کیسا روگ لگایا
آنسو کے کچھ موتی چن کر، سپنوں کی مالائیں گوندھیں
پریم کی ان مالاؤں کو بھی ہنس ہنس کر تم نے ٹھکرایا!
پیار بھری مسکان کی بھکشا مانگ رہا تھا کب سے جوگی
تم نے اس جوگی کو اپنے دوار سے خالی ہاتھ "پھرایا"!
تم نے سجائی تھی پھلواری، رنگ برنگے پھول تھے جس میں
ان پھولوں کا روپ دکھا کر مجھ کو کانٹوں میں الجھایا!
آج مرے جیون کے پتھ پر چھایا ہے گھنگور اندھیارا
میرا سب کچھ لوٹنے والے! تم نے مجھے کس راہ لگایا؟؟
جانے کب تک جیون پتھ پر یوں ہی بھٹکتا رہنا ہوگا
اتنی لمبی راہ میں اب تک کوئی اپنے ساتھ نہ آیا

www.taemeernews.com

گیت

شرنگار کروں

اپنے سندر منوہر

شبدوں کے گہنے پہنا کر

زبک کویتا کے رس سے

اور مانگ بھروں

آ تیرا شرنگار کروں

تیرا روپ چمک جائے گا

مکھڑا اور دمک جائے گا

آ اپنے ہردے کے لہو سے

تیرے چتر میں رنگ بھروں

آ تیرا شرنگار کرو

تیرے روپ کی چرچا ہوگی

جگ میں تیری پوجا ہوگی

اپنی کلا کا امرت دے کر

آ میں تجھ کو امر کروں

آ تیرا شرنگار کروں

www.taemeernews.com

علقمہ شبلی

کلکتہ

شاعرِ تیشہ بدست

ایک فرہاد
تیشہ لیے ہاتھ میں
سرگراں پابرہنہ چلا
دشت در دشت چلتا رہا
کوہساروں پہ تیشہ چلاتا رہا
"کوہ کن" کو بھی آنکھیں دکھاتا رہا
دودھ کی نہر پھوٹے کوئی
روئے شیریں جو دیکھیں
تو ہو زندگی معتبر
ہو فروزاں نظر
راہ میں ہر طرف
لالہ و گل کے تختے دورویہ بچھیں
زندگی کے لبوں پر تبسم کی کلیاں کھلیں
آرزو گل بہ داماں ملے
راحتِ دل کا ساماں ملے

آرزو یہ مگر آرزو ہی رہی
پھول کیا؟
رہ گزاروں میں کانٹے ہی اس کا مقدر ہوئے
رات دن جن سے تلوے لہو رنگ ہوتے رہے
ولولے دل کے اشکوں سے چہروں کو دھوتے رہے
آب و رنگ اپنا کھوتے رہے

دودھ کی نہر لانے کی خواہش مگر ہے جواں آج بھی
آرزوئے دیدِ شیریں کی ہے حرزِ جاں آج بھی
میرے قیصر شمیم، اے مرے شاعرِ خوش نوا!
تو سلامت رہے
تیشہ بھی یوں ہی شب و روز چلتا رہے
زندگی ہے یہی
عظمتِ آدمی ہے یہی
ارتقائے بشر کی کہانی ہے یہ
رفعتِ زندگانی ہے یہ

www.taemeernews.com

ثمرۂ ریاضت

[مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ حاصل ہونے پر]

اعزاز افضل

صلہ ملا ہے جو قیصر شمیم کو افضل
ہمیں لگا کہ یہ انعام ہم نے جیتا ہے
اسے طویل ریاضت کا پھل مبارک ہو
خزاں سے معرکہ جس کے قلم نے جیتا ہے

(بشکریہ "آزاد ہند" کلکتہ)

www.taemeernews.com

احمد رئیس

کلکتہ

خامہ بدست کوہکن

تمھارے ارد گرد جگنوؤں کا اک ہجوم ہے — تمھارے آس پاس بلبلوں کا اک ہجوم ہے
یہ قمقمے یہ مشعلیں یہ نور بانٹے چراغ — ہر ایک کم فہیم کو شعور بانٹتے چراغ
یہ نغمہ باریاں یہ ضوفشانیاں تمھیں سے ہیں — یہ بحرِ علم وفن کی بے کرانیاں تمھیں سے ہیں
قدم قدم پہ راہ میں نشانیاں تمھیں سے ہیں — صداقتیں بھری ہوئی کہانیاں تمھیں سے ہیں
صریرِ خامہ کی صدائے دلنواز تم ہی ہو — ادب کے جوہری ہو، تم مرصع ساز تم ہی ہو
نقوشِ پا تمھارے آج پتھروں پہ ثبت ہیں — تمھارے ذہن کے خطوط منظروں پہ ثبت ہیں
تمھارے آگے سجدہ ریز ہیں جبینِ علم وفن — تمھارے پاؤں چومتی ہے سرزمینِ علم وفن
تم ایسے تیز گام، منزلیں جسے نہ چھوسکیں — تم ایسی ایک شمع، محفلیں جسے نہ چھوسکیں
بجائے تیشہ ہاتھ میں قلم رواں دواں رہا — کہاں کی خستگی ہمیشہ حوصلہ جواں رہا
تمھارے ہونٹ چومتی ہیں آج گل فشانیاں — جبیں کے بوسے لے رہی ہیں آج کامرانیاں
وہ جس کو تم نے چھو لیا وہی نہال ہو گیا — وہ جس نے تم کو چھو لیا وہ بے مثال ہو گیا
ملا جو کوئی پھول تو بہار اس کو کر دیا — ملا چراغ تشنہ تو اسے لہو سے بھر دیا
ملا جو کوئی لفظ تو کنول بنا دیا اسے — ملا کوئی خیال تو غزل بنا دیا اسے
اک ایک لفظ میں خمارِ چشمِ نیم باز ہے — اک ایک شعر میں قلندری رقم طراز ہے
اکیلے تم نہیں ہو، کارواں تمھارے ساتھ ہے — زمین تو زمین، آسماں تمھارے ساتھ ہے
تھی جس کی جستجو اسے تلاش کر کے دم لیا — ملا جو کوئی سنگ تو تراش کر کے دم لیا
بساطِ بحر خلیج ظلمتوں کی پاٹتے ہوئے — تمام عمر کٹ گئی "پہاڑ کاٹتے ہوئے"

ہے حسنِ اختصار میں یہ سلسلہ نہ طول ہو
سلام اب رئیس کا قبول ہو قبول ہو

www.taemeernews.com

ابوالحذر

پٹنہ

پہاڑ کاٹتے ہوئے

[جناب قیصر شمیم کے مجموعۂ نظم "پہاڑ کاٹتے ہوئے" کی اشاعت پر قطعۂ تاریخ]

پھر آیا قیصرِ ہنر پہاڑ کاٹتے ہوئے
بتائی کیسی رہ گذر پہاڑ کاٹتے ہوئے
ہے نظم و گیت کا شجر پہاڑ کاٹتے ہوئے
ہے شاخ شاخ پر ثمر پہاڑ کاٹتے ہوئے
متاعِ صاحبِ نظر پہاڑ کاٹتے ہوئے
عقیق و لعل و سیم و زر پہاڑ کاٹتے ہوئے
جبینِ فن کو سنگِ در پہاڑ کاٹتے ہوئے
جنوں کو مطلعِ سحر پہاڑ کاٹتے ہوئے
کلامِ سحر سر بسر پہاڑ کاٹتے ہوئے
طلسم ساز و جادوگر پہاڑ کاٹتے ہوئے
یہ قیصر شمیم ہیں، سخن کے یہ نسیم ہیں
کشیدِ عطرِ برگِ تر پہاڑ کاٹتے ہوئے
خزاں کھنچی ہے دار پر، ہے جوشِ گل بہار پر
ہر اک کی ہے زبان پر پہاڑ کاٹتے ہوئے
فصاحتِ زباں بھی ہے، بلاغتِ بیاں بھی ہے
ہے لفظ لفظ بار ور پہاڑ کاٹتے ہوئے
یہ طرز اس کا خاص ہے، وہ لائقِ سپاس ہے
سفر اسے عزیز تر پہاڑ کاٹتے ہوئے
صبا خبر یہ لائی ہے کہ آج رونمائی ہے
دلھن ہے غیرتِ قمر پہاڑ کاٹتے ہوئے

ابو الحذر کتاب خوب کا ہے سالِ طبع خوب
صدی تھکی ہے کس قدر پہاڑ کاٹتے ہوئے

۱۹۹۸ء

مبارک اس کتاب کا ہو سالِ رونمائی بھی
گزر رہے ہیں ریگ پر پہاڑ کاٹتے ہوئے

۱۹۹۹ء

www.taemeernews.com

مشتاق جاوید

کلکتہ

بے نواؤں کی نوا

(حضرتِ قیصر شمیم کی نذر)

دہر میں حق کی صدا ہیں حضرتِ قیصر شمیم
بے نواؤں کی نوا ہیں حضرتِ قیصر شمیم

گلشنِ شعر و ادب میں ہے سرورِ نغمگی
عندلیبِ خوش نوا ہیں حضرتِ قیصر شمیم

آنکھ رکھتے ہو تو دیکھو شب گزیدہ شہر میں
صبحِ دلکش کی صدا ہیں حضرتِ قیصر شمیم

سن کے شعروں کو رگوں میں دوڑ جاتا ہے لہو
زندگی کا ولولہ ہیں حضرتِ قیصر شمیم

سینچتے ہیں خون سے اپنے ادب کے باغ کو
دوستو! بحرِ سخا ہیں حضرتِ قیصر شمیم

میں ہی کیا اہلِ نظر کہتے ہیں بحرِ علم کا
ایک دُرِّ بے بہا ہیں حضرتِ قیصر شمیم

کہہ رہی ہے روحِ بیخود ہو کے شاداں خلد میں
فکرِ نو کا اِرتقاء ہیں حضرتِ قیصر شمیم

آپ کو حسنِ شرافت کا نظر آئے گا عکس
اپنے دل کا آئینہ ہیں حضرتِ قیصر شمیم

جھک کے ملتے ہیں سبھوں سے گرچہ قد میں ہیں بلند
خلق میں سب سے جدا ہیں حضرتِ قیصر شمیم

سر جھکائیں کیوں یزیدِ وقت کے دربار میں
شاہِ کربلؑ کے گدا ہیں حضرتِ قیصر شمیم

ہم نشینو! اس دغا و مکر کے ماحول میں
پیکرِ مہر و وفا ہیں حضرتِ قیصر شمیم

سالکؔ و اعزازؔ و شبلیؔ بھی ہیں اس کے معترف
جانِ پرویزؔ و رضاؔ ہیں حضرتِ قیصر شمیم

• : حضرت سالکؔ لکھنوی، حضرت اعزاز افضل، حضرت علقمہ شبلی، حضرت پرویزؔ شاہدی اور علامہ رضا علی وحشت کلکتوی

www.taemeernews.com

انجم باروی
کلکتہ

ایم. کے. اثر
کلکتہ

نذرِ قیصر شمیم

اپنے افکار سے اذہان کو دی صبح نئی
سنگِ مرمر کو دیا لفظوں کا مفہوم نیا!
کتنی ہی ساعتیں تھم جاتی ہیں عنواں کے لیے
شاعرِ عظمتِ افکار کی نَے تجھ سے ہے!!
ذہنِ تیرہ کو عطا کر دی وہ شائستہ چمک
خود بخود دھونے لگی تیرگی شوریدہ لپک
سر اٹھانے لگی ہر سمت نئی ایک لپک
نسلِ نو بھول گئی اپنی جھجک!!!
جب بھی تنہائی میں پڑھتا ہوں "تری دھارا" کو
روح سیراب نظر آتی ہے
"سانس کی دھار" میں جیسے ہو نہاں سچ کی ضیاء
پیرو میر کہوں یا تجھے کچھ اور کہوں
ضربِ احساس سے گم گشتہ زباں بول اٹھی
آخری ہچکی سے دہلیزِ نوا چیخ اٹھی
نا تراشیدہ جنوں کا
نیا عنوان ہے تو

اہلِ فن ' اہلِ نظر قیصر شمیم
لفظ کا آئینہ گر قیصر شمیم
خدمتِ اردو میں سرگرمِ عمل
رات دن ہر اک پہر قیصر شمیم
ان کی ہستی باعثِ صد افتخار
ان کے دم سے بزمِ اردو کا وقار
شاعری کا نام ہے قیصر شمیم
کہہ رہی ہے یہ سخن سانسوں کی دھار
تو ہے بے شک نازشِ ہندوستاں
تیرے شعروں میں وطن کی داستاں
رہبروں کا معتبر رہبر ہے تو
تجھ کو سب کہتے ہیں میرِ کارواں

www.taemeernews.com

حلیم صابر
کلکتہ

قیصر شمیم

محبت کا عنوان قیصر شمیم
شرافت کی پہچان قیصر شمیم
معلم مفکر ادیب
ادب کے نگہبان قیصر شمیم
عروسِ سخن کے لبوں کی ہنسی
تغزل کی مسکان قیصر شمیم
فصاحت کے آداب سے آشنا
بلاغت کی پہچان قیصر شمیم
سخن کے ہیں جتنے رموز و نکات
نہیں ان سے انجان قیصر شمیم
ہو صنفِ رباعی کہ صنفِ غزل
ہیں ہر صنف کی شان قیصر شمیم
سجاتے ہیں گلہائے الفاظ سے
معانی کے گلدان قیصر شمیم
ہر اک پیکرِ معنی و لفظ کو
عطا کرتے ہیں جان قیصر شمیم
ادا کرتے ہیں حق کما حقہٗ
سخن کا، سخن دان قیصر شمیم
جو سچ پوچھئے ہیں قلم کے دھنی
قلمکار ذیشان قیصر شمیم
بیاں کرتے ہیں حمد اللہ کی
نبیؐ کے ثنا خوان قیصر شمیم
زباں دانوں میں ان کا ہوتا ہے ذکر
ہیں ایسے زباں دان قیصر شمیم
کیا حق ادا درس و تدریس کا
ہیں استادِ ذیشان قیصر شمیم
لنڈھاتے ہیں مینائے تعلیم سے
مئے علم و عرفان قیصر شمیم
لٹاتے رہے اپنے شاگردوں پر
گہرہائے فیضان قیصر شمیم
کسی سے کبھی ذکر کرتے نہیں
جو کرتے ہیں احسان قیصر شمیم
ہوئے اپنی ذاتِ گرامی سے آج
ادب کے دبستان قیصر شمیم

• مرنجاں مرنج آپ کی شخصیت
کہ ہیں نیک انسان قیصر شمیم

www.taemeernews.com

ڈاکٹر شبیر ابروی

کلکتہ

نذرانۂ عقیدت برائے حضرتِ قیصر شمیم

ایک شاعر، اک محقق، اک مدرس باکمال
تیری طرزِ سادگی میں سینکڑوں حسن و جمال

پیکرِ خلق و مروت، شخصیت باغ و بہار
عزمِ راسخ کے نظارے چہرے سے بھی آشکار

جنبشِ مژگاں سے نقشِ مہر دل پر پڑ گئے
واہ رے طرزِ تکلم، پھول منہ سے جھڑ گئے

فکر و فن کی تازگی سے لمحہ لمحہ باخبر
نبضِ مستقبل پہ انگلی، نکتہ سنج و حق نگر

نظم کو صحرا نوردی کی لگن دیتا ہوا
نثر کو بھی زندگانی کی پھبن دیتا ہوا

تشنگانِ علم آئیں ہر تکلف برطرف
ساعتوں کا اک سمندر موجزن ہے ہر طرف

کیوں نہ ہو ممنون تیرا رونقِ شعر و سخن
سانس کی ہر دھار پر رقصاں ہے دل کی انجمن

اے زبانِ اردو! آئے کیوں نہ تو بھی جوش میں
فکرِ قیصر کو لیا ہندی نے بھی آغوش میں

ساتھ تیرے چل رہی ہے علم و فن کی کہکشاں
قلزمِ افکار کے موتی ہمیشہ ضو فشاں

وہ ہوا کتنی سرور انگیز ہوتی ہے ندیم
جب بھی کھلتی ہے فضا میں نکہتِ قیصر شمیم

www.taemeernews.com

علیم الدین علیم

کلکتہ

درمدحِ حضرتِ قیصر شمیم

دیکھنے میں ذرۂ بے نور ہیں قیصر شمیم
بانٹتے ہیں وہ اندھیروں کو ضیاء لیکن علیم
فکر وفن کی روشنی، علم و ادب کے مایہ دار
منفرد اہلِ قلم میں کیوں نہ ہو ان کا شمار
درس اور تدریس کا بھی منفرد انداز ہے
تشنگانِ علم کو ان پر بہت ہی ناز ہے
کیا کروں تعریف ان کی؟ ہے کہاں منہ میں زباں
پوچھ لو شبلی و سالک اور افضل سے میاں
اہلِ دانش نے کیا تسلیم ان کو ہم سخن
آرزو ہے میں انہیں دوں تہنیت دل کھول کر
واقعی ایوارڈ کے تھے مستحق قیصر شمیم
خدمتِ فن کا صلہ مل ہی گیا ان کو علیم

معین الدین شاہین

اجمیر

درمدحِ قیصر شمیم

اونچا بہت مقام ہے قیصر شمیم کا
مثبت ہر ایک کام ہے قیصر شمیم کا
جم غفیر دیکھیے اہلِ زبان کا
واللہ کیا دھام ہے قیصر شمیم کا
درجہ بہت بلند ہے میدانِ شعر میں
تدریس میں بھی نام ہے قیصر شمیم کا
بغض و حسد، عناد سے کچھ واسطہ نہیں
مہر و وفا پیام ہے قیصر شمیم کا
ہر عالمِ ادب نے لیا ان کو ہاتھوں ہاتھ
کس درجہ احترام ہے قیصر شمیم کا
کرتے ہیں مبتدی کی بہ صد شوق رہبری
کہتے ہیں فیض عام ہے قیصر شمیم کا
جس نے ہر ایک شخص کو مخمور کر دیا
شاہینؔ ایسا جام ہے قیصر شمیم کا

www.taemeernews.com

ہارون شارب
کلکتہ

عمر بھر کرتے رہے تقسیم دولت علم کی
مخزنِ دُرِ سخاوت آپ ہیں قیصر شمیم
فاقہ مستی میں بھی چہرے پر شکن آتی نہیں
پیکرِ صبر و قناعت آپ ہیں قیصر شمیم
بھول کر اپنی انا پر آنچ تک آنے نہ دی
اس قدر حساس طینت آپ ہیں قیصر شمیم
گلستانِ زندگی میں گل کھلائے چار سو
باغِ فکر و فن کی زینت آپ ہیں قیصر شمیم
مسئلوں کی بھیڑ میں بھی خوش رہے ہر گام پر
مرد میداں نیک سیرت آپ ہیں قیصر شمیم
ذاتِ عالی آپ کی اک گوہرِ نایاب ہے
وقت کی انمول دولت آپ ہیں قیصر شمیم
ایک شارب ہی نہیں کہتی ہے سب خلقِ خدا
پیکرِ شانِ شرافت آپ ہیں قیصر شمیم

بدرالدین بدر
کلکتہ

دُرِ سخاوت

اگرچہ دل میں بہت اضطراب رکھتا ہے
وہ زندگی میں مگر آب و تاب رکھتا ہے
اجالے بانٹتا پھرتا ہے گھپ اندھیرے میں
وہ مٹھیوں میں کئی آفتاب رکھتا ہے
اگرچہ آج بلندی پہ ہے مقام اس کا
خلوص و مہر مگر بے حساب رکھتا ہے
شعور و فکر و فراست کا ہے وہ سرچشمہ
سوال کرنے سے پہلے جواب رکھتا ہے
گھنے درخت کی صورت کھڑا ہے صحرا میں
وہ آندھیوں سے الجھنے کی تاب رکھتا ہے
الجھتا رہتا ہے دن رات خار زاروں سے
مگر ہمارے لیے وہ گلاب رکھتا ہے
وہ جلتے ذہن کو دیتا ہے ابر کا سایہ
اداس آنکھوں میں تسکینِ خواب رکھتا ہے
وہ بات کرتے ہوئے نرم نرم لفظوں میں
نہ جانے کتنے ہی چنگ و رباب رکھتا ہے
میں جس کو پڑھ کے ہوا معتبر زمانے میں
وہ اپنی ذات میں ایسی کتاب رکھتا ہے
قلندروں کی سی مستی ہے اس کی ذات میں بدر
ہر ایک شخص کا پھر بھی حساب رکھتا ہے

www.taemeernews.com

اشرف علی اشرف

اظہارِ عقیدت

نذرِ استادِ محترم حضرتِ قیصر شمیم

ہوگی جہاں بھی ملک میں اب فکر وفن کی بات
آئے گی لب پہ قیصرِ شیریں سخن کی بات

ہر طور سے ہے یگانہ تو نظم و نثر میں
کرتا ہے گل کی، لالہ کی، سرو سمن کی بات

پرویز ہوں یا شبلی و افضل ہوں یا ہوں شاد
پاسِ ادب سے کرتا ہے، ہر ہم سخن کی بات

تو مصلحت پسند کہاں، حق پسند ہے
مجنوں ہے فن کا، کرتا ہے دار و رسن کی بات

کرتا رہے گا صدیوں زمانہ بھی اس کے بعد
اس فخرِ قوم، فخرِ ادب اور وطن کی بات

الفاظ سے ہی ڈال دے کردار میں بھی جان
ساقی کی ہو کہ رند کی یا انجمن کی بات

اس ریختہ شناس سے پوشیدہ کچھ نہیں
دلی کی ہو، اودھ کی یا ارضِ دکن کی بات

وہ فکر تیری، طرز ادا، طرز گفتگو
بے مثل ہے کہ اس میں ہے حسنِ سخن کی بات

کیا پوچھنا مکینوں کا ایوان کا ترے
ہے منفرد سبھی سے ہر اک مرد و زن کی بات

تیرا سلوک مشک سے عنبر سے کم نہیں
اخلاص میں، وفا میں ہے مشکِ ختن کی بات

تو ہے حیاتِ نیک کا اک سچا ترجمان
کرتا نہیں ہے دہر میں شر یا فتن کی بات

پُر ہے بہت یہ دانش و حکمت سے ہی تری
بچپن کی ہو یا جوانی یا عمرِ کہن کی بات

تجھ کو یہ کائنات بہت ہی عزیز ہے
کرتا ہے اپنی دھرتی کی نیلے گگن کی بات

تو ہے اسیرِ زلفِ غزل کیوں نہ پھر کرے
اس سیم تن کی، شعلہ دہن کی، چمن کی بات

اشرف کی ذات تیری ہی منت پذیر ہے
جو آج کر رہی ہے یہ شعر و سخن کی بات

www.taemeernews.com

ڈاکٹر محمد رفیع احمد
کلکتہ

استاذی قیصر شمیم صاحب

اخلاق جن کا اعلیٰ، شیریں زبان جن کی
کردار جن کا افضل، مسکان جان جن کی
گفتار میں نہیں ہے کوئی بھی شان جن کی
درجہ انکساری، ہر ایک آن جن کی

اردو کے ہیں وہ شاعر، قیصر شمیم صاحب
ہیں وقف سب کی خاطر قیصر شمیم صاحب

تعلیم و تربیت سے اک ایک کو سنوارا
اصلاح کر کے اُن کی تحریر کو نکھارا
مخفی صلاحیت کو کس پیار سے اُبھارا
لغزش تلامذہ کی اُن کو ہرگز نہیں گوارا

استاد ہیں مثالی قیصر شمیم صاحب
باغ ادب کے مالی قیصر شمیم صاحب

کیا "دھار سانس کی" ہے ہم نے جو اُن سے پوچھا
بولے "پہاڑ کاٹو" پھر کچھ پتہ چلے گا"
رستے میں اک "سمندر" ہے کیسی "ساعتوں" کا
رحم و کرم پہ جس کے ہے آدمی کی دنیا!

یوں کہہ رہے ہیں ہم سے قیصر شمیم صاحب
کچھ منہ سے، کچھ قلم سے قیصر شمیم صاحب

خالد قمر

کلکتہ

مرکزِ خوش نظر حضرتِ قیصر شمیم کے نام

فخرِ دانش وراں، شاعرِ خوش بیاں — آبروئے ادب، نازشِ گلستاں
مشعلِ رہ گذر، رہبرِ کارواں — مشفق و باوفا، مخلص و مہرباں
دور بیں، نکتہ داں، صاحبِ علم و فن — افتخارِ ادب رونقِ انجمن
سرخیِ شامِ رنگیں نسیمِ سحر — آسمانِ بصیرت کے شمس و قمر
نیک دل، نیک خو، نامور معتبر — شمعِ بزمِ طرب، مرکزِ خوش نظر
پارسا، پاکباز اور شاہیں صفت — ان پہ ہے مہرباں خالقِ شش جہت
گلستانِ سخن کے گلِ خوشنما — ساقیِ ماہ رو، نازِ جامِ ولا
مونس و چارہ گر، ہمدم و ہمنوا — پیکرِ خلق و اخلاص و صدق صفا
نزانِ سخن کے وہ شہباز ہیں — نونہالانِ گلشن کے ہمراز ہیں
رہنما، سیلِ نہرِ لبن — ساغر و جام و مینا، شرابِ کہن
آبشارِ خرد، موجِ گنگ و جمن — مہرِ ادراک کے ہیں سنہری کرن
ان کا چہرہ اگر دل کا آئینہ ہے — ان کا کردار بھی پاک و پاکیزہ ہے
ان کی پرواز فکر آشنائے فلک — ان کی گفتار میں ہے عجب سی لچک
ان کی غزلوں میں ہے بھینی بھینی مہک — ان کی نظموں میں ہوتی ہے اکثر کسک

احترام ان کا کرتے ہیں اہلِ نظر
معتقد کیوں نہ ہو پھر یہ خالد قمر

www.taemeernews.com

قمر رئیس بہرائچی
بہرائچ

آئینۂ حقیقت

بزمِ سخن کی شان تو قیصر شمیم ہیں
علم و ادب کی جان تو قیصر شمیم ہیں
پائی ہے ان سے لاکھوں چراغوں نے روشنی
آدابِ بوستان تو قیصر شمیم ہیں

تیری زباں میں ہے جو اثر کون دے گیا
علم و ادب کا تجھ کو ہنر کون دے گیا
لکھتے ہو آسمان کے قصے زمین پر
زورِ قلم تمھیں یہ مگر کون دے گیا

ان کو تو صاحب ادراک کہا جاتا ہے
یا وہ کوئی سے انھیں پاک کہا جاتا ہے
کتنے دیوان لکھے کتنی کتابیں لکھیں
ان کو سرمایہ و املاک کہا جاتا ہے

دنیا کو جستجو ہے کہ ایسا بشر ملے
آئینۂ حیات سے جس کی نظر ملے
قسمت کی بات میں ہو بھلا کیا کسی کا دخل
سب چاہتے ہیں دولتِ دردِ جگر ملے

آدابِ گلستاں کا چلن اس سے پوچھئے
وابستہ تا حیات چمن سے رہا ہے وہ
برسوں رہا ہے خضر کے ہم راہ وہ قمر
راستوں کا پتہ جانتا ہے وہ

احمد کمال حشمی

کلکتہ

تضمین بر اشعارِ قیصر شمیم

شریکِ حال ہیں میرے نہ وہ شریکِ سفر　　جدا ہے ان سے مری چال، میری راہ گزر
خیال بھی ہے جدا اور جدا ہے فکر و نظر　　"میں جانتا ہوں کہ ان کا مزاج کیا ہے مگر
کبھی کبھی نظر آتے ہیں میر میرے ساتھ"

بجائے اس کے وہ چلنے سے روکتے مجھ کو　　دکھاتے ہیں وہ غلط خود ہی راستے مجھ کو
عجب طرح کے سناتے ہیں فیصلے مجھ کو　　"مرے خلاف ہی دیتے ہیں مشورے مجھ کو
خلوص رکھتے ہیں میرے مشیر میرے ساتھ"

سمجھتے ہیں وہ مجھے جیسا میں تو ویسا نہیں　　مرے عدو ہیں سبھی، میں مگر کسی کا نہیں
مرے مزاج، مری طبع کا یہ خاصا نہیں　　"برا کسی کا میں چاہوں یہ میرا شیوہ نہیں
جو چاہیں کرلیں مرے حرف گیر میرے ساتھ"

منافقوں میں محبت کا اک سفیر تو ہے　　مرے خلوص مرے پیار کا اسیر تو ہے
غموں کی بھیڑ میں میرا کوئی نصیر تو ہے　　"مرے قریب مرا ایک دست گیر تو ہے
ولی نہیں! ہے مگر ہے بشیر میرے ساتھ"

خبر میں ہوں نہ کسی ذکر میں نہ چرچا میں　　ہوں ایک چھوٹا سا قطرہ عمیق دریا میں
کہ رہ رہا ہوں میں گمنامیوں کے صحرا میں　　"مرے عزیزو! مجھے چھوڑو ورنہ دنیا میں
تمام عمر رہو گے حقیر میرے ساتھ"

کہاں کسی کو پتہ ہے کہاں کسی کو خبر　　کہ دیکھنے میں تو ویران لگ رہا ہے یہ گھر
فصیلیں چپ ہیں تو خاموش ہیں دریچہ و در　　"میں اپنے گوشے میں تنہا تڑپ رہا ہوں مگر
عجب طرح کا ہے جم غفیر میرے ساتھ"

ستم گروں سے کروں راہ کس طرح قیصر　　ستم سہوں، نہ کروں آہ کس طرح قیصر
ہو زندہ رہنے کی طلب چاہ کس طرح قیصر　　"چلوں زمانے کے ہمراہ کس طرح قیصر
ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ"

www.taemeernews.com

نور اقبال
کلکتہ

خامۂ قیصر شمیم

قلم تمھارا اجالے کا ساتھ دیتا ہے — کہاں یہ اہلِ صداقت کو تنگ کرتا ہے
ہر ایک گام پہ ہر مرحلہ و منزل میں — سدا اندھیروں سے بے خوف جنگ کرتا ہے
قلم تمھارا نہیں چاپلوسی کا قائل — راہ سے آگے کبھی نہیں بڑھتا
کہ گیت صاحب اوصاف ہی کے گاتا ہے — قصیدہ مردہ ضمیروں کا یہ نہیں پڑھتا
قلم تمھارا کوئی شخصیت پرست نہیں — کسی کی بات ہو تو غلط بات سہہ نہیں سکتا
بلا سے بند مفادات کے ہوں دروازے — وہ دن کو رات کسی طرح کہہ نہیں سکتا
کوئی بھی بات ہو پر صاف صاف کہنے میں — قلم تمھارا کسی کا لحاظ کرتا نہیں
یہ ہاتھ سب کے گریباں پہ ڈال دیتا ہے — فقیر ہو کہ شہنشاہ ہو یہ ڈرتا نہیں
قلم تمھارا طرف داری کر نہیں سکتا — جو کوئی اپنا نہیں ہے تو کوئی غیر نہیں
قلم تمھارا صداقت کا ساتھ دیتا ہے — نہیں ہے ربط کسی سے کسی سے بیر نہیں
قلم تمھارا ازل ہی سے ا۔ بی ہے — سو انقلاب ہر اک پل اٹھاتا رہتا ہے
خلاف ظلم خلاف ستم خلاف جبر — معاشرے میں یہ بھونچال لاتا رہتا ہے
تمھارے اشکوں میں ڈوبی ہوئی قلم کی لکیر — ستم کی بستی میں اک آگ سی لگاتی ہے
تمھاری خوں میں نہائی ہوئی ہر اک تحریر — جہاں کو راہِ بغاوت سدا دکھاتی ہے

قلم سے علم سکھایا خدائے تعالیٰ نے
قلم خدائے مقدس کی اک امانت ہے
ضمیر اپنے قلم کا رکھو گے تابندہ
قلم کو بیچنا سب سے بڑی خیانت ہے

www.taemeernews.com

شاہد فروغی

ایک شاعر کا کمرہ

میں اپنے شہر میں
جہاں کہیں بھی رہا
مصروفیت کے باوجود
ہر جمعہ کی شام خود کو
اس شاعر وادیب کے
کمرے میں پاتا ہوں ___!
جو عالمی شہرت کا مالک ہے!!
اس کے خلوص و محبت
تہذیب و اخلاق میں
عجیب جادوگری ہے ___.
جس کے سحر میں
ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے __!!

وہ شعر و ادب کے فن میں
کمال کی صلاحیت رکھتا ہے
اس کے فلیٹ کے چھوٹے سے کمرے میں
نہ جانے کیوں مجھے
روحانی سکون ملتا ہے

اس کے ملنے جلنے اور چاہنے والے
اسی کمرے میں آ کر بیٹھتے ہیں
چائے کی چسکیاں لیتے ہیں

کمرے کے فرش پر
لینولیم کارپیٹ بچھا ہوا ہے
اس پہ ایک پتلی سی توشک
اور دو تکیے ہوتے ہیں/جس پر
وہ اپنے جسم کی تھکن اُتارتا ہے
یہی اس کے دن رات کا بستر بھی ہے۔!
دروازے کے سامنے/بائیں کونے میں
ایک کرسی اور میز ہے/میز پر
قلم دان، ٹیبل لیمپ، فائلیں
اخبارات، رسائل، ڈکشنریاں
فون اور دو تین بیگ ہوتے ہیں
ایک کپڑے کا تھیلا بھی دکھائی دیتا ہے
جس میں اس کی تیسری آنکھ
پوشیدہ رہتی ہے ___!

www.taemeernews.com

باہر جاتے وقت / ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔!!

اس کرسی پر بیٹھ کر / وہ اپنے لکھنے اور پڑھنے کا عمل کرتا ہے
اس کمرے میں / اس نے ہزاروں تخلیقات کو جنم دیا ہے
اس کمرے کی چھت کے نیچے / ایک پنکھا ہے
جو اس کی زندگی کی طرح / گردش کیے جا رہا ہے

دیوار پر / ایک گھڑی ہے /
جو ہمیشہ ٹک ٹک کی صدا دیتی ہے
اسے اپنی ذمہ داریوں کا / احساس دلاتی ہے ___!
کھڑکی بڑی ہے / ہوائیں خوب آتی ہیں

پالسٹ میں لگے پردے لہراتے ہیں
کیلنڈر پھڑ پھڑاتے ہیں / دن اور تاریخ یاد دلاتے ہیں
شام ہوتے ہی / ٹیوب لائٹس جل اٹھتی ہیں ___!!

پلائی ووڈ کی الماریوں کی
اوپری سطح پر شیشے لگے ہوئے ہیں
یہ الماریاں دیواروں کو زینت بخشتی ہیں ___!!

ایک شوکیس بھی ہے / ان کے تمام خانوں میں
مختلف زبانوں کی کتابیں / سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں
جن سے علم و ادب کی / خوشبو آتی ہے ___!
کتابیں اتنی زیادہ ہو گئی ہیں / کہ اب وہ میز کے کنارے ہی
تھوڑی سی جگہ میں
رکھنے پر مجبور ہے ___!!
دروازے کی بائیں جانب
ایک شاعرہ اور مصورہ کی / بنائی ہوئی
دلکش اور خوبصورت پینٹنگ
آویزاں ہے ___!
جس میں یہ فنکار قید ہے ___!!
کئی ایوارڈز بھی ہیں
جو خاموش ہوتے ہوئے بھی
اس کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں
نائٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں
یہ کمرہ پُر اسرار لگتا ہے
کتابوں کو یکجا کرنے

اور / اس کمرے کو سنوارنے میں
اس نے اپنی پوری زندگی صرف کر ڈالی / اس میں
اس کی شریکِ حیات کی
بڑی کاوشیں شامل ہیں ___!
وہ اکثر تنہائی میں سوچتا ہے / "کیا نئی نسل
میرے یہاں نہ رہنے پر
ان کتابوں کی حفاظت کرے گی
کیا اسی طرح / میرے اس محبوب کمرے کو
دلنشیں اور دلفریب رکھ پائے گی۔"!!!

☆☆☆

www.taemeernews.com

محسن باعشن حسرت
کلکتہ

قطعات

ذرے کو آفتاب بنایا ہے آپ نے
ہر نقش لا جواب بنایا ہے آپ نے
گیتوں کو لے، سرور غزل کو عطا کیا
ہر فن کو کامیاب بنایا ہے آپ نے

نظموں کے دے کے تازگی غزلوں کو شوخیاں
رنگِ سخن کو خوب سنوارا ہے آپ نے
بخشی قلم نے نثر نگاری کو دل کشی
اردو ادب کا چہرہ نکھارا ہے آپ نے

ہے بے مثال ذاتِ گرامی جناب کی
ہے لاجواب حسنِ تکلم جناب کا
برتاؤ ایک جیسا ہر اک آدمی کے ساتھ
سب کے لیے ہے ایک تبسم جناب کا

نسیم فائق
کلکتہ

پہاڑ کاٹتے ہوئے

خدا پہ کر تو آسرا' پہاڑ کاٹتے ہوئے
تو نہر دودھ کی بہا' پہاڑ کاٹتے ہوئے
ہوا نے شاخ شاخ کو برہنہ کر دیا ہے پھر
تو چاہتوں کے گل کھلا' پہاڑ کاٹتے ہوئے
جو عزم دل میں ہے ابھی جواں رہے خدا کرے
ہمیں بھی راستہ دکھا' پہاڑ کاٹتے ہوئے
قدم کہیں رکیں نہیں' یہ سر کہیں جھکے نہیں
رہے یہ دل میں حوصلہ' پہاڑ کاٹتے ہوئے
نہ کر یہ غم کہ پاؤں میں ہیں سخت بیڑیاں ابھی
نئی فضا کے گیت گا' پہاڑ کاٹتے ہوئے
بچے ہوئے پہاڑ ہیں ابھی تلک جو راہ میں
تو ان سبھوں کے سر جھکا' پہاڑ کاٹتے ہوئے
جو سنگ بولتے نہ تھے وہ سنگ بولنے لگے
کمال تھا یہ تیشے کا' پہاڑ کاٹتے ہوئے
جمے نہ برف پھر کہیں عمل کی یہ حیات پر
تو فرض عاشقی نبھا' پہاڑ کاٹتے ہوئے
ہے آرزو نسیم کی پہاڑ کاٹتا رہے
بلا سے آئے اب قضا' پہاڑ کاٹتے ہوئے

www.taemeernews.com

مشتاق افضل
کلکتہ

نظم

آپ یکتائے جہاں ہیں حضرتِ قیصر شمیم
محسنِ اردو زباں ہیں حضرتِ قیصر شمیم

بے تحاشہ بادہ کش حاضر ہیں پیمانہ بکف
میرے خانہ جہاں ہیں حضرتِ قیصر شمیم

خونِ دل سے گلشنِ اردو کو بخشی زندگی
جانثار باغباں ہیں حضرتِ قیصر شمیم

ہو رہے ہیں دیکھیے سیراب کتنے تشنہ کام
فیض کے سیلِ رواں ہیں حضرتِ قیصر شمیم

اس لئے مسحور سارا مغربی بنگال ہے
صاحبِ شیریں بیاں ہیں حضرتِ قیصر شمیم

کہہ رہے ہیں نورِ پیکرؔ، آرزوؔ، مطربؔ، فراغؔ
بن کے سر پہ سائباں ہیں حضرتِ قیصر شمیم

ہم شہودی ہو کے بھی ان کے ثناخوانوں میں ہیں
فکر کے روحِ رواں ہیں حضرتِ قیصر شمیم

جس کے دم سے ہے ادب میں روشنی افضل میاں
چرخ کے وہ کہکشاں ہیں حضرتِ قیصر شمیم

شمس افتخاری
کلکتہ

در مدحِ قیصر شمیم

کیا فکر، کیا زبان ہے قیصر شمیم کی
دنیا ہی قدر دان ہے قیصر شمیم کی

انمول کوئی کوئی ہے نایاب لعل و زر
غزلوں کی ایسی کان ہے قیصر شمیم کی

ممکن نہیں رسائی مقامِ شمیم تک
ہستی اک آسمان ہے قیصر شمیم کی

عش عش کرے وہ ان کی جو تقریر کو سنے
من موہنی زبان ہے قیصر شمیم کی

ہو کر سخن وری سے الگ جی نہ پائیں گے
یہ شاعری تو جان ہے قیصر شمیم کی

ہر خاص و عام دل سے کرے ان کا احترام
وہ سروری، وہ شان ہے قیصر شمیم کی

دشمن ہو یا کہ دوست، گلے سے لگائیں گے
طینت ہی مہربان ہے قیصر شمیم کی

چرخِ ادب بھی دیکھ کے اے شمسؔ دنگ ہے
اونچی بہت اڑان ہے قیصر شمیم کی

www.taemeernews.com

اصغر ندیم نظامی
کلکتہ

صاحبِ فکر و نظر

(استادِ محترم حضرتِ قیصر شمیم کی نذر)

آپ کی شان میں کیا لکھے گا کوئی   آپ کی مدح کیسے کرے گا کوئی
دامنِ چاک اپنا سئے گا کوئی   بات جب بھی ادب کی سنے گا کوئی
بخش دی شاعری کو نئی زندگی
آپ نے دی ہمیں علم کی روشنی

کیسے پہنچے وہاں تک کوئی نکتہ داں   آپ کی فکر میں ہیں جو گہرائیاں
جس کی تعریف کرتے ہیں اہلِ زباں   آپ کا تو ہے پاکیزہ طرزِ بیاں
اے شمیم آپ ہیں شاعرِ خوش ادا
شعر ہیں آپ کے "زندگی کی صدا"

مرکزِ نور ہے آپ کا سنگِ   ارضِ بنگال کو ناز ہے آپ پر
ضو فشاں جس سے ہے بزمِ علم و ہنر   آپ ہیں فکر و فن کے وہ نادر گہر
خوں سے سینچتے ہیں ادب کا چمن
آپ کا ہے جدا سب سے رنگِ سخن

ان کے صدق و صفا کا نہیں تذکرہ   یہ شمیم وفا کا نہیں تذکرہ
ان کی طرزِ ادا کا نہیں تذکرہ   حسنِ حرف و صدا کا نہیں تذکرہ
تذکرہ شمعِ بزمِ سخن کا ہے یہ
تذکرہ نازشِ انجمن کا ہے یہ

آپ حسنِ شرافت کے مینار ہیں   آپ خلق و مروت کے مینار ہیں
یہ بھی سچ ہے محبت کے مینار ہیں   دہر میں نیک سیرت کے مینار ہیں
اے ندیم! اس پہ کم ہے جو اتنا کرے
آپ کی ذات پر ناز جتنا کرے

www.taemeernews.com

شاہد اقبال
کلکتہ

روشنی کا منارہ

اے مرے بیباک قیصر، اے سخنور خوشنوا
بزم ہائے زندگی میں منفرد تیری ادا
ایک شاہد ہی نہیں' اہلِ نظر ہیں معترف
علم و دانش کا یقیناً تو ہے گوہر بے بہا

ساعتوں کے بحر میں غوطے لگائے دم بہ دم
گلبکنی کی داستاں کرتا رہا خامہ رقم
حضرتِ قیصر کے حق میں یہ دعا ہے اے خدا!
علم و فن کو سینچنے میں وہ رہیں ثابت قدم

اشہرؔ و ارشادؔ ہوں یا نور پیکر یا نعیمؔ
یا فراغ روہوی ہوں یا شگفتہؔ یا نسیمؔ
ذات سے جن کی نمایاں ہو گئے فن کار سب
روشنی کا وہ منارہ حضرتِ قیصر شمیم

اکرم بارک پوری
کلکتہ

علم و ادب کا پارس

اک علم کے سمندر قیصر شمیم صاحب
اخلاق کے پیمبر قیصر شمیم صاحب
داناؤں کے ہیں دلبر قیصر شمیم صاحب
شعر و ادب کے پیکر قیصر شمیم صاحب
پل بھر میں ہم نے دیکھا' سونا بنا ہے پتھر
اک آپ ہی کو چھو کر قیصر شمیم صاحب
کتنوں کی ہے یہ حسرت'شاعر بنے وہ اک دن
شعر آپ کو دکھا کر قیصر شمیم صاحب
اس شہر کولکاتا میں آپ سا کہاں ہے
شیریں زباں سخنور قیصر شمیم صاحب
ہر ایک انجمن میں شعر و ادب کے اکرمؔ
مینا ہیں اور ساغر قیصر شمیم صاحب

۱-اشہر ہاشمی ۲-ارشاد آرزو ۳-نعیم انیس ۴-شگفتہ طلعت سیما/شگفتہ یاسمین غزل ۵-نسیم فائق

www.taemeernews.com

اختر بارک پوری
کلکتہ

مردِ قلندر

قیصر وہ سخنور ہیں
سراپا جو
اخلاص کے پیکر ہیں

اسلوب ہے
مان کے ناقد نے
قیصر کو اچھالا ہے

کب عیش و طرب میں ہے
نصف صدی سے جو
میدانِ ادب میں ہے

دراصل قلندر ہیں
حضرت قیصر
بس نام کے قیصر ہیں

فراغ روہوی
کلکتہ

رباعیات

یوں ہی تو نہیں لوگ اسیرِ قیصر
اخلاص و محبت ہے خمیرِ قیصر
ہیں اور بھی بنگال میں شاعر اچھے
لیکن ہے کہاں کوئی نظیرِ قیصر

ہر حال میں آواز جدا رکھتے ہیں
وہ سوز کہ ہو ساز ا رکھتے ہیں
قیصر تو مزاجاً ہیں قلندر کی طرح
وہ جینے کا انداز ا رکھتے ہیں

قطعہ

اک شاعرِ فطری ہیں کہ نثار ہیں قیصر
جس سمت سے پرکھو گے طرح دار ہیں قیصر
کیا نظم، غزل، گیت، رباعی، دوہا
ہر صنف کی زلفوں کے گرفتار ہیں قیصر

www.taemeernews.com

سید منیر نیازی
کلکتہ

ہمارے شیخ

جنوری ۱۹۷۰ء کی وہ شام مجھے آج بھی یاد ہے جب محمود ایوبی نے کلکتہ کی چونا گلی میں پان کی ایک دکان کے سامنے کھڑے ایک شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا...... یہ ہیں قیصر شمیم، میرے اچھے دوست، سی ایم او ہائی اسکول میں ٹیچر ہیں۔"

"قیصر شمیم؟ کیا وہی جو شاعر ہیں؟"......میں سراپا سوال تھا۔

محمود ایوبی نے ہنستے ہوئے کہا...... "ہاں ہاں وہی قیصر شمیم۔ کیا تم نے ان کی شاعری پڑھی ہے؟"

"نہ صرف پڑھی ہے بلکہ ان کا ایک شعر آج بھی میری نوٹ بک میں درج ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا، یہ حادثہ کب ہوا؟"......شاعر بیزار محمود ایوبی نے حیرت سے پوچھا۔

"بات بہت پرانی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں بنارس میں بی اے کے سال اول میں تھا تو محمود احمد ہنر کی ادارت میں الہ آباد سے شائع ہونے والے اردو ڈائجسٹ "شاہ کار" میں ان کی ایک غزل پڑھی تھی جس کا ایک شعر میں نے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا تھا اور وہ شاید آج بھی مجھے یاد ہے۔" میں نے تفصیل بتائی۔

"شعروں کے انتخاب نے بہتوں کو رسوا کیا ہے۔ ذرا ہم بھی تو سنیں وہ کیا شعر ہے؟" محمود ایوبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے شعر سنایا

شہر الم سے شہر طرب تک ایک قدم کی دوری ہے
پھر بھی یہ دوری طے نہیں ہوتی ہائے یہ کیا مجبوری ہے

اپنا کافی پرانا شعر ایک اجنبی صحافی سے سن کر قیصر شمیم کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ وہ بیک وقت خوش بھی ہو رہے تھے اور شرما بھی رہے تھے۔ انھوں نے تقریباً صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے ابتدائی دور کی ایک غزل کا

www.taemeernews.com

شعر ہے اور اب اس شعر کی اہمیت خود میری نظر میں اس لیے بڑھ گئی ہے کہ یہ اتنے دنوں بعد آج بھی آپ کو یاد ہے۔

محمود ایوبی کا تبصرہ تھا۔ ''شعر اچھا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ اسے ۱۴ رسال تک ذہن میں محفوظ رکھا جائے۔ایسا لگتا ہے کہ اس کچی عمر میں تم دونوں ایک ہی جیسی ذہنی کیفیت سے دوچار تھے۔''

پان کی دکان پر کھڑے کھڑے ہونے والی ملاقات قیصر شمیم کے اس وعدے کے ساتھ ختم ہوگئی کہ وہ جلد ہی ملیں گے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے محمود ایوبی سے کہا...... ''یہ شخص تو کچھ معقول لگا۔''

محمود ایوبی نے مسکراتے ہوئے کہا...... ''تمہارے علاوہ میرے سبھی دوست معقول ہیں۔ابھی کیا ہے، دو چار اور ملاقاتیں اور ہو لینے دو اس کے بعد اس شخص کے جوہر تم پر کھلیں گے۔''

کسی سے پہلی ملاقات کے بعد ہی میرے اندر کی کوئی طاقت یہ طے کر دیتی ہے کہ اس شخص سے تعلقات رکھے جائیں یا نہیں۔اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ اس طرح کا فیصلہ سوفی صد درست ثابت ہوا۔یہی وجہ ہے کہ میرا حلقۂ احباب ضرورت سے کچھ زیادہ ہی محدود ہے۔قیصر شمیم مجھے پہلی ہی نظر میں اچھے لگے اور میرے اندر کی مخفی طاقت نے بھی گرین سگنل دے دیا۔پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ہم ہر ملاقات کے بعد ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔کچھ عرصہ بعد محمود ایوبی کلکتہ سے ممبئی منتقل ہو گئے لیکن قیصر شمیم کے ساتھ میری دوستی نہ صرف برقرار رہی بلکہ اس میں وسعت پیدا ہوگئی۔حکیم عرفان الحسینی اور پروفیسر اعزاز افضل کے خانۂ دل میں جب میرا گزر ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت وہاں مجھ سے پہلے ہی سے براجمان ہیں۔پھر تو ہم تینوں، اعزاز افضل، قیصر شمیم اور میں، حکیم صاحب کے مطب میں ''دوائے دل'' کے لیے حاضر ہونے لگے۔یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔حکیم صاحب کے مطب میں دوائے دل تھی ہی نہیں جو ہمیں دیتے اس لیے ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' جیسی صورت حال پیدا ہوگئی اور پھر یہ روگ اس انتہا کو پہنچ گیا جب دو دوست گھنٹوں ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی آپس میں کوئی گفتگو نہیں کرتے، صرف ایک دوسرے کو محسوس کرتے ہیں۔

اب جب کہ ہماری رفاقت کے ۲۷ رسال مکمل ہو چکے ہیں، میں اکثر حیرت سے سوچتا ہوں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہے۔بظاہر ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ہم دونوں بہت سے معاملات میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔مثلاً قیصر شمیم شیریں گفتار ہیں جب کہ میرا انداز گفتگو انتہائی کھردرا ہے۔قیصر شمیم دوست ہو کہ دشمن سبھی سے ٹوٹ کر ملتے ہیں اور اپنے چہرے سے قطعی ظاہر ہونے نہیں دیتے کہ وہ جس سے مخاطب ہیں اس کی کوئی بات انھیں گراں گزری ہے جب کہ میں اس ہنر سے قطعی ناواقف ہوں۔

www.taemeernews.com

میرے جذبات فوراً ابھر کر نہ صرف میرے چہرے بلکہ زبان پر بھی آجاتے ہیں اور نوبت لڑائی تک پہنچ جاتی ہے۔ قیصر شمیم لطیف جذبوں کے حساس شاعر ہیں جب کہ میں لٹھ مار قسم کا دیہاتی ہوں اور ادب سے میرا تعلق محض قاری کی حیثیت سے ہے۔ مجھے فلموں سے الجھن ہوتی ہے جب کہ قیصر شمیم فلموں کے دیوانے ہیں۔ اس سلسلہ میں بطور احتیاط یہ بات اپنے ذہن میں ضرور رکھیں کہ اگر آپ کو کبھی قیصر شمیم کے ساتھ فلم دیکھنے کی مجبوری پیش آجائے تو دوران فلم ان کو ہرگز ڈسٹرب نہ کریں کیوں کہ وہ ایسی صورت میں بلا تکلف جارحیت پر اتر آتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو بشیر آروی سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ اتنے متضاد رویوں والے دو آدمیوں میں طویل دوستی کی جب کوئی وجہ تلاش کے باوجود نہ مل سکی تو ایک دوست نے مشورہ دیا کہ کسی ماہر نفسیات سے ملو۔ میاں کی دوڑ مسجد تک، میں نے حکیم عرفان الحسینی سے رجوع کیا جنہوں نے کافی غور وخوض کے بعد تشخیص کی کہ بلا شک تم دونوں کے درمیان ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے حماقت۔ میں نہیں جانتا کہ قیصر شمیم حکیم صاحب کی اس تشخیص سے متفق ہوں گے یا نہیں لیکن میں اس سے سو فی صد متفق ہوں۔

محمود ایوبی نے قیصر شمیم سے میری پہلی ملاقات کے موقع پر کہا تھا کہ دو چار ملاقاتوں میں تم پر اس شخص کے جوہر کھلیں گے، سو ایسا ہی ہوا۔ تقریباً ہر ملاقات کے دوران مجھے قیصر شمیم کا کوئی نہ کوئی نیا روپ دیکھنے کو ملا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان کے نت نئے روپ دیکھ کر ہی حکیم صاحب نے ایک روز انھیں ''شیخ'' کہا۔ اس میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی یہ تو حکیم صاحب ہی جانیں لیکن اعزاز افضل کے ساتھ ہمیں بھی یہ نام اتنا پسند آیا کہ اسی روز سے قیصر شمیم ہم تینوں کے شیخ ہو گئے۔ وہ دن اور آج کا دن، ہم اپنی نجی گفتگو کے دوران انھیں ''شیخ'' کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں۔

ہاں، تو میں شیخ کے نت نئے روپ کی بات کر رہا تھا۔ ان کا ایک روپ، جو ان کا بنیادی روپ ہے، شاعر کا ہے۔ مجھے ان کی شاعری اس لیے پسند ہے کہ اول تو بہت کم لکھتے ہیں اور لکھ بھی لیں تو عام شعراء کے برعکس خوشامد کرنے سے بھی سنانے گریز کرتے ہیں۔ ان کی کوئی بھی تخلیق ہمیں تادم تحریر صرف اخبار و رسائل کے ذریعہ ہی پڑھنے کو ملی۔ مجھے اپنے شاعر شیخ سے چڑ ہے تو اس بات پر کہ انھوں نے پوری اردو آبادی کو شاعر بنانا اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے۔ جب سے یہ یونیورسٹی جانے لگے، ان کے مشن کا دائرہ کچھ زیادہ ہی وسیع ہو گیا ہے۔ ''آزاد ہند'' کے دفتر میں جب اچانک یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کی غزلوں کی بھرمار ہونے لگی تو میں چونکا کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ ایک روز جب دفتر کے کام میں مصروف تھا تو یونیورسٹی کی ایک طالبہ اپنی غزل لے کر پہنچی۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ تم شاعری کیوں کرتی ہو، نثر کیوں نہیں لکھتیں؟ اس نے کہا..... ''سر کہتے ہیں کہ تمہارے اندر شاعری

www.taemeernews.com

کے جراثیم ہیں، تم شعر لکھو۔" میں نے جھنجلا کر پوچھا" کون ہیں تمہارے سر؟" اس غریب کا جواب تھا" قیصر شمیم صاحب"۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور وجہ سمجھ میں آ گئی کہ شاعری کی چھوت یونیورسٹی میں اتنی تیزی سے کیسے پھیلی۔

یہ ایک دیرینہ راز ہے کہ شاعر قیصر شمیم کے کتنے شاگرد ہیں۔ وہ خود اپنے شاگردوں کی تعداد بتانے سے گریز کرتے ہیں اس لیے کہ اس سلسلہ میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تعداد ایک سو سے ہرگز کم نہیں۔ شاید اکلوتے بیٹے کے باپ قیصر شمیم کو اپنی معنوی اولادوں کے ہجوم میں گھرے رہنے میں روحانی مسرت ہوتی ہے جبھی تو وہ اپنے وقت کا بڑا حصہ ان کی نذر کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی کی غزل کی اصلاح کر رہے ہوتے ہیں تو کبھی کسی کی نظم کی نوک پلک درست۔ بات یہیں تک محدود نہیں۔ اس کے بعد وہ اس فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کی تخلیقات کی اشاعت کہاں اور کس طرح کرائی جائے۔ اگر کسی رسالے یا اخبار میں ان کے شاگرد کی تخلیق شائع ہو جاتی ہے تو فخر سے ان کا سینہ پھول جاتا ہے۔ وہ اس رسالے کو خرید کر گھر لے جاتے ہیں اور اس طرح سینت کر رکھتے ہیں جیسے وہ خود ان کی اپنی تخلیق ہو جب کہ وہ خود اپنی شائع شدہ تخلیقات کے ساتھ ایسا کم ہی کرتے ہیں۔ شاگردوں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے انھیں خود کچھ لکھنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر کڑھتا ہوں اور اس معاملہ کو لے کر اکثر میری ان سے لڑائی بھی ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ایک لاحاصل کوشش ہے۔ آپ اپنا وقت اور اپنی انرجی برباد کر کے اپنے اندر کے شاعر کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ میرے احتجاج پر ان کا جواب ہوتا ہے" مجھے اپنے ڈھنگ سے جینے دیجیے۔"

یہ تو تھا شاعر قیصر شمیم کا ایک روپ۔ اب آیئے میں آپ کی ملاقات ٹیچر قیصر شمیم سے کراتا ہوں۔ آج یونیورسٹی میں ان کی کلاس ہے اس لیے ملاقات ناممکن ہے۔ وہ صبح کو ناشتے کے بعد ہی نصابی کتابیں لے کر بیٹھ گئے ہوں گے ایسی حالت میں وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ وہ پڑھانے کی تیاری اس طرح کرتے ہیں جیسے خود کسی امتحان میں بیٹھنے جا رہے ہوں۔ میں نے ایک دن کہا" آپ خود پر اس طرح کلاس کو کیوں سوار کر لیتے ہیں۔" کہنے لگے...... " طالب علم میرے پاس اپنی تعلیم کی پیاس بجھانے آتا ہے۔ اگر میں اس کی توقع پر پورا نہ اتروں تو تف ہے مجھ پر اور میرے پیشے پر۔"

میں کہتا ہوں......اور بھی تو بہت سے ٹیچر ہیں...... وہ میری بات کاٹتے ہوئے کہتے ہیں،" مجھے اپنے ڈھنگ سے جینے دیجیے۔"

سوچتا ہوں اگر ذمہ داری کا یہی احساس ٹیچروں میں عام ہو جائے تو ہمارے ملک میں تعلیم کا معیار کتنا اونچا ہو جائے۔

www.taemeernews.com

بحیثیت دوست قیصر شمیم کا جواب نہیں۔ حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اس غریب کے دل میں سارے جہاں کا درد سما گیا ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج ان کے پاس نہیں۔ ایک ایسا شخص جسے بسا اوقات خود اپنی خبر نہیں ہوتی وہ دوستوں کے مسائل پر کڑی نگاہ رکھتا ہے اور کوئی کہے یا نہ کہے وہ اپنے طور پر ہر مسئلے کا حل تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کسی کے بیٹے کا اسکول یا کالج میں داخلہ کا معاملہ ہو، کسی کی بیٹی کی شادی کا مسئلہ ہو، کسی کی ماں بیمار ہو یا کسی کو روزگار کی تلاش ہو، بس خبر ہونے کی دیر ہے۔ اس کے بعد قیصر شمیم کی جدوجہد شروع۔ اکثر وہ اس طرح کی کوششوں میں خود لہولہان ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کی ضرورتوں پر اپنی ضرورتوں کو اس طرح قربان کر دیتے ہیں کہ پیشانی پر ایک شکن تک نہیں پڑتی۔ عجیب طرح کے اذیت پسند ہیں یہ۔ خود اپنی ذات کو دوسروں کی خوشی کے لیے اذیت میں مبتلا کر کے انھیں مزہ ملتا ہے۔ اگر ٹو کیے تو یہی کہیں گے ...... ''مجھے اپنے ڈھنگ سے جینے دیجیے۔''

قیصر شمیم کی لغت میں لفظ ''نہیں'' کا سرے سے وجود نہیں۔ دراصل انھیں ''نہیں'' کہنا آتا ہی نہیں۔ ''میرا خیال ہے کہ لفظ ''نہیں'' سے ان کی ناواقفیت ہی ان کی ڈھیر ساری پر۔ اور مسائل کی جڑ ہے۔

سنا ہے کہ انگریزی کے مشہور صحافی خشونت سنگھ کی بھی یہی عادت ہے۔ ایک صاحب نے اپنے مضمون میں ان کی اس عادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ خشونت سنگھ عورت نہیں ہوئے ورنہ وہ اپنی ''نہیں'' نہ کہنے کی عادت کی وجہ سے ہمیشہ حاملہ رہتے۔ کچھ یہی حال قیصر شمیم کا بھی ہے۔ میں نے خشونت سنگھ والے مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں ڈرایا بھی کہ ''نہیں'' کہنے کی عادت ڈالیے مگر ان کا رٹا رٹایا ایک ہی جواب ہے...... ''مجھے اپنے ڈھنگ سے جینے دیجیے۔''

ان کی سادگی اور میری ذات سے ان کی محبت کا ایک تازہ قصہ سنیے۔ انھیں جب کسی طرح بھنک مل گئی کہ میں ان کے متعلق ایک مضمون لکھ رہا ہوں تو ایک روز صبح سویرے میری رہائش گاہ پر پہنچ گئے اور بڑی سنجیدگی سے کہا...... ''آپ میرے متعلق کوئی مضمون ہرگز نہ لکھیں۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا...... آخر کیوں؟ کہنے لگے...... ''اس کی معقول وجہ ہے۔''

میں نے کہا...... ''اگر کوئی ہرج نہ ہو تو میں بھی سنوں کہ وہ معقول وجہ کیا ہے۔''

کچھ دیر خاموش رہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کشمکش میں ہوں کہ بتائیں یا نہ بتائیں۔ میرے اندر تجسس کا جذبہ جاگا اور میں نے کہا...... ''شیخ اب تو آپ کو بتانا ہی پڑے گا کہ آپ مجھے مضمون لکھنے سے کیوں روک رہے ہیں۔''

www.taemeernews.com

کہنے لگے......"بات دراصل یہ ہے کہ اب تک جس کسی نے میرے متعلق مضمون لکھنے کا ارادہ کیا وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ میں آپ کے مضمون کا اتنا بھاری معاوضہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

جب مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی تو انھوں نے غصے سے کہا......"آپ عجیب نامعقول آدمی ہیں۔ کل رات اس فکر سے مجھے نیند نہیں آئی اور آپ ہیں کہ ہنسے چلے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا......"شیخ! کان کھول کر سن لیجیے، میں مضمون لکھ کر ہی دم لوں گا۔ اب رہی موت کی بات' تو اس سے آج نہیں تو کل دو چار ہونا ہی ہے۔ پھر کیوں نہ مضمون لکھ کر مرا جائے کہ یہ اعزاز بہت کم عاشقوں کے حصے میں آیا ہوگا۔"

شیخ نے بڑی سختی سے کہا......"یہ فلمی ڈائیلاگ نہیں چلیں گے۔ یہ سراسر خودکشی کا معاملہ ہے جس کی اجازت قطعی نہیں دی جاسکتی۔"

معاملہ بگڑتے دیکھ کر میں نے شیخ کا ہتھیار خود ان کے ہی خلاف استعمال کرتے ہوئے کہا......"یہ کیا ناانصافی ہے یار، جب آپ اپنے ڈھنگ سے جینا چاہتے ہیں تو مجھے اپنے ڈھنگ سے مرنے کیوں نہیں دیتے؟"

شیخ یہ سن کر سکتے میں پڑ گئے اور کچھ دیر بعد سر جھکائے اس طرح واپس چلے گئے جیسے مجھے قبرستان پہنچا کر گھر واپس جا رہے ہوں۔

قیصر شمیم کے منتخب اشعار

تمھارے بس میں ہے' بڑھ کر تو چھین لو پہلے
اٹھے گا سر نہ کبھی' سر تو چھین لو پہلے

کریں گے ذکر ہی کیوں سر بریدہ شاخوں کا
ہماری آنکھوں سے منظر تو چھین لو پہلے

گھٹا اٹھے گی نہ بجلی ہی کوئی چمکے گی
مگر زمیں سے سمندر تو چھین لو پہلے

اتار لینا ہمیں بھی تم اپنے شیشے میں
ہمارے ہاتھوں کے پتھر تو چھین لو پہلے

www.taemeernews.com

منور رانا
کلکتہ

ہم سکھا دیں گے ہر اک قطرے کو طوفاں ہونا

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر قلم اٹھانے سے پہلے ہر زاویے سے سوچنا پڑتا ہے، ہر طریقے سے دیکھنا پڑتا ہے، دل اندر سے غریب آدمی کی طرح ڈرا رہتا ہے کہ کہیں میرے قلم اٹھاتے ہی شخصیت کی پارٹی کے لوگ پتھر نہ اٹھالیں، ہمت استون میں سے ڈرتے ہوئے آدمی کی طرح جواب دینے لگتی ہے۔ سیاست کے بکھراؤ نے ہر گلی، ہر محلے میں پارٹیاں بنادی ہیں۔ پارٹیوں کی زیادتیوں سے پارٹیشن کا خطرہ ہر وقت رہتا ہے۔ پارٹی تو موجود ہی رہتی ہے صرف کہیں سے لاکر یا نکال کر صرف "شن" جوڑ دینے پارٹیشن ہو جاتا ہے۔ پتھر اٹھانے والوں سے زیادہ خطرہ محسوس کرنے کی وجہ کلکتہ کارپوریشن کی سڑکیں ہیں۔ حالاں کہ پتھروں کے بے جا ڈھیر کو سڑک کہنا ایسا ہی ہے جیسے پھٹے ہوئے دودھ کو رابڑی کہا جائے، میں رابڑی کے ساتھ دیوی اس لیے نہیں لگاتا کہ اس بحر میں صرف لالو پرشاد یادو ہی غزلیں کہہ سکتے ہیں، میں تو "میّا موری، میں نہیں مکھن کھایو" کہنے کے باوجود مشکوک ہوں، کلکتہ کارپوریشن کی "سڑکوں" سے تیز رفتار گاڑیاں جب گزرتی ہیں تو ان کے ٹائروں کی نال سے پتھر بندوق کی گولیوں کی طرح نکلتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نشانہ تو انسان کا ہوتا ہے پتھر تو بے چارے بے جان پتھر ہوتے ہیں۔ انھیں تو لوگ بھگوان بھی کہہ دیں تو وہ کچھ نہیں بولتے اور اگر پتھر بول ہی دیتے تو بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے مقدمے کی فائل کورٹ میں دھول کیوں پھانک رہی ہوتی۔

کلکتہ کارپوریشن کی سڑکوں کی ایک خوبی ہے کہ وہاں کسی نازک حسینہ کا پرس تو مل جائے گا لیکن جلدی سے پتھر نہیں ملیں گے۔ یہ موقع کلکتہ کارپوریشن کے حکام کے خوش ہونے کا نہیں ہے نہ کلکتہ پولس کی نمائشی مسکراہٹ کا، حالاں کہ مسکراہٹ سے پہلے میں زہریلی بھی لکھ سکتا تھا لیکن پولس کے ساتھ مسکراہٹ لکھنا ایسا ہی جیسے کسی طوائف کو شادی شدہ لکھا جائے۔ کیوں کہ سڑک پر پڑے پرس کے محفوظ رہنے کی وجہ پولیس کی بہترین چوکسی نہیں ہے۔ بلکہ جھولوں، بیگوں اور بریف کیس میں ملنے والے بم ہیں جس کی دہشت سے ماہر گرہ کٹ بھی ان دنوں آدمی دیکھ کر جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ بیویاں جو شوہر کی جیب کو اپنے بلاؤز کا حصہ سمجھتی تھیں وہ بھی اب اپنے

www.taemeernews.com

صدیوں پرانے حق استعمال سے گریز کرتی ہیں اور شوہر کی جیب سے پیسے اتنی صفائی سے نکالتی ہیں جیسے اسمگلر بارڈر سے مال نکالتے ہیں جیسے مستری گیراج کی گاڑی سے پٹرول نکالتے ہیں، جیسے بے روزہ دار ٹوپی نکالتا ہے، جیسے کنجوس آدمی زکوٰۃ نکالتا ہے، جیسے دھوبی پاجاموں سے ازار بند نکالتا ہے، جیسے پوسٹ مین ڈاک ٹکٹ نکالتے ہیں۔ جیسے بوڑھے جوان عورت کو دیکھ کر حسرت نکالتے ہیں۔ جیسے شاگرد ہیلیقے سے مانگ پر استاد کی غزل نکالتا ہے۔ سڑک پر پتھر نہ ملنے کی وجہ کلکتہ کارپوریشن کی لیاقت نہیں ہے بلکہ بیچاری سڑک کے بھی پتھر دہی کی طوائفوں کی طرح مہینے پہلے سے بک رہتے ہیں۔ ہر پتھر ہمیشہ کسی نہ کسی ہاتھ میں ہوتا ہے اور ہاتھ کسی نہ کسی جانب اٹھا ہوتا ہے۔ اس آپسی سنگ باری کی وجہ سے حکومت بالکل محفوظ رہتی ہے۔ بلکہ بقول حکیم صاحب اب حکومتیں سڑک بنوانے کے ٹنڈر کے ساتھ ہی ساتھ سڑک کے پتھروں کو انسانی ہاتھوں کے لائق بنانے کا ٹنڈر بھی طلب کرتی ہیں۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پتھروں کی اتنی بہتات ہوگئی ہے کہ اب سڑک کنارے آباد لوگ اپنے اپنے گھروں میں سل بٹہ نہیں رکھتے بلکہ سڑک سے مسالہ پیس لاتے ہیں۔ ناقدریٔ سنگ کا یہ عالم ہے کہ اس عہد کی اکثر لیلائیں اپنے مجنوؤں کو لات گھونسوں سے پٹتے دیکھ کر گزارش کرتی ہیں کہ ؏

کوئی پتھر سے بھی مارے مرے دیوانے کو

بات شروع یہاں سے ہوئی تھی کہ کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن پر قلم اٹھانے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے۔ ان میں ایک نام جناب قیصر شمیم کا ہے جن کی ادبی صلاحیت اس گہرے جھیل کی طرح ہے جس کا پتہ لگانے والا لوٹ کر ہی نہیں آتا، وہیں کا ہو رہتا ہے، جن کی علمی لیاقت کے آگے بہت سے قلمی ڈاکٹر گردن ڈالے رہتے ہیں۔ جن کی تربیت کبوتر کو عقاب بنا دیتی ہے۔ ان کے ادبی بیڑے میں شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار، انجینئر، ڈاکٹر (دونوں طرح کے) لیڈر، پروفیسر، پولیس، مجرم، ناستک، اللہ والے، کمیونسٹ، بھاجپائی، کانگریسی، نکسلی، ''اِدھر والے'' اور ''اُدھر والے'' سبھی شامل ہیں۔ ممکن ہے کہ انڈر گراؤنڈ طور پر خاکی نیکر والے بھی شامل ہوں لیکن میں تصدیق نہیں کر سکتا کیوں کہ ان کی پریڈ بہت سویرے ہوتی ہے اور میں بہت دیر سے سو کر اٹھتا ہوں، بلکہ اٹھتا کہاں ہوں گھر والوں کے ہاتھوں ذلیل کر کے اٹھایا جاتا ہوں۔ اس بحری بیڑے میں شامل کئی شاگردوں کے پاس مہلک ہتھیار بھی ہیں اور کئی بذات خود اسلحہ ہیں۔ سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ ان کے پاس ایک خودکش دستہ بھی ہے جو ہر وقت مرنے مارنے پر تیار رہتا ہے۔ ان کے دبلے پتلے شاگرد ہوا میں مار کرنے والے لڑاکو جہاز ہیں، میرے جیسے موٹے تازے زمینی لڑائی میں کام آتے ہیں۔ دوران جنگ کچھ شاگرد ان کا کلام پڑھتے ہیں باقی اللہ کا کلام پڑھتے ہیں۔ جو تیرنا جانتے ہیں پن ڈبی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جو تیرنا نہیں جانتے انھیں ہنگی سے

www.taemeernews.com

دستبردار کر کے سنٹرل ایونیو اور راجہ بازار میں مال بردار بنا دیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند کو نئے فوجیوں کی بھرتی پر لگا دیا جاتا ہے، کچھ یہ کام بہت ایمان داری سے کرتے ہیں۔ اور کچھ الگ اپنی چھاپہ مار فوج بنا لیتے ہیں۔ بہت سے مدرسوں کے لیے چندہ وصولنے والے اپنی رسیدیں چھپوا لیتے ہیں۔ قیصر شمیم صاحب یوں تو اردو کے تعلیمی شعبے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن خفیہ طور پر ایک گیراج کے مالک بھی ہیں، حالاں کہ اس گیراج سے ان کو آمدنی بالکل نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی تو انھیں اپنے پاس سے مرمت کے لیے آئی گاڑیوں میں پٹرول بھی بھروانا پڑتا ہے لیکن پٹھان پیسے کے لیے نہیں عزت کے لیے لڑتا ہے۔ یہاں تک کہ جب غالب بھی معاصرین کی "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ" سے پریشان ہو گئے تو انھوں نے بھی قلم کو تلوار کی طرح پکڑ کر ہم عصروں کو خبردار کیا کہ :

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

حالاں کہ حکیم صاحب نے ہمیشہ اس گوشۂ انفرادیت کو تضحیک کی نگاہ سے دیکھا، کہتے تھے یہ شعر انھوں نے معاصرین کی چشمکوں سے عاجز آ کر نہیں کہا تھا بلکہ یہ شعر مرزا غالب کی دہشت گردانہ حرکتوں کی پول پٹی کھولتا ہے۔ یہ شعر صرف اور صرف اس ذومنی کو دھمکانے کے لیے کہا گیا تھا جس کی جسمانی سلطنت پر شہر کوتوال منشی صدرالدین کا قبضہ تھا، اور غالب صرف اس ذومنی کے روحانی پیشوا بن کر رہ گئے تھے، حالاں کہ غالبؔ اور بشیر بدرؔ اگر پیشۂ سپہ گری کی طرف جاتے تو انگریزوں کے خلاف نہیں بلکہ انگریزوں کے لیے سپہ گری کے جوہر دکھاتے، شاعری میں تو انگریزوں کو اپنے جوہر دکھا نہیں سکتے تھے، جس طرح اگر ہم بنگلہ زبان جانتے تو بنگلہ میں شاعری کرتے۔ اردو میں شاعری کر کے کباب گلی کے کتوں کی غذا کبھی نہ بنتے۔ بنگلہ میں شاعری کرتے اور ٹھاٹھ سے چھوٹے نذرالاسلام بن کر گھومتے اور اردو اکادمی کے ارباب اقتدار کے شر سے محفوظ رہتے اور عیش کرتے۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ قیصر صاحب کا گیراج گھانٹے کی مرغی ہے۔ لیکن مرغوں کو رجھانے کے لیے مرغی بہت ضروری ہوتی ہے۔ اڑان والے کبوتر پکڑنے کے لیے کچھ پر کٹے گولے کبوتروں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ کبوتر باز نئے کبوتر کو (بھڑکی) تو ان ہی کبوتروں سے دیتا ہے۔ جس طرح ریٹائر ہونے کے بعد جو بزرگ مولوی ہونے سے بچ جاتے ہیں وہ مصنوعی خدمت خلق کے جذبے کی تسکین کے لیے ہومیو پیتھک کی ایک کتاب اور میٹھی گولیوں کا ایک بکس خرید لیتے ہیں اور محلے کے تمام ایسے پُر امید مریضوں کے ڈاکٹر بن جاتے ہیں جن کو یہ یقین رہتا ہے کہ دوائیں آدمی کو موت سے بچا لیتی ہیں۔

قیصر صاحب کا یہ گیراج دراصل ادبی گیراج ہے جہاں غزلوں، نظموں، نثری مضامین یہاں تک کہ مراسلات کی بھی مرمت ہوتی ہے۔ بلکہ تخلیق کے ناکارہ پرزوں کو یا تو زبان کے خراد پر رکھ کر ٹھیک کیا جاتا ہے یا

www.taemeernews.com

بالکل نئے پرزے لگا دیے جاتے ہیں۔ بقول حکیم صاحب کسی کسی گاڑی میں نمبر پلیٹ کے سوا سب کچھ بدل جاتا ہے۔ کچھ بگڑی ہوئی گاڑیاں گیراج تک لائی جاتی ہیں اور کچھ بڑے لوگ اپنے گھر پر ہی ادبی گاڑی ٹھیک کرواتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو گیراج مالک کے سلسلے میں مشکوک رہتے ہیں کہ کہیں میری گاڑی کا کوئی پرزہ کسی دوسرے کی گاڑی میں نہ فٹ کر دیا جائے۔ بقول حکیم صاحب، یہ وہی لوگ ہیں جو دواخانے میں آتے ہوئے شرماتے ہیں اور اپنے گھر پر ہی اپنی جوانی کی غلط کاریوں کی ریپیرنگ کرواتے ہیں۔ یوں تو شہر میں کئی ادبی گیراج ہیں لیکن ؏

دکان چلتی نہیں ہے خدا چلاتا ہے

اس ادبی گیراج کی بنائی ہوئی گاڑیاں سارے ہندوستان میں چلتی ہیں، جیسے نقلی نوٹ چلتے ہیں، جیسے میلے میں کھوٹی اٹھنی چلتی ہے، جیسے کرائے پر سیڑھی چلتی ہے۔ دراصل دوسرے گیراج عموماً چھٹی کے دن بند رہتے ہیں، یا بند کے دن چھٹی رہتی ہے۔ لیکن جو گیراج دن رات کھلا رہے، مالک ملنسار ہو، مجتی ہو، اپنائیت سے ملتا ہو، لفظ کے ہر پرزے کو پسینے کے پٹرول سے دھو کر مانجھ کر فٹ کرتا ہو، اس کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔

بنگال کے بزرگ شاعروں میں قیصر شمیم صاحب سب سے زیادہ خوش مزاج شاعر ہیں۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ خوبصورت ہنسی کھیلتی رہتی ہے جو لیموں چاٹنے سے بھی غائب نہیں ہوتی۔ مزاج میں خاکساری سیّدوں والی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ایک دن میں جتنی غزلوں' نظموں کو سدھار دیتے ہیں اتنی تو بہت سے شاعر ساری زندگی میں نہیں سدھار پاتے۔ اپنے لیے انھوں نے زندگی میں کسی سے کچھ نہیں مانگا لیکن شاگردوں کے لیے ادھار تک مانگنے کو تیار رہتے ہیں۔

وجیہہ چہرے پر سوچتی ہوئی آنکھیں، ہونٹوں پر جانی پہچانی مسکراہٹ، مسکراہٹ کو پان کی پیک سے گلابی کیے ہوئے، مستقل کہیں کھوئے کھوئے سے۔ ہمیشہ ایک جیسا لباس پہنے۔ لباس میں اتنی یکسانیت کہ دھوبی ان کے کپڑوں کو گھر بیٹھے گھاٹ پر پہچان لے۔ اگر کرتے پاجامے کی جگہ پینٹ پہننا شروع کر دیں تو لوگ کسی امریکن دوا کی کمپنی کی یونی فارم سمجھیں۔ لیکن لباس ہمیشہ اپنی شخصیت کی طرح صاف ستھرا۔ دھلے دھلائے کرتے پاجامے میں چہرے کے کھینچے کھینچے خدوخال کی وجہ سے بنگالی دادا منی معلوم ہوتے ہیں۔ بال سلیقے سے کڑھے ہوئے لیکن ایک آدھ لٹ اردو غزل کی زلف پریشاں کی طرح اڑتی ہوئی، ساتھ میں ایک انٹلکچول جھولا جس میں شاگردوں کا کلام، پان کی دو چار پڑیاں، اردو کا ایک آدھ رسالہ، دوا کی دو چار گولیاں اور دو عدد قلم۔ ایک قلم سے شاعروں کو اصلاح دیتے ہیں اور دوسرے قلم سے شاعرات کی امداد کرتے ہیں۔ قلم کبھی تبدیل نہیں ہونے

www.taemeernews.com

دیتے کہ کہیں لسِ تحریر سے نسوانیت عشق کے چکر میں نہ پڑ جائے۔ بہت زیادہ منکسر المزاج ہیں۔ اپنے شاگردوں کے مذہب وملت اور عادت وعلت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ کہیں کنواں ، پیاسے کا مذہب پوچھتا ہے۔ کہیں چھاؤں بھی کسی سے ذات پوچھتی ہے، کہیں فقیر بھی کسی سے اس کا مسلک پوچھتا ہے؟ اور پھر بے جا کھوج بین ہمیشہ نفرت اور دہشت گردی پیدا کرتی ہے۔ ارباب حکومت چاہیں تو ان سے یہ ہنر سیکھ لیں ، اور اطمینان سے حکومت کرتے رہیں۔ آج تک اُن کو کسی نے گالی بکتے سنا ہے نہ اللہ کا نام لیتے دیکھا ہے۔ رمضان میں وہ دن میں کسی کو دکھائی نہیں دیتے' آئینے کو بھی نہیں' کیوں کہ آئینے سچ بولتے ہیں۔ ان کے پاس بہت تیز جاسوسی نظام ہے، سی بی آئی کا تو بس نام ہی نام ہے، شہر کے ہر ادبی غیبت کدے کے بلیو پرنٹ ان کے پاس موجود رہتے ہیں لیکن وہ انھیں استعمال نہیں کرتے صرف ایٹم بم کی طرح سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اپنے کٹر سے کٹر مخالف کو بھی اتنے پیار سے بابو کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو چندرابابو نائیڈو سمجھتا ہے اور برباد ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی مسکراہٹ اور پان کی وجہ سے دور سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ مسکرانے کے لیے پان کھاتے ہیں یا پان کھانے کے لیے مسکراتے ہیں۔ ہمیشہ منہ بند رکھتے ہیں۔ اگر کبھی کھولتے بھی ہیں تو پان کی پیک کو نجات دینے کے لیے، یا شاگردوں کو اصلاح کی سوغات دینے کے لیے۔ پان میں غالباً پیپرمنٹ کی مقدار زیادہ رکھتے ہوں گے اس لیے ہر وقت ٹھنڈے رہتے ہیں، غصے کی حالت میں بھی، مئی وجون میں بھی اور بخار میں بھی۔ کبھی کسی کی غیبت نہیں کرتے، کسی کا شکوہ نہیں کرتے، کوئی احتجاج نہیں کرتے، انقلاب زندہ باد نہیں کرتے صرف اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اگر آر-ایس-ایس میں ہوتے یا مسلمانوں میں آر-ایس-ایس ہوتی تو اس کے تاحیات ''پربندھک'' ہوتے اور میرے جیسے آتنک وادی ان کے پاس مستقل بندھک ہوتے۔ کبیرداس جی نے ان کے بارے میں ۶۰۰ برس پہلے کہہ دیا تھا کہ!

کبیرا کھڑا بجار میں سب کی مانگے خیر   نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر

ان کے شاگردوں میں کچھ تو ان کے ہم عمر ہیں اور کچھ بالکل کم عمر، شاگردائیں بھی یقیناً کئی ہم عمر ہوں گی' لیکن قیصر شمیم صاحب ان سب کا نام چھپاتے ہیں اور وہ اپنی عمریں چھپاتی ہیں۔ ڈھلتی دھوپ کی عمر والی شاگردائیں مدر ٹریسا کا رول ادا کرتی ہیں۔ جو کم عمر ہیں وہ سسٹر کہلاتی ہیں، جن کی عمر سمجھ میں نہیں آتی انھیں کچھ نہیں کہا جاتا۔ یہاں تک کہ شعر کہنے کو بھی نہیں۔ ان کی حاضری صرف فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ہوتی ہے۔

قیصر شمیم صاحب اس اعتبار سے بے حد خوش نصیب ہیں کہ اس زمانے میں جب اپنی اولادوں کے فرماں بردار ہونے کی کوئی کمپنی گارنٹی نہیں لیتی، اُن کے شاگرد اُن کو دل وجان سے چاہتے اور احترام کرتے ہیں۔ اگر الیکشن ہو جائے تو ان کے حریفوں کو ضمانت تو کجا اپنی جان بچانا بھی دشوار ہو جائے کیوں کہ ہر ادارے، ہر

www.taemeernews.com

رے اور ہر طیارے یہاں تک کہ گرد وارے تک میں ان کے شاگرد ایکشن پلان لیے بیٹھے ہوں گے۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے شاگردوں کو پالا نہیں ہے۔ پرورش کی ہے۔ آپ سوچیں گے پالنے اور پرورش کرنے میں کیا فرق ہے تو میں عرض کرتا چلوں کہ شیر اپنے بچے کو پالتا نہیں بلکہ پرورش کرتا ہے بالکل اپنے جیسا بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیصر شمیم صاحب کے ادبی مدرسے میں بڑے بڑے عالم دین وادب کے بچے بھی داخلے کے لیے قطار میں کھڑے رہتے ہیں :

بے ادب ہم سے نہ اے گردشِ دوراں ہونا
ہم سکھا دیں گے ہر اک قطرے کو طوفاں ہونا

غـــزل

انسان گھٹائے جاتے ہیں، سایوں کو بڑھایا جاتا ہے
دنیا میں ہماری یہ کیسا اندھیر مچایا جاتا ہے

ہے پست بہت معیارِ ستم، کیا زور دکھایا جاتا ہے
گردن جو کبھی اٹھتی ہی نہیں، اس کو بھی اُڑایا جاتا ہے

ہم اہلِ سیاست کے کرتب ہر روز ہی دیکھا کرتے ہیں
جن جن کے یہاں مجبوروں کو انگلی پہ نچایا جاتا ہے

پہلے تو جتائی جاتی ہے ہمدردی پیاس کے ماروں سے
پھر آنکھ بچا کر پانی میں کچھ زہر ملایا جاتا ہے

گرنے پہ مرے افسوس نہ کر، دنیا میں ہمیشہ اے قیصرؔ
جب خود کو اٹھانا ہوتا ہے، بہتوں کو گرایا جاتا ہے

قیصر شمیم

www.taemeernews.com

فراغ روہوی

کلکتہ

میرے قلم کو تیشۂ فرہاد جانیے

کہتے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد ایک خاص فرشتہ بچے کو دعا اور بوسہ دیتا ہے۔ اگر وہ منہ پر بوسہ دے تو بچہ اچھا گلوکار یا مقرر ہوتا ہے' پیشانی پر بوسہ دے تو وہ بہت ذہین اور عالم ہوتا ہے' ہاتھ پر بوسہ دے تو وہ بہت اچھا قلم کار یا مصور وغیرہ بنتا ہے۔ قیصر شمیم صاحب کی شش جہات شخصیت کو پیش نظر رکھ کر آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فرشتے نے ان کو کہاں کہاں بوسہ دیا ہوگا!

قیصر شمیم کسی فرد کا نہیں' ایک جگمگاتی ہوئی انجمن کا نام ہے! اتنی عریض و وسیع انجمن پورے مغربی بنگال میں دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ وہ انجمن ہے جہاں صبح کی انگڑائیوں کے ساتھ قیصر صاحب کے پرستاروں کی چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں ہر وقت ادبی' سماجی' سیاسی یعنی ہر مکتبۂ فکر کی شخصیات کی چہک دمک نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ شام کا شباب ڈھلنے لگتا ہے لیکن اس کی رونق میں کمی نہیں آتی۔ یہاں کی مخلصانہ فضا ہر آنے والے سے یہ برملا کہتی ہے :

اس انجمن میں آپ کو آنا ہے بار بار
دیوار و در کو غور سے پہچان لیجیے

قیصر صاحب یوں تو حسب نسب سے پٹھان ہیں۔ لیکن اُن کی کسی بھی طرز عمل سے پٹھانی نہیں ٹپکتی، نہ کسی زاویے سے وہ پٹھان دکھائی دیتے ہیں۔ گفتار و کردار میں وہ کسی سیّد یا شیخ سے کم نہیں۔ بسا اوقات تو وہ ان سے بھی آگے نکل جاتے ہیں!

قیصر صاحب لکیر کے فقیر نہیں (صرف طبیعت سے فقیر ہیں) لباس کے سوا ان کے ہاں قدامت پسندی دور دور تک نظر نہیں آتی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تلامذہ میں ہر نظریۂ فکر کے ادیب و شاعر مل جائیں گے۔ وہ شاعری میں ہر صنفِ سخن کا بڑی فراخ دلی سے خیر مقدم کرتے ہیں اور ہر صنف کے فنی تقاضوں کے عین مطابق اصلاح بھی دیا کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

حمد و نعت سے منقبت تک' غزل سے نظم تک' ثلاثی اور ماہیا سے ہائیکو تک' قطعات و رباعی سے دوہا تک' کہہ مکرنی سے تکونی تک' قصیدے سے مرثیہ تک' سہرے سے سپاس نامہ تک' ہجو سے ہزل تک' اور گیت سے بھجن تک۔ وہ کسی بھی صنفِ سخن کے معاملے میں متعصب دکھائی نہیں دیتے۔ اسی طرح وہ مذہب کے معاملے میں بھی بے حد وسیع النظر ہیں۔ ان کا یہ شعر ان کی اسی روشن خیالی کا ترجمان ہے :

میرا مذہب عشق کا مذہب' جس میں کوئی تفریق نہیں
میرے حلقے میں آتے ہیں تلسی بھی اور جامی بھی

قیصر صاحب کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے کلام پر صرف اصلاح دیا کرتے ہیں' فنِ شاعری کسی کو نہیں سکھاتے۔ جو حضرات ایسا سمجھتے ہیں' انھیں کیا کہا جائے۔ سوائے اس کے کہ ان کی عقل گھاس چرنے گئی ہے یا پھر وہ عقل کے مارے ہیں۔ وہ دونوں صورتوں میں عقل کے ناخن لیں۔ کیوں کہ قیصر شمیم فن کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی کا نام ہے۔ کسی یونیورسٹی میں بغدادی قاعدہ تو پڑھایا نہیں جاتا! یہاں تو پہلے سے بہت کچھ سیکھ کر آنے کی شرط ہوتی ہے۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ کبھی کبھی یہاں توتلی زبان والوں کو بھی آسانی سے داخلہ مل جاتا ہے۔ اور وہ بھی جلد ہی فر فر بولنے لگتے ہیں۔ البتہ یہ بھی ہے کہ جو کند ذہن اور کاہل ہوتے ہیں' وہ برسوں زبان و فن کے ابتدائی درجوں ہی میں رکے رہتے ہیں' جب کہ اس یونیورسٹی کے ذہین اور محنتی تیزی کے ساتھ زینہ بہ زینہ بڑھتے جاتے ہیں اور نمایاں کامیابی کے ساتھ شہرت و ناموری خود ان کے قدم چومتی ہے۔

غالبؔ کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا۔ لیکن قیصر صاحب کو شاگردوں کے انتخاب نے! کیوں کہ وہ نا اہل اور نالائق شاگردوں کو بھی غزل میں بھرتی کے شعر کی طرح قبول کر لیتے ہیں۔ وہ شاگردوں کو گھڑے کی طرح ٹھوک بجا کر نہیں پرکھا کرتے۔ ان کی اسی فراخ دلی کے باعث انھیں موقع بے موقع شاگردوں کی ذات سے تکلیف پہنچتی رہتی ہے۔ اس کے باوجود وہ کسی سے ناراض ہوتے ہیں اور نہ برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ قیصر صاحب کا یہ شعر ان کے اسی کرب کو نمایاں کرتا ہے :

خفا ہوئے بھی کسی سے تو کیا ہم نے
بہت ہوا تو رہا دل کا قہر آنکھوں میں

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب تک ان کے شاگرد ادبی اعتبار سے عہدِ شباب کو نہیں پہنچتے' وہ ان کی جوتیاں سیدھی کرنے میں ایک دوسرے کو مات دینے کوشش کرتے رہتے ہیں اور کچھ تو عقیدتاً ان کی جوتیاں اپنے سر پہ اٹھانے کے لیے بھی ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ان کی شہرت پھیلنے لگتی ہے' اور وہ صاحبِ کتاب

www.taemeernews.com

ہونے لگتے ہیں تو کتاب میں موصوف کے لیے اظہار تشکر تو در کنار ان کا تذکرہ تک کرنا کسر شان تصور کرتے ہیں!
قیصر صاحب کا یہ شعر یقیناً اسی سانحے کا غماز ہے :

جواں ہوئے جو اجالے ہمیں کو بھول گئے
لہو چراغوں میں کیوں ہم نے رات بھر ڈالا

قیصر صاحب کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اس فہرست میں لڑکے بھی ہیں اور لڑکیاں بھی' بے پردہ بھی اور پردہ نشیں بھی' پردہ نشینوں میں خواتین بھی اور حضرات بھی! پردہ نشیں حضرات کو وقت بے پردہ کرے گا۔ ابھی وہ پردہ نشین ہی رہیں!!!

قیصر صاحب اوروں کی طرح نہ صرف بڑی ہستیوں کی آمد پر احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ وہ اپنے نابالغ شاگردوں کے استقبال کے لیے بھی ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ کچھ تو شاگرد فرماں بردار ہوا کرتے ہیں اور کچھ اساتذہ کرام! قیصر صاحب کا شمار فرماں بردار اساتذہ کرام کے زمرے میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ شاگردوں کے لیے پان وان لانے میں بھی قطعی تکلف نہیں کرتے بلکہ خوش ہوا کرتے ہیں۔

قیصر صاحب مسکرانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ خوشی ہو کہ غم' ہر حال میں ان کے چہرے پر تبسم کا فطری غازہ چڑھا رہتا ہے۔ اتنا دبیز غازہ کہ اس کا رنگ نہ تو ہم عصروں کے طنز سے پھیکا پڑتا ہے نہ حریفوں کی تمرہ بازی سے اور نہ احسان فراموش شاگردوں کی بے وفائی سے! ایسا جان پڑتا ہے کہ انھوں نے مسکراہٹ کو اپنی ڈھال بنا لیا ہے۔ ان کی دلآویز مسکراہٹ کی وجہ سے اکثر لوگوں کو ان پر نثار ہوتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے اور گھائل ہوتے ہوئے بھی!

دنیا میں اگر قیصر صاحب کا کوئی سب سے بڑا دشمن ہے تو وہ خود قیصر صاحب ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے آپ کو بے نیازی کے عالی شان زنداں میں محصور کر رکھا ہے۔ برے سے برے حالات یا زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل کی تیز سے تیز آندھی بھی اس کی بنیاد کو ہلانے کی جرأت نہ کر سکی۔ یہ الگ بات کہ ان کے ایوانِ امید کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ان کے ہر سنہرے خواب کا شیرازہ بکھر گیا۔ لیکن انھوں نے اس زنداں سے باہر نکلنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نہ ہی اپنی پروقار جبیں پر شکن تک پڑنے دی! قیصر صاحب کا یہ شعر ان کی خودداری کا آئینہ دار ہے :

چلوں زمانے کے ہمراہ کس طرح قیصر
ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ

www.taemeernews.com

شریف ایسے کہ وہ بلا امتیاز عمر بچیوں سے لے کر بچیوں کی ماؤں تک کو بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ حالاں کہ ہوسکتا ہے کچھ خود پسند خواتین کو ان کا بیٹی کہہ کر مخاطب کرنا گوارا بھی گزرے

قیصر صاحب اکثر مشاعرے میں شرکت کرنے سے کتراتے ہیں۔ دعوتِ صدارت کو تو وہ اپنی ٹھوکروں میں رکھتے ہیں۔ جب کہ ایسے بھی صدر دیکھنے میں آئے ہیں جو صدارت کو اپنا پیدائشی حق سمجھ کر ایک ایک دن میں دو دو جگہوں کی صدارت پر غاصبانہ قبضہ کر کے دوسروں کا حق مارتے ہوئے اور شائقین کی آنکھ میں دھول جھونکتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرماتے!

قیصر صاحب کو کرسیِ صدارت کا شوق ہے نہ ہوس! اگر وہ بربنائے تعلق یا مارے باندھے دعوتِ صدارت قبول کر بھی لیتے ہیں تو اوروں کی طرح مسندِ صدارت کی عظمت و اہمیت کو بالائے طاق رکھ کر اس کا مذاق نہیں اڑاتے۔ اس کے وقار کا بھرم رکھتے ہیں۔ اوروں کی طرح صدارتی خطبے میں نہ ربی گفتگو کرتے ہیں نہ بے سروپا بات! نہ موضوع سے کبھی ہٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ صدارتی خطبہ طویل ہو یا مختصر! اس کا پاس رکھتے ہوئے پورا حق ادا کرتے ہیں۔ اس میدان میں وہ یکہ وتنہا ہیں۔ آئندہ پچاس برسوں میں بھی بنگال میں ان کا کوئی ثانی پیدا ہوگا یا نہیں اس میں شک ہے۔

قیصر صاحب نہ صرف اپنے شاگردوں کی اصلاح فرماتے ہیں بلکہ کچھ استاد الشعرا کے مصرعوں سے لے کر ان کی عقل تک درست کر دیا کرتے ہیں۔ میرے اس انکشاف سے ممکن ہے کہ کچھ حضرات میرے ہوش نہ ٹھکانے لگا دیں۔ لیکن مجھے اس بات کی قطعی پرواہ نہیں ہے۔ جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

قیصر صاحب خود تو ڈاکٹر واکٹر نہیں ہیں لیکن ڈاکٹریٹ کا زینہ بعض اوقات انھی کے قدموں سے شروع ہوتا ہے۔ اس زینے پر چڑھ کر کتنوں نے پی ایچ ڈی کی منزل پائی ہے اس کا شمار بہت مشکل ہے۔ موصوف کلکتہ یونیورسٹی میں گیسٹ لیکچرار کی حیثیت سے کلامِ اقبال پڑھانے پر مامور تھے جب کہ اقبال پروفیسر ہونے کی شہرت کسی اور کے حصے میں چلی جاتی تھی!

قیصر صاحب اپنی بیگم سے جتنا نہیں ڈرتے (ڈرے وہ جو ہمیشہ بیگم کے ساتھ رہتا ہو) اتنا ہی وہ اپنے یارِ غار سید منیر نیازی (نیوز ایڈیٹر 'آزاد ہند' کلکتہ) سے ڈرتے ہیں کیوں کہ نیازی صاحب کی آمد کبھی کبھی ایسے وقت پر ہوتی ہے جب قیصر صاحب کوئی اہم کام یا Confidential Work کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے عالم میں ان کو عزیز سے عزیز اور محبوب سے محبوب ترین شخصیت کی بھی موجودگی بھلی نہیں لگتی۔ پھر بھی نیازی صاحب کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے جو ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر دوسری خوبصورت

www.taemeernews.com

عورت کے لبوں پر ہوا کرتی ہے۔ منیر صاحب مسکراہٹ کے تمام رنگوں سے واقفیت رکھنے کے باوجود قیصر صاحب کے ساتھ اپنا وقت گزارنے اور ان کی حالتِ زار سے حظ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔

قیصر صاحب کا ہر شاگرد اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہی استادِ محترم کا چہیتا ہے۔ برسوں میں بھی اسی خوش فہمی کا شکار تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی بھی شاگرد سے کوئی ا_زی سلوک نہیں برتتے بلکہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور سب کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک روا رکھتے ہیں۔

وہ شاگردوں کے کلام پر محض اصلاح ہی نہیں فرماتے۔ بلکہ ان کے دکھ سکھ میں بھی برابر کے شریک رہتے ہیں۔ شاگردوں کی خانگی کشمکش ہو یا معاشی بدحالی' تمام مسائل کو سلجھانے کے لیے پیش پیش رہتے ہیں۔ ایک بار میری بڑی بچی سعدیہ صدف اچانک بیمار پڑ گئی۔ اسے ہسپتال میں داخل کرانے کی نوبت آ گئی۔ قیصر صاحب کو جب اس کی اطلاع ملی تو عیادت کے لیے ہسپتال میں تشریف لا کر پہلے تو انھوں نے حال واحوال پوچھا۔ پھر میری مالی مدد کرنی چاہی۔ حالاں کہ مجھے اس کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ انھوں نے نہ صرف میرے ساتھ ہی ایسا کیا ہوگا بلکہ اوروں کے بھی آڑے وقت کام آتے رہے ہوں گے۔ اس خوش اخلاقی سے یہاں کے خودساختہ عظیم المرتبت شعرا حضرات بالکل عاری ہیں۔ جب کہ اچھے شاعر کے لیے اچھا انسان ہونا بھی شرط ہے!

جس میں انسان کی صفات نہیں
شاعری اس کے بس کی بات نہیں

غــزل

قیصر شمیم

نہ لہروں سے نہ بے لہری سے بچنا — سمندر میں بڑی مچھلی سے بچنا
نظر ہر سمت رکھنا تیرنے میں — نئے موسم کی جل ککھی سے بچنا
اترنا ناؤ سے اپنی' سنبھل کر — کنارے کی ہر اک جھاڑی سے بچنا
نری پر مزہ آئے گا' لیکن — جمی ہو برف تو چوٹی سے بچنا

تمھارے چاہنے والے بہت ہیں
مگر اے دوست' خوش فہمی سے بچنا

www.taemeernews.com

محمود ایوبی
ممبئی

سرتاپادل

سال ڈیڑھ سال تک بڑی تناتنی رہی۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے شیب پور جانے سے منع کر دیا تھا۔ آخر جب اس بار گیا تو ان کی کلفت دور ہوئی۔ اب تو ان کے تصرف میں دو تین کمرے ہیں۔ ورنہ جب ایک ہی کمرہ جس میں زندگی کا سارا انتظام اور کام انجام دیا جاتا تھا تب بھی وہ اپنے گھر لے جائے بغیر چین نہیں لیتے تھے۔ کس کو لے جانا ہے اس کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ نیا پرانا، امیر غریب ہر ملاقاتی کو اپنے یہاں لے جانا ضروری سمجھتے تھے۔ اس کے پیچھے ایک بات تو یہ تھی کہ وہ کسی کمپلیکس میں نہیں رہے ہیں۔ جیسے ہیں جس حال میں ہیں۔ اسی طرح سامنے آتے ہیں۔ دوسرے کو گھر لے جائے بغیر مہمان نوازی اور خاطر داری کو ادھورا سمجھتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ جواباً دوسرے کے گھر بھی جائیں۔ تعلقات گہرے ہو جانے پر اور اس شخص کے حوصلے کو دیکھ کر وہ ہگلی ضلع میں مزدوروں کی بستی انکس لے جانے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

ساٹھ کے دہے میں شہزاد منظر مرحوم نے تعارف کرایا۔ شہزاد کی ایک انوکھی ادا یہ تھی کہ تعارف کرانے سے پہلے اور بعد میں لگاتار ہنستے رہتے تھے جیسے کوئی مزاحیہ حرکت کر رہے ہوں۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ یہ قیصر شمیم ہیں۔ پہلے عمید انکسی کے نام سے شاعری کرتے تھے تو مجھے لگا کہ واقعی مذاق کا کوئی پہلو ہے۔ نہیں وہ دوستوں کو ملوا کر بے حد خوش ہو کر ہنسا کرتے تھے۔ چند ملاقاتوں کے بعد مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ واقعی انھوں نے شریف انسان اور عمدہ دوست سے ملوانے کا خوشگوار فریضہ انجام دیا ہے۔ قیصر شمیم صاحب کے مزاج و افتاد بلکہ کشادہ دلی کو دیکھ کر کچھ دنوں بعد ایسا لگا تھا کہ میں غلط فہمی کا شکار ہوں۔ وہ ہر شخص سے اسی خلوص اور اپنائیت سے ملتے ہیں۔ کچھ بے تکلفی کے بعد میں نے ان کے سامنے بھی اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا تو وہ بہت ملول ہوئے تھے۔ ہونا بھی چاہیے کہ وہ ایک کشادہ دل آدمی ہیں اور ہر شخص کے لیے ان کے دل میں جگہ ہے۔ صرف جگہ نہیں بلکہ ہر شخص کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ شخص کوئی پرانا شناسا ہو۔ نئے سے نئے آدمی کے ساتھ بھی ویسا ہی پُرخلوص سلوک کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

ان سے جب ملاقات ہوئی تھی تو میں جوان تھا ہی خیر سے ان کی بھی انتی جوانی تھی۔ مگر مجھ سے اکثر پوچھا کرتے تھے کہ" میں ان سے عمر میں بڑا ہوں" عمر کے معاملہ میں ان کی خوش فہمی کو میں زائل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ خاص کر ان کی سلیقہ مندیوں اور نفاستوں کو دیکھ کر چپ ہی رہنا پڑتا تھا۔ حالاں کہ حساب کتاب سے پتہ چلا کہ میں ان سے ایک ماہ سینئر ہوں۔ وہ جب کبھی ہمارے مردانہ ڈیرے پر آتے تھے تو اکیلے نہیں کئی دوستوں کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ اصل میں وہ تنہائی پسند نہیں بلکہ اجتماعیت اور حلقہ کے قائل ہیں۔ خیر تو آتے ہی وہ بکھری ہوئی چیزوں، لٹکے ہوئے بستر کو درست کرنے میں لگ جاتے تھے۔ ایسا وہ اس لیے کرتے تھے کہ ان کے مزاج میں نفاست، تناسب اور ادراک حسن ہے۔

ان کی انجمن ساز طبیعت ہی کا نتیجہ ہے کہ ہوڑہ میں رائٹرز ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی' ادبی سوسائٹی انکس کے سکریٹری رہے' ادبی سوسائٹی ہائی مدرسہ کے رکن اساسی' اتحاد الطلبا مسلمین لائبریری کے رکن ہونے کے ساتھ ساتھ ڈیموکریٹک فورم فار نیشنل انٹیگریشن، انجمن ترقی پسند مصنفین اور بزم احباب کے رکن بھی رہے ہیں۔ ان میں سفید پوش لوگوں کی انجمنیں بھی ہیں مگر ان کا اصل تعلق انکس اور شیب پور کے عوامی اداروں سے رہا ہے۔ سفید پوش حضرات کی انجمن میں انھیں' ان کی قابل لحاظ شاعری اور ادبی خدمات کی بدولت شریک کیا گیا اور یہاں انھیں درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے ظاہر پرست اور نام نہاد اقدار کے علمبرداروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اپنے اس گہرے مشاہدے اور تجربہ کو انھوں نے اس طرح پیش کیا :

سازشیں اپنوں کی یاد آئیں گی — کیا کہوں کس کو پرایا دیکھا
مرے خلاف ہی دیتے ہیں مشورے مجھ کو — خلوص رکھتے ہیں میرے مشیر میرے ساتھ
تمھارے چاہنے والے بہت ہیں — مگر اے دوست خوش فہمی سے بچنا
کوئی گلہ تو نہیں پھر بھی گردشِ دوراں — کسی کا آنکھ بدلنا ہمیں کو ہے معلوم

سب کچھ جان بوجھ کر بھی قیصر شمیم اپنی خو نہیں بدلتے۔ وہ دوستی اور ہمدردی کا فرض ادا کرنے سے نہیں چوکتے۔ ان کے حسنِ سلوک کو سیانے لوگ ان کی سادہ لوحی ہی نہیں بلکہ مذاق مذاق میں" حماقت" سے بھی تعبیر کرتے ہیں مگر وہ بقول خود سے :

قیصر یہی اک چیز تو گھٹی میں پڑی ہے — ہوتے نہیں کبھی آمادہ ترک وفا پر

ہاں ان کے دل سے قریب وہی لوگ ہیں جو انھیں پیدائش کے بعد انکس میں ملے یا ہوش گوش سنبھالنے کے بعد شیب پور جیسی مزدور بستیوں میں شریک کار رہے۔ انکس میں اب تو خیر کچھ پختہ کوارٹرز مین پر بن

www.taemeernews.com

گئے ہیں ورنہ جوٹ مل کے مزدوروں کے لیے کارخانہ کے اطراف میں جو باڑے بنائے گئے تھے اور جن میں فاقہ مست اور محنت کش لوگ زندگی بسر کرتے تھے' قیصر شمیم کی زندگی وہیں سے شروع ہوئی مگر وہ وہیں نہیں رکے بلکہ آگے بڑھتے رہے۔ اسکول اور کالج تک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پھر چکی کی مشقت میں لگ گئے۔ انھوں نے صرف اپنے ذہن اور زندگی کو جلا نہیں بخشی بلکہ اپنے جیسے بہت سارے لوگوں کا کارواں بنا کر آگے بڑھے۔ اس طرح انھوں نے جو زندگی بسر کی اس کی جھلک ان کی شاعری میں ملتی ہے۔

زندگی یوں ہی سحر و شام کرتے گزری احترامِ غم ایام ہی کرتے گزری

جھیلنے والا سمجھتا ہوگا زندگی کیا ہے ان دنوں قیصر

شہرِ الم سے شہرِ طرب تک ایک قدم کی دوری ہے

پھر بھی یہ دوری طے نہیں ہوتی ' ہائے یہ کیا مجبوری ہے

زندگی کی کربناکیوں، ناانصافیوں اور مشکلات کا جو ذکر ان کی شاعری میں ملتا ہے وہ کسی ایک فرد کی المناکیوں کا ماجرا نہیں بلکہ پورے سماج اور وسیع تر انسانیت کی شکست و ریخت کی کہانی پیش کرتا ہے۔ اس کٹھور زندگی کو انھوں نے خود بھی جھیلا ہے اور اپنے بے شمار ہم نشینوں کو بھی جھیلتے دیکھا ہے اور ان مظلوموں کو زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا ہے :

گندی بستی کا رہنے والا تھا ایک خوشبو کا بانٹنے والا

خوشبو بانٹنے والا انھیں ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ طیب احمد خاں (سبکدوش آئی جی) نے ایک واقعہ بہت تشویش کے ساتھ سنایا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ یہ دونوں جس بس سے اترے تھے۔ اس بس پر کسی مسافر کی بس کے غلوں سے کھٹ پٹ ہوگئی تھی۔ وہ لوگ اسے لیے ہوئے اپنے جھنڈ میں چلے گئے تھے اور وہاں اسے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ یہ نقشہ دیکھ کر قیصر شمیم صاحب تڑپ اٹھے تھے اور پٹنے والے مسافر کو بچانے کے لیے آگے بڑھنے لگے تھے تب خاں صاحب نے انھیں روکا تھا کہ وہ انھیں بھی پٹنے والے مسافر کا ساتھی سمجھ کر ان کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کریں گے۔ مگر شمیم صاحب ان مصلحتوں کو کہاں جانتے کہ :

کون دیتا ہے صدا کیا دیکھنا آشنا نا آشنا کیا دیکھنا

اسی اندازِ فکر کا کرشمہ ہے کہ ان کے شاگردوں کی ایک فوج ہے۔ بہتر سماج کی تشکیل کے لیے وہ فرد کی اصلاح کو بھی ضروری سمجھتے ہیں اور اسی خلوص اور تندہی سے شاگردوں کے فکر و ذہن کو سنوارتے اور نکھارتے ہیں کہ شاگرد ان کا جاں نثار بن جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ شاگرد ہی ان کا گرویدہ ہو۔ ایک زمانہ میں جب ہم لوگ

www.taemeernews.com

صرف نثری نشست کرتے تھے تو ایک بار پوری ٹیم کو کربتی بلایا گیا۔ وہاں شمیم صاحب نے بھی ایک افسانہ سنایا تھا۔ افسانہ کی کردار ایک عجیب وغریب بڑھیا تھی جس کے بارے میں شمیم صاحب '' بے سر پیر کی بڑھیا '' لکھا تھا۔ ایک صاحب نے جو اس اصطلاح سے واقف نہیں تھے۔'' کچھ تنقید کی تو شمس التوحید نام کے ایک صاحب بپھر اٹھے کہ'' شمیم صاحب پر اعتراض کرنے کی ہمت کیسے ہوئی۔''

باوجودیکہ توحید صاحب نے شمیم صاحب سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا تھا مگر شمیم صاحب کو ان کا بپھرنا پسند نہیں آیا تھا۔ شمیم صاحب کے جاننے والوں اور ہمدردوں کی تعداد بے انتہا ہے لیکن بے تکلفی اور ہنسی مذاق کا رشتہ کسی سے بھی نہیں۔ بہت دنوں بعد جب نوجوانوں کی ایک ٹولی ملی جس نے شمیم صاحب سے بے۔اے۔ کرنے کا مطالبہ کیا تو یہ سب گرچہ عمر میں ان سے چھوٹے تھے مگر ہم جماعت ہونے پر کوئی بھی حد ادب سے گزرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ سوائے سعید الزماں کے مگر ان کا رویہ بھی کچھ گستاخانہ نہیں بلکہ خوش دلانہ ہوا کرتا تھا جس پر شمیم صاحب زیر لب مسکرا کر رہ جاتے تھے یا بہت ہوا تو انھیں '' بھکوا '' کہہ کر اپنی ناگواری یا غصہ کا اظہار کرتے تھے۔ ان ایک صاحب نے جنھیں شاید قیصر شمیم کی شاگردی کا شرف حاصل ہے'' چیلے کے چینی'' بننے کا ثبوت دینے کے لیے ادب کو کبڈی کا میدان بنانے کی جدت دکھائی تو ظہیر انور نے تو ان کی گوشمالی کی مگر قیصر شمیم صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ بھکوا بھی نہیں کیوں کہ :

مری زباں پہ نہ آیا ضرورتاً بھی کبھی　　　وہ لفظ جو مرے یاروں کی بول چال میں تھا

یا

اس کا ہنسنا رونے سے تو بہتر ہے　　　وہ مجھ پر ہنستا ہے بابا تیرا کیا

یہ تو خیر معمولی بات تھی' زندگی کے کارزار میں بڑے بڑے معرکوں سے نبرد آزما ہونے پر بھی قیصر شمیم نہ کبھی تھکے اور نہ ہار مانی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے پر انھوں نے رجائی فلسفہ اور انداز کو اپنی زندگی کا جزو تو بنایا مگر بہت سے ترقی پسندوں کی طرح اپنی دنیا سنوارنے کا روگ نہیں پالا ہے :

ہاتھ اٹھاتا ہوں تو یہ سوچ کے رک جاتا ہوں　　　کچھ بھی ہو دستِ دعا کاسہ نما ہوتا ہے

بس ترقی پسندی کے صحت مند رویہ کو اپناتے ہوئے زندگی کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرے اور مایوسی اور قنوطیت کو اپنے پاس بھٹکنے نہ دیا اور نہ اپنی شاعری میں منفی رجحان کو داخل ہونے دیا۔ حوصلہ مندی کے نعرے نہیں لگائے لیکن سخت معاملہ کو لطیف پیرائے میں پیش کیا :

ناؤ ٹوٹی ہے تو تختہ لے لے　　　راہ میں پھر کوئی دریا ہوگا

www.taemeernews.com

خواہشوں کے بھنور میں ہمیشہ کشتیاں ڈوبتی ہی رہی ہیں
میں بھی گرداب میں ہوں مگر میں خود کو غرقاب ہونے نہ دوں گا

اپنی زندگی کے سارے دکھ درد کو جھیلنے والے قیصر شمیم اپنے دوستوں اور واقف کاروں کے غم کا مداوا ڈھونڈنے میں پیچھے نہیں رہتے۔ جس طرح بھی ہو مریض کی عیادت اور معالجہ اور مالی تنگی کا ازالہ کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ خود مجھے ایک بار کسی پریشانی میں دیکھ کر کالج اسکوائر میں ٹہل ٹہل کر میری دلجوئی کرتے رہے۔ صرف دلجوئی نہیں بلکہ میری پریشانیوں کو دور کرنے کی ترکیبیں ڈھونڈنے لگے تو میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں کیا جانتا نہیں کہ یہ آپ کے بس کی بات نہیں پھر آپ کیوں پریشان ہورہے ہیں؟" جب کہ وہ خود اپنا مسئلہ حل نہیں کر سکتے کیوں کہ :

چلوں زمانے کے ہمراہ کس طرح قیصر　　　ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ

یہ سب جانتے ہیں کہ "درد و غم کو جمع کر کے انھوں نے زندگی، زمانہ اور دل کی جو کہانی اشعار میں پیش کی ہے اسے سرکاری یا غیر سرکاری مدد سے مجموعہ کی شکل میں پیش کرنا گوارہ نہیں کیا۔ لیکن اپنے ایک پرانے دوست شمس صابری کے گزر جانے پر ان کے چند افسانوں کو اکٹھا کر کے "دھند اور کرن" کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کیا اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار اس طرح کیا کہ اس کتاب کی فروخت کے بعد جو آمدنی ہوگی وہ مصنف کی بیوہ کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔

ان کے اسی بے لوث اور بے ریا طرز عمل کو دیکھتے ہوئے احسن مفتاحی صاحب کو ان کے نمازی اور عازم حج ہونے کا خیال آیا ہے۔ اور کسی نے پہاڑ کاٹتے ہاتھ میں ثنا، سجدہ اور غار حرا سے پوچھو جیسی نظموں پر سوالیہ نشان کھڑا کیا ہے۔ ترقی پسند ہونے کے ناتے شمیم صاحب کا کچھ نہ کچھ واسطہ مارکسزم سے بھی رہا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ غلط العوام کے طور پر یہ تصور عام ہے کہ مارکسزم سے رابطہ رکھنے کا مطلب ہوتا ہے مذہب اور اس کی روحانی خوبیوں سے بے بہرہ ہو جانا۔ وہ ایک بعید قسم کے مارکسسٹوں نے عمر بھر اس نعرہ کا دام ہی نہیں عیش و آرام بھی حاصل کیا مگر آخری وقت میں مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کرنا ضروری سمجھا اور وہ بھی غیر معتبر گواہوں کی موجودگی میں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ صحیح مارکسسٹ درویش اور قلندر ہوتا ہے اور اس کی زندہ مثال قیصر شمیم ہیں۔ کسی اعلان کے بغیر اگر انھوں نے اپنی قلبی کیفیت کو ثنا اور سجدہ کے عنوان سے پیش کیا ہے تو کیا ہوا۔ رہی بات غار حرا سے پوچھو تو صوفی مزاج اور حقیقی فنکار حرا کی طرف خاص کشش محسوس کرتا ہے۔ مجروح سلطان پوری رسوم و قیود کے پابند نہیں ہونے کے باوجود دل سے مومن تھے۔ ایک بار مشاعرہ پڑھنے وہ سعودی عرب گئے تو وہاں سے

www.taemeernews.com

آ کر انھوں نے اپنے ایک دو خاص تجربات کا بطور خاص مجھ سے ذکر کیا۔ ایک تو یہ کہ وہ مسجد نبوی میں عشاء کی نماز ادا کر کے وہیں بیٹھ گئے اور گنبد خضریٰ کی طرف دیکھنا شروع کیا تو دیکھتے ہی رہے۔ وقت گزرنے کا قطعی احساس نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ایک صاحب نے انھیں مخاطب کر کے پوچھا "یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ آیئے صبح کی نماز پڑھیں۔" وہ فنکار جو جینوئن ہو اور جس کا قلب مومن ہو اس کے یہاں یہ انہماک قطعی فطری ہوتا ہے۔ مجروح صاحب کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ وہ غارِ حرا نہیں جا سکے۔ کیوں کہ ان دنوں وہاں کچھ تعمیر و مرمت کا کام چل رہا تھا۔ قیصر شمیم صاحب کے اسی انہماک کو دیکھ کر ہی تو ان کے الحاج ہونے کی پیشین گوئی کی جا رہی ہے۔

اس سلسلہ میں ان کے جو جذبات یا ارادے ہوں اس سے قطع نظر یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ وہ اپنی تمناؤں کا اظہار نہیں کر سکتے۔ وہ ایک لحاظ سے پیدائشی شاعر ہیں مگر اپنے طور طریقہ سے کہیں سے شاعر نظر نہیں آتے۔ موقع بے موقع شعر سنانا تو دور مشاعروں میں مشکل سے شریک ہوتے ہیں۔ اب جب کہ وہ "سبک دوشی" کی زندگی گزار رہے ہیں ذرا ڈھیلے ہو جائیں تو مشاعرہ پڑھنے سے انھیں فرصت نہ ملے اور یہ آمدنی کا ایک اچھا ذریعہ بن جائے کیوں کہ ہر جگہ ان کے شاگرد یا شاگردائیں فیصلہ کن پوزیشن میں ہیں مگر وہ اپنا مزاج اور مطمحِ نظر کیوں بدلنے لگے۔ اس کا یقین ہے اس لیے کچھ دنوں پہلے ایک خبر ملی کہ "دلّی میں ان کو پذیرائی کے لیے بلایا گیا ہے تو سخت حیرت ہوئی۔ لیکن یہ حیرت اس وقت ختم ہو گئی جب یہ پتہ چلا کہ دلّی کے جو "ایوارڈ شارک" (Award Shark) ہیں انھوں نے یہ جان کر کہ قیصر شمیم صاحب مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین ہیں اور اس اکیڈمی کی طرف سے کئی اہم ایوارڈز دیے جاتے ہیں۔ ان پر ڈورے ڈالنے کی اپنی جیسی کوشش کی مگر شمیم صاحب کو اس پذیرائی کی محفل میں گھٹن محسوس ہونے لگی تو دام اندازوں کو مایوسی۔ یہ کہنے کے بعد یہ ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں شمیم صاحب کو کسی کی دل آزاری کا خیال نہ ستانے لگے۔ اپنے لیے وہ کچھ بھی قربان کر سکتے ہیں مگر دوسروں کے لیے خواہ وہ کتنا ہی دوسرا کیوں نہ ہو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ محمد امین اور ہاشم عبدالحلیم کے ہاتھوں ان کی طویل اور مخلصانہ کوششوں کے اعتراف میں جو اعزاز دیا گیا ہے اسی کو قبول کرنے کے لیے احباب اور بہی خواہوں کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔ مگر دوسرے کے لیے خود پاپڑ بیلنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی سادہ لوحی ہے کہ سامنے والے کی "فطرت اور نیت" کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ بہت دنوں پہلے ایک صاحب نے اپنی چالاکی کا جال اس طرح پھیلا دیا تھا کہ کیرل کے ادیبوں کے طرز پر کلکتہ کے ادیبوں اور شاعروں کی بھی کوآپریٹو بنانے کا شوشہ چھوڑا تھا۔ سارے شرکا ان صاحب کی اصلیت کو سمجھتے ہوئے "کیوں اور کیسے" کا سوال اٹھا رہے تھے سوائے قیصر شمیم صاحب کے کیوں کہ انھوں نے تو بہت جذباتی انداز سے یہ سوال اٹھایا تھا کہ "کوآپریٹو بنانے کی تجویز پر ہم

www.taemeernews.com

لوگ "" کوآپریشن" اور باہمی تعاون کے تصور کو کیوں نظر انداز کر رہے ہیں۔

میں تو خیر ایک سے ایک " گُنی اور گیانی" حضرات موجود ہیں۔ ان میں سے بعض نے جانے کس طرح یہ خیال بنا لیا ہے کہ قیصر شمیم صاحب جدیدیت کی پیروکاری کر رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں جدید ہونا اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔ ممکن ہے شمیم صاحب کو خوش کرنے کے لیے ان کی شاعری اور شخصیت میں یہ وصف ڈھونڈا گیا ہو۔ حالاں کہ یہ ان پر ایک الزام ہے۔ جو شخص عمر بھر زندگی کی مثبت قدروں کا علم بردار رہا ہوں اور جو غمِ ذات کو غمِ کائنات بنائے اور شخصی کو اجتماعی دکھ سمجھ کر یہ کہے کہ ــــ

آنکھوں میں کسی کی بھی اب نیند نہیں آتی ۔۔۔ یہ کون سی لوری ہے گہوارے لرزتے ہیں

اس کے ساتھ ہی یہ حوصلہ بھی دکھائے کہ ــــ

آنے والے کل کی آنکھیں تجھ کو بننا ہے تو پھر ۔۔۔ جو اندھیرا دے کے رخصت ہو گیا وہ کل نہ بن

وہ تنہائی، ذات کے کرب، زندگی کی لایعنیت اور بے یقینی کا دکھڑا کس طرح روئے گا۔ اپنی نظم " تنہائی" میں انھوں نے زندگی کے تئیں اپنے رویہ اور فلسفہ کو بڑے واضح طریقہ سے پیش کیا ہے :

رشک آتا ہے مجھے ان دوستوں پر
بھیڑ میں رہتے ہوئے جو بھیڑ کا حصہ کبھی بنتے نہیں ہیں
اور اپنے جذبۂ بے گانگی کو خوبصورت نام تنہائی کا دے کر
اک طلسماتی فضا میں اس طرح اب جی رہے ہیں
جیسے یکتائی کا درجہ ان کی تنہائی نے ان کو دے دیا ہو
کیا غضب کی یہ انا ہے
رحم آتا ہے مجھے ان دوستوں پر
بے حسی کی کوکھ سے جنمی ہوئی خوش فہمیاں اب
آگے آگے چل رہی ہیں
اور میرے دوست ان کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں

کسی سائے کے بغیر دہکتی آگ پر چلتے رہنے اور گراں بار زندگی جینے کے باوجود اسے بوجھ سمجھ کر سر سے نہیں ٹالنے کا دم خم رکھنے والے قیصر شمیم کی شاعری میں جدیدیت یا مابعد جدیدیت کی ٹوہ لینا کارِ فضول ہے۔ انھوں نے نئی راہ کی تلاش ضرور کی ہے مگر اندھیری گپھاؤں کی طرف پیش رفت نہیں کی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر محمد حسن

www.taemeernews.com

کا یہ کہنا برحق ہے کہ "ان کی شاعری جدید ترقی پسندی کی آئینہ دار ہے۔"

۱۹۳۶ء میں پیدا ہونے کے بعد اپنے لیے اور جگ کے لیے درد، آنسو اور مسکان کی حکایت رقم کرنے والے شخص کے یہاں اضمحلال اور آمدنی کے سارے راستے مسدود ہو جانے پر حرکت و عمل میں نمی کا آنا بالکل فطری ہے۔ مگر سعید الزماں کو جو سراپا مہمان نواز ہیں اس بات کی شکایت رہی کہ کلکتہ میں ہمارے رہنے پر بھی وہ بار بار کیوں نہیں آتے؟ اس کا جواب ہمارے پاس اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ خود کو اسی طبعی اور معاشی حالات میں جس سے قیصر شمیم گزر رہے ہیں اور اس احساس کے تحت میری آنکھیں نم ہو جائیں۔

قیصر شمیم صاحب تو جب یہ خبر ہوئی کہ "مری صداؤں کی پلکیں بھی بھیگ جاتی ہیں" تو زحمتوں اور دشواریوں کی پروا کیے بغیر اپنی آمد و رفت کا تواتر بڑھا دیا۔ پرانے قیصر شمیم صاحب سے ملنے کی تو خوشی ہوئی مگر ان کو جس طرح اپنی جان پر کھیلنا پڑ رہا تھا اسے دیکھتے ہوئے مجھے یہ کہنا پڑا کہ "شمیم صاحب ہمیشہ کی طرح آج بھی آپ 'سراپا دل' بنے ہوئے ہیں" یہ سن کر سعید الزماں کی رگِ شرارت پھڑکی تو انھوں نے یہ جملہ جڑا کہ "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ سراپا دل ہیں، دماغ ان کے یہاں بالکل نہیں ہے۔" انھوں نے یہ جملہ جو سننے کے لیے کہا تھا اس کے لیے میں بھی ہمہ تن گوش بن گیا مگر ہم دونوں کو مایوسی ہی ہاتھ آئی کیوں کہ شمیم صاحب نے پہلے کی طرح سعید کو "بھکوا" نہیں کہا بس معصوم سی مقناطیسی مسکراہٹ بکھیر کر رہ گئے۔

قیصر شمیم کی غیر مطبوعہ غزل

ہم نے جو راہ منتخب کی ہے
یاد رکھنا 'بڑے غضب کی ہے

جان کی اپنی' فکر کب کی ہے
ہم نے کس سے اماں طلب کی ہے

جانتے ہیں سب تباہی کا
کب ہمیں جستجو سبب کی ہے

عاشقوں کی شناخت ہے کچھ اور
نسل کی ہے نہ وہ نسب کی ہے

بے ادب کیوں وہاں رہے کوئی
شرطِ اول جہاں ادب کی ہے

جس طرف اٹھ گئی' اٹھی ہی رہی
یہ نظر ایک جاں بلب کی ہے

اک سہارا اسی کا ہے قیصر
یاد جو دل میں اپنے رب کی ہے

www.taemeernews.com

اشہر ہاشمی
دہلی

خشک پتوں کے ڈھیر کی چرمراہٹ

خشک زرد پتوں کے ڈھیر پر انسانی قدموں کے دباؤ سے اٹھنے والی چرمراہٹ میں ایسا رومان ہے جو خزاں کے موسم میں بھی طبیعت کے اندر ایک فرحت بخش احساس پیدا کرتی ہے۔ قیصر شمیم کی شاعری میں یہ فرحت بخش احساس جابجا موجود ہے۔ غزلیں نظمیں سب ایک خاص طرز فکر، ایک مخصوص برتاؤ کے دھاگے میں بندھی ہوئی ہیں۔ ان کا یہ شعر ان کو سمجھنے میں بہت معاون ہوسکتا ہے :

ہمیں ملا تھا جو اک ڈھیر خشک پتوں کا　　وہی تھا تکیہ ہمارا　وہی بچھونا تھا

خشک پتوں کا ڈھیر قیصر شمیم کی شاعر اور شخصیت میں جابجا موجود ہے۔ پامالی کے حوالے سے نہیں' شگفتگی کے حوالے سے نہیں۔

چرمراہٹ کے حوالے سے

ایک غنائیت، ایک موسیقیت، ایک لے، ایک لحن کے حوالے سے

مصرعوں میں لفظ اس طرح بیٹھتے ہیں جیسے انگلی میں انگوٹھی' لفظوں میں معنی اس طرح فٹ ہوتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ، یہ برسوں کے ریاض کا نتیجہ ہے۔ نظموں میں ہر جگہ ایک آہنگ۔ ساز پر گائے جانے کی اہل نظمیں جو کہ پابند بالکل ہی نہیں آزاد ہیں۔ مگر آزاد نظموں کے انتشار سے دور ایک انتظام اور انصرام کے گھیرے میں۔ اسی طرح ان کی شخصیت میں ایک ترتیب ہے۔ وقت کی پابندی، کام میں خوش سلیقگی، برتاؤ میں شائستگی، طور طریقوں میں خوش کن عمدگی۔

غیرت وحمیت قیصر شمیم کی شخصیت کے سب سے نمایاں اوصاف ہیں۔ فیاضی اور فراخ دلی بھی کم نمایاں نہیں۔ قیصر شمیم کو شاید کسی نے بھی غصہ سے بے قابو ہوتے نہیں دیکھا۔ غصہ ایک فطری انسانی ردعمل ہے۔ غصہ کا اظہار ایک مقدس فریضہ ہے مگر غصہ کے اظہار میں جو شائستگی کو متبرک بناتی ہے' اس شائستگی سے قیصر شمیم کی شاعری اور شخصیت دونوں مالا مال ہیں۔

www.taemeernews.com

خفا ہوئے بھی کسی سے تو کیا کیا ہم نے   بہت ہوا تو رہا دل کا قہر آنکھوں میں

آنکھوں میں دل کا قہر لیے جینا غصے کی تہذیب اور احتجاج کی ترتیب کا ایسا مستحسن طریقہ کار ہے جو شاعری کو نعرہ بننے اور شاعر کو شہدہ بننے سے بچالیتا ہے۔ قیصر شمیم بطور شخص اور شاعر اس سے بچے ہوئے ہیں گوکہ ان کے ارد گرد بکھری ہوئی زندگی میں جتنے مواقع یاس کے ہیں اتنے ہی اشتعال کے بھی ہیں، رجائیت اور قنوطیت دونوں کا تصادم جس بری طرح مغربی بنگال، خاص کر اس کی اردو بستیوں اور ان میں بھی کلکتہ اور اس کے نواح کے اضلاع ہ اور شمالی وجنوبی چوبیس پرگنہ کی بستیوں میں ہے، شاید کہیں اور نہیں ہوں کہ یہ بستیاں خوابوں کی کاشت بھی کرتی ہیں اور ان پر ریت کی برسات بھی کرتی ہیں۔ قیصر شمیم ایک جٹ مل مزدور کے بیٹے ہونے کے ناطے اس سچائی کو بہت پہلے جان چکے تھے کہ ان بستیوں میں علم کا اجالا پھیلنا ضروری ہے۔ ۵۰ رسال سے وہ درس و تدریس کے شعبے میں اپنی وابستگی کے ذریعہ علم کا اُجالا پھیلا رہے ہیں۔ ادب سے وابستگی ایک خاص نظریہ حیات سے وابستگی کے اظہار کا سب سے اہم وسیلہ تھا۔ سو وہ شاعر بن گئے۔ محمد عبد القیوم خان کے عبید انکسی سے قیصر شمیم تک کا سفر چند برسوں میں طے پا گیا۔

بحیثیت استاد وہ ہوڑہ مسلم ہائی اسکول اور سی۔ ایم۔ او ہائی اسکول سے خضر پور کالج اور کلکتہ یونیورسٹی تک اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مغربی بنگال اردو اکیڈمی سمیت محکمہ تعلیم کے مختلف شعبوں میں جو نمایاں کارنامے انجام دے رہے ہیں اُن سے دوسروں کو غافل رکھنے کا راز مجھ سے بعید ہے' مگر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خاموشی اور ... سے کام کرنے کے لیے کام کی نوعیت کو راز میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ آج بھی فعال ہیں' سرگرم ہیں۔ پوری محنت' توجہ اور دیانت داری سے علم کا اجالا پھیلانے میں لگے ہیں اور اپنے اس مشن کو ہر روز کچھ آگے لے جانے کی کوشش میں احباب کی ناراضگی سے بھی دوچار ہوتے ہیں مگر باز نہیں آتے۔

قیصر شمیم کا خاندان تین افراد پر مشتمل ہے۔ خود، اہلیہ نجمہ قیصر اور بیٹا عرفان الحیات۔ لیکن ان کے احباب واعزاز پر مشتمل ان کا Extended خاندان کتنا بڑا ہے' اس کا اندازہ اسی کو ہوسکتا ہے جو ہر اتوار یا ہر چھٹی کے دن ۱۰ ار ہیم گھوش لین والی دہلیز میں صبح سے ہی پہنچ جاتا ہو۔ دہائیوں سے قیصر شمیم کا ایک چھوٹا سا کمرہ شیب پور کے علاوہ پیل خانہ، گھسوری، ٹکیہ پاڑہ اور گرد و نواح کلکتہ، مٹیا برج، ۲۴ پرگنہ کی بستیوں کے قلم کاروں کا ایسا کلچرل ڈہ رہا ہے جہاں معین اعجاز، کامل اختر سے عبد الرحمن امر امیری تک بہت سی ممتاز شخصیتوں سے پہلی ملاقات کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے۔ وہاں صرف ادبی گفتگو ہوتی ہے اور تقریباً دن بھر۔ لنچ کے لیے چھوٹا سا وقفہ چھوڑ کر ہفتہ بھر میں کون کون سی کتابیں بازار میں آئیں۔ بک اسٹال پر کون کون سے میگزین دستیاب ہیں؟ کس رسالے میں کیا چھپا

www.taemeernews.com

ہے؟ مغربی بنگال کے کس قلم کار کا کیا چھپا ہے؟ کیا پڑھ لینا ضروری ہے؟ شب خوں، کتاب، تحریک، صبح نو، شمع، روبی، پیکر، واقعات، شاعر، عصری آگہی، روحِ ادب، آج کل اور ذہن جدید تک ہر وہ رسالہ جو کلکتہ جاتا ہے، وہ قیصر شمیم کے شانے سے لٹکتے ہوئے کپڑے کے تھیلے میں موجود ہوتا ہے اور اس طرح کہ اس کا ایک ایک لفظ ان کا پڑھا ہوا ہو۔

یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قیصر شمیم اتنی ساری مصروفیتوں کے باوجود ایک بہت اچھے قاری بھی ہیں۔ صرف اردو ادب کے ہی نہیں بنگلہ ادب کے بھی اور یہی سبب ہے کہ بنگالہ کا ڈھیر سارا اہم ادبی سرمایہ انھوں نے اردو میں منتقل کیا ہے کسی کی تحریک پر نہیں بلکہ صرف اپنے مطالعے کی بنیاد پر۔ شاعری کی ہے خوب جم کر کی ہے۔ آمد کی کیفیت رہتی ہے تو خوب کہتے ہیں۔ پھر لمبے لمبے Patch آتے ہیں جن کے دوران کچھ نہیں کہتے، البتہ مسلسل پڑھتے رہتے ہیں۔ اب کتابوں پر تبصرے کرنے لگے ہیں لیکن تنقیدی مضامین پہلے سے لکھ رہے ہیں۔ "شاد کی ایک غزل" ان کا ایسا اہم مضمون ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر کے محاسن کی ان کو کتنی اچھی پہچان ہے۔ مغربی بنگال کی ان بستیوں میں جہاں شاید ۵ فی صد گھرانوں کی زبان ہی اردو ہو بیشتر گھرانے بھوجپوری، اودھی، مگھئی یا بنگلہ اردو کے اختلاط سے نکلی ہوئی کلکتیا اردو جس میں ابراہیم ہوش نے باضابطہ شاعری کی ہے یا بنگلہ کے اثر میں رہنے کی وجہ سے بری طرح بگڑی ہوئی زبان جیسے کہ شجاع پوری (جسے سرجاپوری بھی کہتے ہیں) بولنے والوں کے ہیں، وہاں علم کے ساتھ ادب کے چراغ روشن کرنے میں جن شخصیتوں نے نمایاں رول نبھایا ہے ان میں قیصر شمیم کا نام نمایاں رہے گا۔ یہ ساری چیزیں ان کی غیر تخلیقی ادبی خدمات کے خانے میں آتی ہیں۔ میٹنگیں، سیٹنگیں، سیمینار، سمپوزیم، مشاعرہ، نشست، قیصر شمیم کے پاس وقت ہے تو وہ ہر محفل میں موجود ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ویسٹ بنگال بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی نصابی کمیٹیوں کی میٹنگ میں Non Conventional تعلیم کے مراکز میں اردو کی تدریس کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے طویل بیٹھکوں میں۔ دوستوں اور عزیزوں اور شاگردوں کی خبر گیری، عیادت، علاج و معالجہ کی طرف توجہ، گھریلو معاملات میں بطور مربی شمولیت اور دستگیری سے تعلق رکھنے والی سچائیاں صرف ان مہر بلب لوگوں تک محدود ہیں جو قیصر شمیم کی فیاضی اور دریا دلی سے فیض اٹھاتے ہیں اور ان کے ہی حکم پر اس کے تذکرے سے گریز کرتے رہتے ہیں۔

قیصر شمیم کے منتخب اشعار

مرے سفینے کو کچھ اور تیز دھارا دے
مری طلب یہ نہیں ہے کہ تو کنارا دے

بجھے بجھے سے یہ چہرے بھا نہ دیں مجھ کو
مری نظر کو سلگتا ہوا نظارا دے

www.taemeernews.com

ڈاکٹر خالدہ حسینی

کلکتہ

تو آں شاہے

ابا جی (مفسرِ قرآن الحاج مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب) جب سے علیل ہوئے تھے، ان کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد اخبار "آزاد ہند" دیکھتے تھے۔ ۱۵؍ مارچ ۱۹۹۸ء اتوار کا دن تھا اس لیے اخبار "اخبار ابا جی کو کھانا کھلانے کے بعد دے کر اپنے کمرے میں واپس آئی تھی کہ ان کی آواز سنائی دی" منی بٹی! منی بٹی!" میں فوراً ان کے پاس گئی تو دیکھا کہ ابا جی کے ہاتھ میں اخبار ہے اور ان کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا ہے۔ مجھ پر ان کی نظر پڑتے ہی کہا۔" آ گئیں بیٹا!" اور اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرطِ مسرت سے بے قابو ہو کر رندھی ہوئی آواز میں صرف یہی کہہ سکے" دیکھو بیٹا! ہمارے قیصر صاحب کو ملیح آبادی ایوارڈ ملنے کا اعلان ہے۔" میں نے دیکھا کہ" کلکتہ کی خیر و خبر" کے کالم میں چوکھٹے میں مع تصویر کے پہلی سرخی تھی کہ" ممتاز شاعر قیصر شمیم کو ملیح آبادی ایوارڈ" دیکھ کر مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی۔ پھر ابا جی نے کہا کہ" اسی لیے میں نے تمہیں بلایا کہ تم اسے دیکھ لو اور پڑھ لینا۔ پڑھ کر اخبار احتیاط سے رکھ دینا، آج تو اتوار ہے قیصر شمیم تو شیب پور میں ہوں گے شاید رات تک واپس آ جائیں"۔ چنانچہ ابا نے عشاء کے بعد مطب سے آتے ہی کہا کہ" مجھے کھانا کھلا کر ہی قیصر صاحب کو فون لگا دو۔ میں انھیں مبارک باد تو دے دوں"۔ استادِ محترم قیصر صاحب کلکتے میں اپنی بہن کے گھر قیام پذیر ہیں، اتوار کی رات ہی یہاں سے ان کی واپسی ہو جاتی ہے۔ ابا کی ہدایت کے مطابق میں نے فون لگایا تو قیصر صاحب نے ہی ریسیو کیا۔ ابا جی نے تہہ دل سے مبارک باد اور دعا دی اور دعا دیتے ہوئے ان کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔

اردو کے ممتاز شاعر و ادیب اور استاد جناب قیصر شمیم صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک بنگلہ رسالے" بھنو اگرنی" نے ۱۹۹۷ء میں سلیہ لتا رائے چودھری میموریل میڈل عطا کر کے بنگال کے اردو داں حضرات کو اسی طرح متوجہ کیا جس طرح فلم ساز اور ادیب ستیہ جیت رائے کو سب سے پہلا ایوارڈ فرانس نے ۱۹۵۵ء میں دے کر ہندوستانیوں کو ان کی قدر دانیوں کی طرف متوجہ کیا تھا اور ہندوستان نے اس کے بعد ہی

www.taemeernews.com

انھیں پدم بھوشن سے نوازا تھا' اس طرح چند ماہ کے درمیان مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے جناب قیصر شمیم کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف کر کے انھیں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ کے لیے منتخب کرلیا۔

خیر خدا کا شکر ہے کہ ایک طویل عرصے کے بعد ہی سہی آپ کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور اب یہی کیا جائے گا کہ "دیر آید درست آید"۔

استاد محترم جناب پروفیسر قیصر شمیم صاحب کی شخصیت ایک عالم جیسی جامع شخصیت ہے۔ آپ کی زندگی کے کسی بھی گوشے پر روشنی ڈالنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتی ہوں تو اپنی کم علمی اور ناقص کوشش کے باوجود جس گوشے پر بھی نگاہ مرکوز ہوتی ہے یہ آواز سنائی دیتی ہے :

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

استاد محترم کا اسم گرامی عبدالقیوم خان ہے۔ ادبی نام ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۷ء تک عمید انکسی تھا لیکن نام کے گاڑھے پن کی وجہ سے اسے تبدیل کر کے قیصر شمیم رکھا۔ آپ کی پیدائش ۲؍اپریل ۱۹۳۶ء کو کلکتے سے ۲۵؍میل دور (انکس ضلع ہگلی) کے ایک پٹھان گھرانے میں ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ سکینہ خاتون اپنے دو سال کے شیر خوار بچے کو روتے اور بلکتے ہوئے چھوڑ کر اس عالم فانی سے کوچ کر گئیں۔ آپ کے والد ماجد اور پھوپھی صاحبہ نے آپ کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔

آپ کے والد کا نام عبدالرحیم خان تھا جنھوں نے اپنے وطن غازی پور (یوپی) کو خیر باد کہہ کر انکس میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اور انکس جوٹ ورکس کے ویونگ ڈیپارٹمنٹ (Weaving Department) میں ملازم ہوگئے تھے۔ وہ بعد میں ترقی کر کے اس ڈیپارٹمنٹ کے سردار بن گئے۔ مزید ترقی ہوئی اور انھیں بڑا سردار بنانے کی پیش کش کی گئی جسے انھوں نے صرف اس لیے قبول نہیں کیا کہ یہ عہدہ اور رشوت خوری' دونوں لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔ عبدالرحیم صاحب قناعت کے ساتھ اپنے پرانے عہدے پر ہی رہ کر ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوئے اور چند سال اپنے بیٹے قیصر شمیم کے ساتھ شیب پور میں رہ کر ۱۹۷۸ء میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

ان کی شخصیت بھی ہم عصروں اور رفیقوں میں بڑی نمایاں تھی بڑے نیک، صالح، بندہ پرور اور جفاکش تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ بھی انتہائی خدمت گزار، وفاشعار اور مخلص خاتون تھیں اور بہن اسلام النساء جنھوں نے کئی بار اپنے دعائیہ کلمات اور پیار سے مجھے سیراب کیا تھا' بہت خوش اخلاق اور سراپا محبت تھیں۔ انھیں کی بڑی صاحب زادی نجمہ کے ساتھ قیصر شمیم صاحب کی شادی میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی کردی گئی۔ محترمہ نجمہ صاحبہ بڑی نیک اور کنبہ پرور خاتون ہیں۔ شیب پور کے ایک اسکول میں ٹیچر تھیں' اب ریٹائر ہوچکی ہیں۔ ان کی

www.taemeernews.com

ایک بچی تھی جو پیدائش کے چند ماہ بعد ہی خدا کو پیاری ہوگئی۔ فی الحال ایک بیٹا عرفان الحیات ہیں، جواب ماشاء اللہ ایک بچی اور ایک بچے کے باپ ہیں۔

استاد محترم کی ابتدائی تعلیم انکس بوائز پرائمری اسکول میں ہوئی لیکن پرائمری فائنل امتحان چاپدانی کے بس فری پرائمری اسکول سے فرسٹ ڈویژن پاس کیا۔ اس کے بعد پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول کلکتہ میں داخل کیے گئے لیکن چھٹی جماعت میں تھے کہ ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فساد کی وجہ سے تعلیم رک گئی۔ بعد میں آپ نے گرولیہ جوٹ مل ہائی اسکول (شیام نگر) میں داخلہ لیا۔ لیکن جب گھر کی معاشی پریشانیاں بہت زیادہ بڑھ گئیں تو آپ نے نویں جماعت میں خود ہی اسکول جانا ترک کردیا۔ آپ کے والد اس پر بڑے کبیدہ خاطر ہوئے تو استاد محترم نے انھیں تسلی دی اور یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ " میں اسی سال پرائیوٹ امیدوار کے طور پر میٹرک کے امتحان میں ضرور بیٹھوں گا۔" ٹسٹ امتحان میں شریک ہوئے اور سینٹ اپ بھی ہوگئے لیکن کچھ ایسی دشواری سامنے آئی کہ فائنل امتحان میں شریک نہ ہوسکے۔ انھیں ناسازگار حالات میں آپ نے کلکتہ کے ایک پرائیوٹ مدرسے میں تدریسی خدمت کا آغاز کیا۔ اپنی تمام کوششوں کے باوجود اعلیٰ تعلیم کی پیاس بڑی شدت سے تھی لہٰذا پھر آپ نے ۱۹۵۲ء میں ہگلی مدرسہ میں داخلہ لیا اور وہیں ہوسٹل میں رہ کر پڑھنے لگے۔ اور وہیں سے ۱۹۵۳ء میں ہائی مدرسہ کا امتحان دیا اس امتحان میں صرف اول ڈویژن ہی نہیں آئے بلکہ ویسٹ بنگال ہائی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بھی ہے اس شاندار کامیابی کے بعد اپنے گھر آئے تو والد صاحب کے رزلٹ پوچھنے پر رونے لگے۔ والد صاحب نے سمجھا کہ لڑکا فیل ہوگیا ہے چنانچہ تسلی دینے کے لیے کہا۔" بیٹا! کیوں رو رہے ہو فیل ہوگئے تو کیا ہوا دوبارہ امتحان دینا، پاس ہوجاؤ گے" اور یہ شعر پڑھا :

گرتے ہی شہسوار ہی میدان جنگ میں ۔۔۔ وہ طفل کیا گرے جو کہ گھٹنوں کے بل چلے

استاد محترم نے آنسو پوچھتے ہوئے فوراً کہا۔" نہیں ابا میں تو فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوا ہوں اور پورے بورڈ میں سکنڈ بھی آیا ہوں" یہ سن کر والد صاحب حیرت میں پڑ گئے۔ پوچھا" تب روتے کیوں ہو، یہ تو خوشی کی بات ہے" آپ نے جواب دیا" یہ سوچ کر رو تا آ گیا کہ اب میری تعلیم بند ہوجائے گی؛ نہ داخلہ ہوگا نہ پڑھ سکوں گا" دراصل ان دنوں آپ کا خاندان زبردست معاشی پریشانیوں سے دوچار تھا۔

بہرحال والد نے بیٹے کے شوقِ تعلیم کو دیکھتے ہوئے کالج میں داخلے کی اجازت دے دی۔ استاد محترم نے خود کلکتے آکر سنٹرل کلکتہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں وہیں سے آئی اے فرسٹ ڈویژن سے پاس کر کے اسی کالج میں انگریزی میں آنرس لے کر پڑھنے لگے۔ لیکن آپ کو جو خدشہ تھا

www.taemeernews.com

وہی ہوا بی۔اے میں داخلہ تو لے لیا لیکن دو سال پڑھنے کے بعد فائنل امتحان میں بیٹھنے سے پہلے ہی ہوڑہ مسلم ہائی اسکول میں انگریزی، اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرنی پڑی اور ہمیشہ کے لیے اسی علاقے میں منتقل ہو گئے۔ آپ نے ہوڑہ کی اندھیری بستیوں میں جگنو بن کر علم کی جوت جگائی اور اب سورج بن کر چہار دانگ اجالا پھیلا رہے ہیں۔

استاد محترم ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۸ء تک ہوڑہ ہائی اسکول کی خدمت انجام دیتے رہے اور اسی دوران ۱۹۶۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔اے اور ۱۹۶۵ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم۔اے کر لیا اور فرسٹ کلاس حاصل کیا۔ پھر ایسا ہوا کہ ہوڑہ مسلم ہائی اسکول کی مجلس انتظامیہ اور اساتذہ کے درمیان زبردست تنازعات کھڑے ہوئے اور نوبت مار پیٹ اور مقدمے بازی تک پہنچ گئی۔ جس سے اسکول کا تعلیمی ماحول بالکل خراب ہو گیا۔ اس صورت حال سے بے زار ہو کر استاد محترم نے ۱۹۶۸ء میں ہوڑہ مسلم ہائی اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور سی۔ایم۔او ہائی اسکول کلکتہ کے استاد مقرر ہو گئے اور ۱۹۹۶ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔

استاد محترم ۱۹۷۰ء میں کچھ دن کے لیے خضر پور کالج میں ایوننگ کلاس کے جز وقتی لکچرار رہے۔ پھر دوبارہ ۱۹۸۰ء میں اسی کالج کے ڈے سیکشن میں تقرر ہوا۔ وہاں مستقل ہونے کی پوری امید تھی لیکن جب اس کا موقع آیا تو اس کا موقع آیا تو ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ آپ نے تنگ آ کر کالج چھوڑ دیا۔ لیکن خدا نے آپ کو جلد ہی اس سے اعلیٰ مرتبہ کیا، ۱۹۸۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں گیسٹ لکچرر مقرر ہو گئے اور ۶۵ رسال کی عمر ہو جانے پر وہاں سے ۲۰۰۱ء میں سبک دوش ہوئے۔

آپ کو بچپن ہی سے شعر و شاعری اور افسانہ نگاری کا شوق تھا لیکن ادبی رسائل اور جرائد میں آپ کی تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا جو تسلسل اور تواتر کے ساتھ برسوں جاری رہا۔ آپ نے شروع میں علامہ محوی لکھنوی کے شاگرد مولوی شمس الہدیٰ شمس مظفر پوری سے اپنی چند غزلوں پر اصلاح لی۔ پھر کالج کے دنوں میں پروفیسر عباس علی خان صاحب بیخود کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا اور انھیں سے زبان اور علم عروض کی باریکیاں سیکھیں۔ یونیورسٹی کے زمانے میں اپنی دو تین غزلوں پر جناب پروفیسر پرویز شاہدی سے بھی اصلاح لی۔ پھر اس کے بعد اپنے ذوق سلیم کی رہنمائی میں اپنا ادبی سفر طے کرتے ہیں۔

آپ نے بیک وقت شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیائے ادب میں قدم رکھا۔ آپ کی پہلی نظم نما غزل بعنوان "حالات" ۱۹۵۱ء میں کلکتہ کے ہفتہ وار "ساگر" میں شائع ہوئی اور آپ کی پہلی کہانی "وہ لڑکی" بھی ۱۹۵۱ء میں دہلی کے "پارس" ویکلی میں (جس کے ایڈیٹر لالہ کرم چند تھے) شائع کی گئی۔

www.taemeernews.com

استاد محترم نے پہلی بار ۱۹۴۹ء میں گردلیا (شیام نگر) کے ایک مشاعرے میں شرکت کی اس وقت آٹھویں جماعت میں تھے مشاعرے کے صدر مولانا شاکر کلکتوی نے آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ۱۹۵۴ء میں جب شیب پور (ہوڑہ) آئے تو اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں سارا سامان رکھ کر سیدھا مشاعرہ گاہ میں چلے گئے اور وہاں اپنی ایک غزل سے سامعین کا دل جیت لیا۔ آپ کو اس شعر پر خاصی طور سے داد ملی اور خود صدر مشاعرہ جناب پرویز شاہدی نے اسے کئی بار پڑھوایا:

موت کا جس پہ اختیار نہیں ہم نے وہ زندگی بھی دیکھی ہے

استاد محترم اپنی شاعری کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک شاعری ساعتوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے، ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کے عمل سے ملتا جلتا عمل ہے لیکن سخت تر اور لطیف" شاعری کے لیے سوزِ دل کو ضروری سمجھتے ہیں اس سلسلے میں آپ کا شعر ہے:

جو دل نہ سلگے تو مرجائے شاعری قیصر بلائے جان کی طرح یہ ہنر کہاں کا ہے

آپ کی شاعری آج کے مشینی دور کے سارے پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے، زندگی کی رنگینیوں سے دور زندگی کی تیز دھوپ میں مشینی زندگی کے دکھ کا بوجھ کندھے پر لادے کنکریلے، پتھریلے، اوبڑکھابڑ راستے پر آپ کا سفر مستقل جاری ہے آپ کی شاعری زندگی کے درد و غم اور سوز و گداز کا مظہر ہے۔ عید کے موقع پر بند کارخانے کا ایک بے سہارا مزدور اپنے بچوں کے لیے کس قدر بے چین اور پریشان ہوتا ہے، اس کی اسی کیفیت کو آپ نے اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ دیکھیے کس انداز میں یہ کیفیت پیش کی گئی ہے:

تیری دنیا میں خدایا،
کیوں حصولِ رزق کا موقع ہمیں ملتا نہیں ہے؟
کون سی منڈی میں جائیں، ہم جہاں پر بک سکیں
جگمگائیں پھر ہمارے ہاتھ پر، دو چار ہی سکے سہی،
عید کے دن کی شعاعوں کی طرح،
جن سے ہم ننھوں کو اپنے خوش کریں
اور سمجھیں
آج اپنی عید ہے!

(نظم عید آئی ہے مگر......)

www.taemeernews.com

آپ کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں انسانی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ زندگی کے تجربات مشاہدات کو اپنے خونِ جگر سے صفحۂ قرطاس پر سجاتے ہیں۔ چنانچہ خود کہتے ہیں کہ :

مرے قلم سے ٹپکتا ہے میرے دل کا لہو　　　　مری نگاہ میں ہیں ماہ و سال کے پیکر

استادِ محترم قیصر شمیم کی شاعری عوام الناس کے لیے پیغام ہے۔ شاعر کی آرزو ہے کہ اس کی تخلیقات جنگل میں پھول کھلا سکیں، ہر دل میں جدید تعمیر کی لہر اٹھا سکیں، ہر ناتواں کو توانا بنا سکیں، آفت اور مصیبت کے وقت لوگوں میں قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہو، آپس کا زمٹ جائے اور اتحاد پیدا ہو، شک و شبہات ختم ہو جائیں اور امیدیں رقص کرنے لگیں :

میں گاؤں تو خوش ہو کر　　　　دل کل دھرتی کا جھومے

روتے ہوئے جینا بھی کوئی جینا ہے قیصر　　　　ہنستے ہوئے مر جایئے یہ بات بڑی ہے

صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ پھر کہتے ہیں :

جب ظلم اٹھائے سر　　　　اوپر سے بجلی کڑکے

استادِ محترم قیصر شمیم صاحب خوشامد پسندی اور نمائشی زندگی سے کوسوں دور رہ کر بڑی بے نیازی، وداری اور گوشہ نشینی کے ساتھ خدمتِ ادب کو عبادت اور ریاضت سمجھ کر بے لوث خدمت انجام دیتے رہتے ہیں، جب ہی تو کہتے ہیں کہ :

گھر کے کونے میں پڑا ہوں بابا　　　　ایک بوسیدہ ہوں

اشتراکیت سے یک گونہ تعلق رکھنے کے باوجود اپر مکمل بھروسہ اور یقین ہے، آپ اپنی خودداری کا اظہار یوں کرتے ہیں :

قیصر خدا کا شکر کہ مفلس ہوں پھر بھی ہوں　　　　ہر صاحب رسوخ کے دربار سے الگ

چھینٹے مرے دامن پہ خوشامد کے نہ آئے　　　　رکھا مجھے بے داغ مری بے طلبی نے

مشکل ہے بہت دوستو! دنیا کو سمجھنا　　　　ظاہر میں یہ شبنم ہے تو باطن میں دھواں ہے

آپ کو اپنے معاشرے میں جن تجربات سے دوچار ہونا پڑتا ہے انھیں اپنی زندگی اور اپنے رویے کے حوالے سے وہ اسی طرح پیش کرتے ہیں :

ناپ رہا ہے کیوں تو 'اونچے عہدوں سے　　　　میرا قد چھوٹا ہے بابا' تیرا کیا

جیسا بھی ہے اس میں نقلی پن تو نہیں　　　　یہ میرا چہرہ ہے بابا تیرا کیا

www.taemeernews.com

لفظوں کے رس گھلے میرے پاس نہیں   تلخ اگر لہجہ ہے بابا   تیرا کیا

خدا نے دماغ سمیت تمام انسانوں کو ایک جیسا بنایا ہے۔ غم، خوشی، محبت، نفرت، غصہ، یہ تمام جذبات واحساسات دنیا کے انسانوں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں خواہ وہ گورے ہوں یا کالے ہوں، ہندو ہوں یا مسلمان، ہم مذہب ہوں یا غیر مذہب کے ہوں۔ استاد محترم قیصر شمیم صاحب نے اسی موضوع پر خوبصورت نظم " درد آنسو، مسکان " لکھی ہے، جس میں بنی نوع انسان کی بنیادی خصوصیات کا ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رنگ، نسل، ملک اور مذہب کی بنیاد پر انسان انسان میں فرق کرنا غلط ہے آپ کی یہ خوبصورت اور انسانیت سے لبریز نظم پیش ہے :

آنسو،   مسکان

درد نہ گورا' درد نہ کالا
درد نہ ہندو' درد نہ مسلم
درد جہاں ہو' جس دل میں ہو
ہی اس کا نام
دل میں رہنا' دل کو ستانا جگ میں اس کا کام
درد ہی اس کا نام

آنسو پورب ، آنسو پچھم
آنسو   آنسو دکھن
دیش دشا کا بھید نہ مانے
آنسو کوئی دھرم نہ جانے
آنسو چاروں دھام
دکھ سکھ کا کچھ حال سنانا جگ میں اس کا کام
آنسو چاروں دھام

ہونٹوں پر مسکان کھلے تو
روپ نہ دیکھے' رنگ نہ دیکھے
نام نہ پوچھے' ذات نہ پوچھے

www.taemeernews.com

کوئی نر ہو یا ناری ہو

سب کے لیے اس کی شوبھا ہے

صبح رہے شام

سب کے من میں جوت جگانا جگ میں اس کا کام

صبح رہے یا شام

سب کے لیے ہیں جگ میں تینوں۔ درد، آنسو، مسکان

کاش! ابھی ایک بات سمجھ لیں آج کے ہم انسان

آج جہاں پرویز شاہدی، ان کے ہم عصروں اور نئی صف کے شاعروں کے بارے میں اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہیں وہیں بنگلہ شاعر قاضی نذرالاسلام اور منشی پریم چند کے بارے میں اپنے دلی جذبات کو بھی شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ آپ کے یہاں تلسی اور جاتی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جہاں آپ کی نظموں کے عنوانات۔ "سرِ راہ" "شامِ غم" اور "اپنے لہو کا حصہ" وغیرہ ہیں، وہیں "آرتی" "سندیشہ" "بتی کے دو بول" اور "جیون پتھ پر" بھی ہیں اس طرح آپ نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو قریب ترلانے کی کوشش کی ہے۔ آپ اپنے اسی مخصوص انداز میں مساوات کا پیغام دیتے ہیں۔ آپ کی فکر ایک سچے اور بے تعصب انسان کی فکر ہے :

میرا مذہب عشق کا مذہب جس میں کوئی تفریق نہیں   میرے حلقے میں آتے ہیں تلسی بھی اور جاتی بھی

استاد محترم کی شاعری کا دامن خاصا وسیع ہے جس میں انسانی زندگی اور کائنات سے تعلق رکھنے والے بے شمار مختلف موضوعات و احساسات اور دنیاوی تجربات اور مشاہدات کو جگہ ملی ہے۔ آپ کو ہندوستان کی مٹی اور اس کی گنگا جمنی تہذیب سے بڑا گہرا تعلق اور عقیدت ہے۔ آپ نے زندگی کے تمام نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور پرکھا ہے اسی لیے دنیا و مافیہا سے بے نیاز، نہ صلے کی پروا نہ تمنا کی خواہش کے ساتھ دنیا کی تمام آلائشوں اور پست خواہشوں سے پاک صاف زندگی کی تپتی ریت پر چلتے ہوئے ادب کے ایک خوددار، سچے، کھرے اور صوفی منش شاعر بن چکے ہیں۔ اس مصنوعی چمک و دمک کے دور سے تنگ آ کر خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں :

غسل دے پھر ہماری دنیا کو   نوح کے عہد کا سمندر لا

ہر نفس ایک حشر ہے واعظ   لا ذرا دیکھیں تیرا محشر لا

آپ کی ادبی ریاضت سلجھے ذہن کی ریاضت ہے۔ سلجھے ہوئے ذہن کی غزلوں، نظموں اور گیتوں میں جذبات سے زیادہ فنکاری پر توجہ رکھتے ہیں اور کسی بھی حالت میں فن کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں۔ آپ کی

www.taemeernews.com

چھوٹی چھوٹی معنی خیز نظمیں اس کی گواہ ہیں۔

استاد محترم کو زبان پر بڑی قدرت ہے، جب آسان زبان کا استعمال کرتے ہیں تو شروع سے آخر تک آسان الفاظ ہی سے اپنی شاعری کو سجاتے ہیں اور اس میں حسن پیدا کرتے ہیں اور جب عربی، فارسی الفاظ استعمال کرتے ہیں تو آخر تک الفاظ شاعری کی رواں دواں زبان میں ڈھلتے چلے آتے ہیں۔ یہی آپ کی فنکاری اور ہنرمندی کا کمال ہے۔ ویسے آپ کو اردو، ہندی، بنگلہ، عربی، فارسی، انگریزی زبانوں پر قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے فکروفن میں انتہائی گہری وسعت ہے۔ آپ کی تشبیہات اور تمثیلات آپ کے طرز فکر اور پیرایۂ اظہار کے ضابطے کو ظاہر کرتی ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں اپنے افکار و خیالات ظاہر کرنا آپ کی خصوصیت ہے۔ آپ کی نظم ''آدمی'' اور ''آئینہ'' بطور مثال پیش خدمت ہے، ملاحظہ فرمائیں :

دونوں اپنے آپ سے پوچھیں
کیا دیکھا ہے؟
دونوں گونگے بن جائیں گے!

مغربی بنگال کے اردو ادب میں گیتوں کا سرمایہ برائے نام تھا۔ استاد محترم قیصر شمیم صاحب ہی ایسے اولین شاعر ہیں جنہوں نے سرزمین بنگال کے خزانۂ ادب اردو کو اپنے گیتوں سے سجادیا۔ عم محترم جناب سالک لکھنوی صاحب (آبشار کے ایڈیٹر اور اردو اکاڈمی کے سابق چیئرمین) آپ کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ '' یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ گیت اچھے لکھتے ہیں یا غزل عمدہ کہتے ہیں۔'' ('آ۔ ر ۲۴ر اگست ۱۹۷۱ء) ایک گیت کے دو بول دیکھیے :

(۱) کیسے بادل، کیسا ساگر، کیسی گنگا، کیا جمنا
اپنی اپنی سب کو لگی ہے ان سے آس لگائے کون
ہائے یہ آگ بجھائے کون؟
(۲) مایا کا بندھن ہے پرانا من من میں ہے لوبھ کا روگ
اس لوبھی سنسار میں رہ کر تیاگ کا راگ سنائے گا کون
ہائے یہ آگ بجھائے کون؟

استاد محترم قیصر شمیم صاحب کی شاعری نے اہل علم اور دانشوروں حضرات کے دلوں پر بڑے گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں جناب ڈاکٹر شارب ردولوی نے 'گل صد رنگ' کے نام سے تقریباً پانچ سو

www.taemeernews.com

شاعروں کی غزلوں کا ایک انتخاب شائع کیا تھا جس میں آپ کی دو غزلیں بھی ہیں۔ اس کے بعد شری ایودھیا پرشاد گوئل نے 'اردو شاعری کے نئے موڑ' کے نام سے ایک مجموعہ "گیان پیٹھ" وارانسی سے شائع کیا، جس کی دونوں جلدوں میں آپ کی نظمیں درج ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور کے مشہور ناول نگار ایم۔ اسلم نے اپنے ایک ناول میں ایک باب کا آغاز ہی آپ کے گیت سے کیا ہے۔ دلی کے ماہنامہ "تحریک" میں گزشتہ بیس سال کی شائع شدہ اردو شاعری کا ایک انتخاب "شیرازہ" کے نام سے ملے شائع ہوا ہے جس میں آپ کا کلام بھی شامل ہے۔ اس سے پہلے جمشید پور سے جناب سید احمد شمیم صاحب اور جناب شمس فریدی صاحب کے انتخاب "گلوب" میں بھی تعارف کے ساتھ آپ کی شعری تخلیقات شائع کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ کلکتہ یونیورسٹی کے اقبال چیئر کے سابق پروفیسر ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب نے اردو کے تقریباً سات سو شاعروں کی تین تین غزلوں کا مجموعہ بعنوان "روحِ غزل" ترتیب دیا تو آپ کی غزلیں بھی اس میں شامل کی گئیں۔

استاد محترم بنگلہ، ہندی اور انگریزی کے کامیاب مترجم بھی ہیں۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ "ساعتوں کا سمندر" ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بیک وقت اردو اور دیوناگری میں تھا۔ ہندی کے مشہور شاعر شمبھو پرساد شریواستو نے اسے اپنے ادارہ "سپرنا" سے شائع کیا تھا اور اس کی رسمِ اجرا کلا مندر میں بڑی شان و شوکت سے ادا کی گئی تھی۔ اس موقع پر استاد محترم قیصر شمیم صاحب کو ایک ہزار روپے بطور رائلٹی پیش کیے گئے تھے۔ اس کے بعد دوسرا شعری مجموعہ صرف دیوناگری میں "تیری دھارا" کے نام سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ اسے بھی ایک دوسری ہندی تنظیم "دشانتر" نے شائع کیا۔ اس سلسلے میں شمبھو پرساد شری واستو اور ڈاکٹر ہری کنور رائے قابل تحسین اور مستحق مبارک باد ہیں' جنہوں نے دونوں مجموعوں کو شائع کر کے قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

استاد محترم جناب قیصر شمیم صاحب کی شخصیت میں اتنے کمالات ہیں کہ ایک پر نظر ڈالیے تو دوسرا از خود نمایاں ہونے لگتا ہے۔ آپ شعر و شاعری کے علاوہ بچپن ہی سے کئی سماجی ادبی اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔ آپ نے ہائی مدرسہ پاس کرنے کے قبل ہی انگس میں اتحاد الطلبا مسلمین لائبریری اور ادبی سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ اس ادبی سوسائٹی کے تحت ادبی سوسائٹی ہائی مدرسہ کا قیام ہوا، جسے سرکاری منظوری بھی حاصل ہو چکی ہے۔ آپ منشی پریم چند کے لے پالک بیٹے اور انگس پرائمری اسکول کے استاد جناب رضی احمد صاحب بیخود کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء کے روزانہ اخوت، کے اور ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ کے جز وقتی سب ایڈیٹر رہے۔ اس کے ساتھ آپ کی تھوڑی سی وابستگی ہفتہ وار "کسان مزدور" سے بھی رہی۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں "ہوڑہ ٹائمز" کے اعزازی مدیر اور اس سے پہلے "کہانی" اردو ماہنامہ کلکتہ کی مجلس مشاورت

www.taemeernews.com

کے رکن تھے۔ کئی سال سے مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی جنرل کونسل اور گورننگ باڈی کے ممبر رہنے کے بعد اب اس اکاڈمی کے وائس چیئرمین ہیں۔ ساتھ ہی ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن کے مؤسس و مشیر اعلیٰ ہیں۔

"قیصر شمیم کا ادبی شعور" کے نام سے آپ پر جناب ناصر علی انصاری نے بہار یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ناز قادری کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھ کر بی۔ آر۔ امبیڈکر بہار یونیورسٹی سے ۱۹۹۹ء میں پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔

استاد محترم جناب پروفیسر قیصر شمیم صاحب جہاں مختلف علوم وفنون کے ہیرے موتی اور جواہرات سے مزین تاجدار ہیں، وہیں خاکساری کے بوجھ سے جھکے ہوئے خرقہ پوش فقیر بھی ہیں!

آخر میں یہی کہنا چاہوں گی کہ اس خرقہ پوش فقیر کے دامن فیض سے وابستہ رہنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ ان لوگوں کی ترقی و شہرت پر نظر جاتی ہے تو فوراً یہ شعر زبان پر آجاتا ہے:

تو آں شاہے کہ بر ایوانِ قصرت ۔۔۔ کبوتر گر نشیند' باز گردد

غزل

قیصر شمیم

ایک پودا جو اگا ہے' اسے پانی دینا
اپنے آنگن کو نئی رُت کی کہانی دینا
تیری آواز سے جب ٹوٹے مرے گھر کا سکوت
کو بھی سحر بیانی دینا
کشتیاں دینا مگر اذنِ سفر سے پہلے
ٹھہرے پانی کو بھی دریا کی روانی دینا
یوں جلوں میں کہ نہ شرمندہ رہوں سورج سے
اور کچھ اور' مجھے سوختہ جانی دینا

www.taemeernews.com

ڈاکٹر ہری کنور رائے کنور

سوانح عمری قیصر شمیم

چلنے تو سبھی ہیں اور ان میں سے بیشتر اپنی منزل تک پہنچ بھی جاتے ہیں۔ لیکن قیصر شمیم ایک ایسے شخص ہیں جن کے ساتھ کارواں چلتا ہے۔ وہ سگے سمبندھیوں، شاگردوں اور احباب سے گھرے رہتے ہیں اور ان سب کے مسائل کو سن کر نہایت اطمینان سے ان کا حل تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ اپنا ذاتی نقصان بھی کر بیٹھتے ہیں لیکن مسائل سے کبھی گھبراتے نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایسے حالات سے وہ بچپن سے جوجھتے چلے آ رہے ہیں۔ اوائل عمری سے وہ مختلف قسم کے مسائل سے دوچار رہے ہیں۔ نتیجتاً ادبی زندگی کے آغاز میں ہی ان کے قلم سے مندرجہ ذیل قسم کے اشعار نکلتے گئے :

کون مونس، کون ہم دم، حالِ دل کس سے کہیں
یہ متاعِ زندگانی سرد آہیں اشکِ پیہم

لیکن قیصر شمیم نے وقت کے سامنے ہار نہیں مانی۔ وہ حالات کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ زندگی کی کشتی کو وقت کے موجیں مارتے سمندر میں ڈگمگانے نہیں دیا بلکہ ایک حوصلہ مند اور پُرامید ملاح کی طرح اس کشتی کو کھیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ ان کی ناؤ حالات کی موجیں جھیلتی ہوئی کنارے لگ گئی ہے۔ وہ اب پہلے سے کافی مطمئن ہیں کبھی کبھی وہ کہتے ہیں کہ "اللہ نے سب کچھ دیا۔ جب پیر قبر میں لٹکے ہیں۔ ان کے بارے میں ان سے کچھ جان پانا بہت مشکل ہے۔ دورانِ گفتگو کبھی کبھی اپنے ماضی کے بارے میں اپنے ہم عصروں سے وہ کچھ نہ کچھ بول جاتے ہیں۔ وہی کلمات میرے لیے رہنمائی کے باعث ہیں۔ ان کی زندگی کے ایک رخ کو ان کی ایک نظم "میرا مکان" بیان کرتی ہے۔ وہ مستقبل کے سلسلے میں ہمیشہ پُرامید رہے۔ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے کسی بھی سطح پر شکست قبول نہیں کی۔ وہ فرماتے ہیں :

ہمارا دل ہی ابھی تک شکست خوردہ نہیں
وگرنہ شام و سحر نے بہت فریب دیئے

انھیں اللہ، اپنی محنت، انسانیت، نظم و ضبط، اخلاقی قدریں، مطالعہ، شعر و شاعری اور اس کے رموز و نکات اور اپنی قوتِ گفتار پر بھروسہ ہے جس کے سبب وہ خود اعتمادی اور نہایت خاکساری کے ساتھ کہتے ہیں :

www.taemeernews.com

رفعتوں کا جس نے توڑا ہے غرور ہم نے وہ دیکھی ہے پرواز حیات

ان کا اصل نام عبدالقیوم خان ہے لیکن ان کے اس نام سے چند لوگ ہی واقف ہیں۔ ادبی دنیا میں قیصر شمیم کے نام سے معروف ہیں۔ تخلیقات میں قیصر اور قیصر شمیم دونوں نام نظر آتے ہیں۔

ان کی پیدائش ۲؍اپریل ۱۹۳۶ء کو مغربی بنگال میں کلکتہ سے تقریباً ۲۵؍میل دور انکس نامی قصبے میں ایک غریب سنی خاندان میں ہوئی۔ والد عبدالرحیم خان (مرحوم) ایک کارخانہ میں ملازم تھے۔ وہ محنتی، مذہبی اور دوسروں کی بھلائی کرنے والے انسان تھے۔ والدہ سکینہ خاتون (مرحومہ) بھی دوسروں کی بھلائی کرنے میں ہمیشہ آگے رہتی تھیں لیکن ابتدائی زندگی ہی میں قیصر شمیم کے سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ ان کی پرورش پھوپھی اسلام النساء بی بی (مرحومہ) نے کی۔ والد اگرچہ انکس کے جوٹ مل میں سردار تھے لیکن تنخواہ کے علاوہ غیر قانونی طریقے سے ایک پیسہ بھی لینا گناہ سمجھتے تھے۔ نتیجے میں مالی حالت ہمیشہ ابتر رہی۔ وہ غازی پور کے موضع کمن پور کے باشندہ تھے جہاں قیصر صاحب پہلی بار ۱۹۴۳ء کی جنگ کے دوران اپنی پھوپھی کے ساتھ گئے تھے۔ آج بھی وہاں سے رشتہ قائم ہے۔ انکس میں پیدا ہونے کے سبب وہ ان سے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک عمید انکسی کے نام سے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ بعدازاں مقطعے میں اس نام کے استعمال سے دشواری اور بعض احباب کو یہ نام غلط طریقے سے لکھتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے یہ نام بدل دیا۔ ان کی تعلیم کا آغاز انکس بوائز پرائمری اسکول سے ہوا لیکن انھوں نے چاپدانی میونسپل پرائمری اسکول سے پرائمری فائنل امتحان اول نمبر سے پاس کیا۔ مالی حالت کی ابتری کے سبب دو ڈھائی سال تک اسکول کا دیدار نہیں ہوا۔ بعدازاں انھیں پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول میں داخل کیا گیا۔ ششم جماعت ہی میں ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے سبب تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ بے کار ضائع ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے دوبارہ شام نگر کے گارولیا جوٹ مل ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ لیکن نویں جماعت تک پہنچ کر مالی حالت اتنی ابتر ہوگئی کہ انھوں نے خود تعلیمی سلسلہ بند کردیا۔ علم دوست والد کا دل اپنے ہونہار بیٹے کے تعلیمی سلسلہ بند کردینے سے بہت زیادہ دکھی ہوگیا۔ لیکن بیٹے نے باپ کی دلجوئی کے لیے کہہ دیا کہ وہ پرائیوٹ سے دسویں جماعت کا امتحان دیں گے۔ بعدازاں وہ اس سلسلے میں ٹسٹ میں پاس بھی ہوگئے مگر نامناسب حالات کے سبب فائنل امتحان میں شریک نہ ہوسکے۔ انھی نامناسب حالات میں انھوں نے چھاتو بابو لین کلکتہ کے ایک مدرسے میں (جس کے سکریٹری مولانا آزاد کالج کے ریٹائرڈ پروفیسر فخرالدین اثر صدیقی صاحب' جو اس وقت ایم۔اے۔ کے طالب علم تھے) مدرس کی ذمہ داری سنبھالی مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش برقرار رہی۔ لہٰذا انھوں نے ۱۹۵۲ء میں ہگلی ہائی مدرسہ میں داخلہ لیا اور وہیں ہاسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس بار وہ

www.taemeernews.com

رسہ امتحان (جو مدھیامک امتحان کے مساوی ہے) میں اول آئے اور مغربی بنگال ہائی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ میں دوسرا انعام حاصل کرنے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ ۱۹۵۵ء قیصر شمیم سنٹرل کلکتہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) سے آئی اے امتحان اول نمبر سے پاس کر کے اس کالج میں انگریزی میں آنرز پڑھنے لگے لیکن فائنل امتحان کے قبل گھر کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ مجبور ہو کر ہوڑہ مسلم ہائی اسکول میں انگریزی، اردو اور فارسی ٹیچر کی حیثیت سے انھوں نے ملازمت کرلی۔ اس دوران انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں بی اے اور ۱۹۶۵ء میں ایم اے کا امتحان اول نمبر سے پاس کیا۔ ۱۹۶۶ء میں اسکول کی جانب سے انھیں بی۔ٹی۔ کے لیے بھیجا گیا مگر بیماری کے سبب انھیں کالج چھوڑنا پڑا۔ قیصر صاحب یکم مارچ ۱۹۵۷ء سے ۱۷ راپریل ۱۹۶۸ء تک ہوڑہ مسلم ہائی اسکول میں معلم رہے۔ تعلیمی زندگی میں یہی دوران کی زندگی کا خوش گوار دور تھا۔ اسی دوران انھوں نے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ۱۹۶۰ء سے روزانہ ''اخوت'' اور ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۸ء تک روزنامہ ''آزاد ہند'' کلکتہ کے جز وقتی معاون مدیر رہے۔ ساتھ ہی وہ ''کسان مزدور'' میں مترجم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ نومبر ۱۹۷۰ء سے وہ ''ہوڑہ ٹائمز'' (پندرہ روزہ) کے اعزازی مدیر (کہانی اردو ماہنامہ) کلکتہ کے بورڈ میں اعزازی ممبر رہے۔

قیصر شمیم ۱۹۷۰ء میں کچھ مہینے خضر پور کالج کے (ایوننگ کلاسیز) اور ۱۹۸۰ء میں جز وقتی لیکچرر رہے۔ ۱۹۸۱ء میں اسی کالج میں عارضی طور پر چھ مہینے کے لیے لیکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے اور پرمانٹ ہونے کی پوری امید تھی کہ بدقسمتی سے زمانے کے داؤ پیچ کے شکار ہو گئے۔ ۱۹۸۹ء سے وہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں گیسٹ لیکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

قیصر شمیم کو بچپن سے ہی شعر و شاعری اور کہانی لکھنے کا شوق تھا۔ لیکن ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۱ء سے شروع ہوا اور ان کی تخلیقات شائع ہونے لگیں۔ شروع میں وہ شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ان کی پہلی کہانی ''وہ لڑکی'' ہفتہ وار ''پارس'' دہلی (مدیر: لالہ کرم چند) میں شائع ہوئی۔ اسی سال ان کی ایک نظم ''ساگر'' کلکتہ ہفتہ وار (مدیر: عاجز مونگیری) میں ''حالات'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ساحلوں کا سمندر'' ہندی ادبی ادارہ ''سپر نا'' بانی و سکریٹری شمبھوناتھ پرساد سریواستو کے ذریعہ ۱۹۷۱ء میں فارسی اور دیوناگری لپی میں ایک ساتھ شائع ہوا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کی ایک ہزار کاپیاں ۲۸ دنوں میں فروخت ہوگئیں۔ جس کی رائلٹی ''ایک ہزار روپے'' قیصر شمیم کو کلا مندر ہال کے ایک جلسے میں بذریعہ چیک ادا کی گئی۔

۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر شارب ردولوی نے ''گل صد رنگ'' کے نام سے ایک شاعری کا انتخاب ترتیب دیا جس میں ملک کے پانچ سو شعراء کی غزلوں میں قیصر شمیم کی دو غزلیں شامل ہیں۔ اس کے بعد شری ایودھیا گوئل

www.taemeernews.com

نے اردو شاعری کے" نئے موڑ" کے عنوان سے ہندی میں ایک کتاب " گیان پیٹھ" وارانسی سے شائع کیا گیا جس نے دو جلدوں میں قیصر شمیم کے غزلیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور کے مقبول کہانی کار ایم. اسلم نے اپنے ایک ناول کا ایک باب قیصر شمیم کے ایک گیت سے شروع کیا ہے۔ حال ہی میں دہلی کے ماہنامہ" تحریک" میں گذشتہ بیس برسوں کی اردو شاعری کا ایک انتخاب " شیرازہ" کے نام سے شائع ہوا جس میں قیصر صاحب کو نہایت مناسب جگہ دی گئی ہے۔ اس سے قبل جمشید پور سے شائع ہونے والے انتھالوجی گلوب میں تعارف کے ساتھ ان کی دو غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ ادھر کلکتہ یونیورسٹی میں قیصر صاحب کے رفیقِ کار اور اقبال چیئر کے پروفیسر ڈاکٹر مظفر حنفی نے اردو کے لگ بھگ سات سو شاعروں کی تین تین غزلوں کا انتخاب " روحِ غزل" کے نام سے الہ آباد سے شائع کیا۔ اس میں قیصر صاحب کی غزلیں شامل ہیں۔ لیکن ۱۹۵۱ء کے بعد سے چھپنے والے قیصر شمیم کو انھوں نے ۱۹۷۵ء کے بعد کے شاعروں کی صف میں ان کے شاگردوں کے ساتھ غلطی سے رکھ دیا ہے' جس پر کئی مبصروں نے اعتراض کیا ہے۔ ایسے معروف شاعر اور رفیقِ کار سے ادبی دنیا میں ایسی تاریخی غلطی ہونا یہ حیرت ہی نہیں افسوس کی بات ہے۔

قیصر شمیم کے مالی حالات نے جہاں ان کی تعلیم کی حصول یابی میں رکاوٹ ڈالی وہیں انھیں ہوڑہ اور مزدوروں کے علاقے کا شاعر بنا کر ان کے شعری جوہر کو ماند کرنے کی کوشش بھی کی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی مالی دشواریوں کے پیشِ نظر ۱۹۹۴ء تک ان کی کوئی ضخیم کتاب شائع نہیں ہو پائی۔ اس میں ان کی ایک حد تک تساہلی اور بے نیازی کا دخل ہے۔ بعد ازاں ان کی دو کتابیں " سانس کی دھار" اور " زکاتے ہوئے" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئیں اور ان کے مضامین کا مجموعہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔ " تری دھارا" کی اشاعت کے سلسلے میں قیصر شمیم کی بڑھتی ہوئی معروفیات سے پیدا ہونے والی دشواریاں ناقابلِ بیان ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں اور مقابلہ جاتی امتحانات کی کاپیاں' یونیورسٹی اور اردو اکاڈمی کی میٹنگیں' مشاعروں کی صدارت اور شاگرد شعراء کے کلام کی اصلاح' پروفیسر اور شاگردوں کا مشورے کے لیے ان کے ہاں آنا جانا اور دوستوں اور رشتہ داروں کی شادیاں وغیرہ سب نے مل کر کام کی رفتار کو دھیما کر دیا۔ ہاں نجمہ قیصر کا تعاون قابلِ تعریف ہے۔

آغاز میں پروفیسر قیصر شمیم نے علامہ مہدی لکھنوی کے شاگرد مولوی شمس الہدیٰ مظفر پوری سے اپنی تخلیقات پر اصلاح لی۔ کالج کے دنوں میں پروفیسر عباس علی خاں بیخود سے مشورۂ سخن لیا اور انھیں سے زبان' اظہار بیان اور فنِ شاعری کی باریکیاں سیکھیں۔ یونیورسٹی کے دنوں میں اپنی دو تین غزلوں پر پروفیسر پرویز شاہدی سے بھی اصلاح لی۔ اب وہ اپنی صلاحیت اور قابلیت پر بھروسہ کر کے شعر کہتے ہیں اور اپنے شاگردوں کی تخلیقات پر اصلاح دیتے ہیں لیکن ان کا یہ کام استادی روایت سے الگ صرف اردو کی خدمت کے لیے ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

وہ بچپن سے ہی مختلف سماجی اور ادبی اداروں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہائی مدرسہ امتحان میں کامیاب ہونے سے قبل ہی انھوں نے انکس، بنگلی میں ادبی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ ادبی سوسائٹی آج بھی قائم ہے اور اس کی دیکھ ریکھ کے لیے ادبی سوسائٹی ہائی مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی جسے سرکاری منظوری مل چکی ہے۔ قیصر شمیم ان ادبی اداروں کے پہلے جنرل سکریٹری رہ چکے ہیں۔ وہ منشی پریم چند کے لے پالک بیٹے اور انکس پرائمری اسکول کے استاد جناب رضی احمد بجنودی کی صحبت سے بہت متاثر ہوئے۔

قیصر شمیم نے سب سے پہلے گارولیا شام نگر میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں شرکت کی۔ تب وہ درجہ ہشتم کے طالب علم تھے۔ مشاعرے کے صدر مولانا شاکر کلکتوی نے ان کی ہمت افزائی کی۔

۱۹۵۴ء میں قیصر شمیم تعلیم حاصل کرنے اور ملازمت کی تلاش میں ہوڑہ کے شیب پور علاقے میں آئے اور اپنا سامان لے کر ایک جگہ رکھ کر اسی دن انھوں نے یہاں کے ایک مشاعرے میں شرکت کی اور مندرجہ ذیل شعر پڑھ کر سامعین کا دل ہی نہیں جیتا' بلکہ اپنے متعلق شہرت کی تصدیق بھی کردی۔

ہم نے وہ زندگی بھی دیکھی ہے　　　　موت کا جس اختیار نہیں

مشاعرے کی صدارت پروفیسر پرویز شاہدی فرمارہے تھے۔ خوش ہوکر انھوں نے اس شعر کو کئی بار پڑھوایا۔ قیصر شمیم کی کوششوں سے ۱۶ر ستمبر ۱۹۶۶ء میں مختلف زبانوں کے شعراء اور ادباء کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لیے رائٹرز ایسوی ایشن قائم ہوئی۔ قیصر شمیم اس کے مؤسس ہیں۔ ان کی رہنمائی میں قابل اور تربیت یافتہ قلم کاروں کی ایک جماعت تیز رفتاری سے ادب کے ہر شعبے میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ان کے شاگردوں کے کلام اخبارات اور رسائل' آکاش وانی اور دوردرشن کے پردے پر نظر آتے ہیں۔

ان کا پہلا پیار اردو ادب کو ملا ہے لیکن دوسری زبانوں سے بھی بے انتہا لگاؤ ہے۔ ہوڑہ کے ہندی شاعر رام کرشن گپت بندھو کو ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے لیے سب سے پہلے مدد پہنچائی۔ ہندی کے ادبی ادارہ ساہتیہ سنگم کو سب سے پہلے عطیہ قیصر شمیم نے ہی دیا۔ اسی طرح وہ کئی بنگلہ کے شاعر اور موسیقار پنچانن رائے چودھری کے ساتھ مختلف پروگراموں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ بزرگوں کی تاکید ہے کہ کتابیں خرید کر پڑھی جائیں بھلے ہی کپڑے پھٹے ہوں! اس ہدایت پر قیصر شمیم صدق دل سے عمل کرتے ہیں۔ ان کا دھیان کتابیں خریدنے میں زیادہ اور کپڑے خریدنے میں کم رہتا ہے۔

طالب علمی کے دور میں کچھ برسوں تک قیصر شمیم متحد کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن رہے ہیں لیکن اب عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے ہیں۔

www.taemeernews.com

سچ مچ قیصر شمیم ایک قابلِ احترام شخصیت کا نام ہے۔ ان کے قریب بیٹھے لوگوں کو دیکھ کر دل خود بخود اقرار کرتا ہے کہ ہندستان کی فرقہ پرستی کا خاتمہ آسان ہے۔ اگر قیصر شمیم کی ہدایتوں پر عمل کیا جائے۔

اچاریہ رادھا موہن اپادھیائے نے اپنے سنسکرت مہا کاویہ 'بھارت وبھیم' کے صفحہ نمبر ۳۵۰ جن تین دیش بھگت مسلمانوں کا نام لیا ہے انمیں صدر جمہوریہ عزت مآب اے پی جے عبدالکلام اور جناب ہاشم کے ساتھ ایک نام حضرت قیصر شمیم کا بھی ہے۔

قیصر شمیم مغربی بنگال کے صفِ اول کے مشہور شاعر ہیں جن کی شہرت ہندوستان سے باہر بنگلہ دیش اور پاکستان تک پھیلی ہوئی ہے۔ موصوف نے اپنی شاعری کے متعلق خود لکھا ہے "میرے نزدیک شاعری ساتوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے کے عمل سے ملتا جلتا ایک عمل ہے لیکن سخت تر اور لطیف۔ وہ شاعری میں درد کو اولیت بخشتے ہیں :

جو دل نہ سلگے تو مرجائے شاعری قیصر ۔۔۔۔ بلائے جاں کی طرح یہ ہنر کہاں کا ہے

قیصر شمیم کی شاعری میں آج کی مشینی زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ زندگی کی رنگینیوں سے دور کڑی مشینی زندگی کا دکھ اٹھائے غیر مسطح راستوں پر گامزن ہیں۔ زندگی کی اس درد کو شعروں میں ڈھالتے ہیں۔ بند کارخانے کے ایک لاچار دکھی مزدور کی قابلِ رحم حالت قیصر صاحب کے شعروں میں سنیے :

کون سی منڈی میں جائیں ہم
جہاں پھر بک سکیں
جگمگائے پھر اپنی ہاتھوں پر
وہ چاندی کے سکے بھی
جس سے ہم اپنے ننھوں کو خوش کریں
آج اپنی عید ہے

(عید آئی ہے مگر......)

ضروری اشیاء کی کمی کا درد ہر غریب انسان کے لیے برابر ہوتا ہے۔ وہ کالے گورے، ہندو مسلمان مذہبی اور غیر مذہبی میں تفریق نہیں کرتا۔ پیسے کی کمی مسلمان کے لیے عید اور ہندو کی دیوالی کو یکساں طور پر تکلیف دہ بنیاد نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل نظم میں بند کارخانے کے مزدور کا درد ابھر کر سامنے آگیا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قیصر شمیم کی شاعری ترقی پسند شاعروں کی طرح مزدور کسان کی بات تک ہی محدود ہے بلکہ ان کی شاعری کا

www.taemeernews.com

میدان بہت وسیع ہے جس میں انسانی زندگی اور کائنات کے مختلف پہلوؤں اور بے شمار احساسات کو جگہ ملی ہے۔ ان کا نصب العین انسان کی فلاح ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ ان کے اشعار پڑھ کر کمزوریوں پر فتح پانے کا حوصلہ پیدا کر سکیں۔ فرقہ بندی کی تاریکی محبت و اخوت کی صبح میں بدل جائے۔ شبہات مٹ جائیں اور امیدیں رقص کرنے لگیں۔ وہ کہتے ہیں :

میں گاؤں تو خوش ہو کر دل کل دھرتی کا جھومے
جب ظلم اٹھائے سر پر تو اوپر سے بجلی کڑکے

ان کی نظموں، گیتوں، غزلوں اور رباعیوں میں عام انسان کی ہر دھڑکن چھپی ہے۔ وہ زندگی کے احساسات کو اپنے دل کی گہرائیوں سے یوں بیان کرتے ہیں کہ انھیں اس ڈھنگ سے بہت کم لوگ محسوس کر پاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مجبوراً انھیں کہنا پڑتا ہے :

لفظ کی سطح سے گہری ہیں بہت سی باتیں ہم بھی کچھ عرض کریں کوئی سخن فہم تو ہو

اساتذہ کی تصدیق وہاں ہوتی ہے جہاں بے خبر لوگ قیصر شمیم کی اس بات "میری شاعری نہ ادکا ورثہ ہے نہ استادوں کا عطیہ۔ یہ غلط مفہوم لیا ہے کہ شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔ یہ مفہوم کلی طور پر غلط ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں دو استادوں کا دخل تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے اپنے آخری استاد پرویز شاہدی مرحوم جن کا لگاؤ ان کی شاعری سے کم اور یونیورسٹی کی تعلیم سے زیادہ تھا' کے یومِ وفات پر نظم لکھ کر خراج عقیدت پیش کی۔ قیصر شمیم آٹھویں برسی پر لکھتے ہیں :

چل رہا ہوں آج میں
اسی طرف
جدھر تری نگاہ تھی

(نئی صف)

لیکن قیصر شمیم پرویز شاہدی کی بتائی ہوئی ڈگر سے بھی آگے نکل چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :

مگر تری نگاہ کا نور خیز نقطہ بھی
مرے سفر کی حد نہیں

شاعر ان سے سوال کرتا ہے کہ آپ وفات کر گئے لیکن اپنے ساتھ چلنے والوں کی رفتار کیوں رک گئی؟ سکھ آرام ملتے ہی کیوں راہ سے ہٹ گئے؟ اس نظم کے اختتام پر انھوں نے ترقی پسند شاعروں پر طنز بھی کیا ہے جو

www.taemeernews.com

سرکاری سہولتیں ملتے ہی اپنے عمل سے پھر گئے۔ "نئی صف" میں پرویز شاہدی کے بعد ان شعراء کی طرف اشارہ کرتا ہے جنھوں نے سرکاری سہولتوں کی پروا نہیں کی جو ایک شاعر کا فرض ادا کرتے ہوئے اپنی راہ پر گامزن ہیں۔

قیصر شمیم پرویز شاہدی کے ہم عصر موقع پرست شعرا کی شناخت کرتے ہوئے کہتے ہیں :

وہ سائے سائے چلنے والے لوگ تھے
وہ دھوپ دھوپ کی صعوبتیں اٹھاتے کیا
کسی حسین پیڑ کی گھنیری چھاؤں مل گئی
تو راہ میں ٹھہر گئے
سفر تمام ہو گیا
وہ منزل مراد اپنی پا گئے (نئی صف)

قیصر شمیم ایک بے لوث خدمت کرنے والے' قلندرانہ صفت رکھنے والے سچے قلم کار ہیں اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آج کے دور میں جب ہر شاعر جوڑ توڑ کر کے سرکاری و غیر سرکاری انعام اور دوسری سہولتیں حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں' قیصر شمیم ان باتوں سے بے نیازانہ ادب کا کام کرنے میں مصروف ہیں۔ ذاتی مفاد سے انھیں کوئی غرض نہیں۔

مری زبان پہ نہ آیا ضرورتاً بھی کبھی   وہ لفظ جو مرے یاروں کی بول چال میں تھا

وہ اپنے اصولوں کے پکے اور انا پرست شاعر ہیں۔ اپنے محدود وسائل میں اپنی ضرورتوں کو پوری کرتے ہوئے اور تن من دھن سے اپنے اصولوں پر چلتے ہوئے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اپنی غرض کے لیے نہ اردو اکاڈمی کی طرف دیکھتے ہیں جس کی گورننگ باڈی کے وہ ممبر ہیں (نی الحال اکاڈمی کے وائس چیئرمین ہیں) اور نہ رائٹرز ایسوسی ایشن' ہوڑہ کی طرف دیکھتے ہیں جس کے وہ مؤسس ہیں جس میں مخلص ادیبوں اور باذوق لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ نہ انھیں آم کو املی اور ببل کو کیلتھ کہنا پسند ہے اور نہ کبھی ان دروازوں پر دستک دی جو اچھی شاعری کی بجائے مصاحبی کے قدرداں ہیں۔ ہاں ان کا اللہ پر اٹوٹ عقیدہ ہے۔ اس لیے وہ نہایت فخر کے ساتھ مگر نرم لہجے میں فرماتے ہیں :

قیصر خدا کا شکر کہ مفلس ہوں پھر بھی ہوں   ہر صاحب رسوخ کے دربار سے الگ

انھیں خوشامد پسندوں کے دربار سے الگ تھلگ رہ کر سر اٹھا کر اعلیٰ درجے کی تخلیق خلق کرنے میں بھی لوگوں کی ناراضگی کا شکار ہونا پڑا۔ دولت مندوں اور خوشامد مندوں کو ادب سے کیا غرض! فکر و فن سے کیا رغبت!

www.taemeernews.com

انھیں تو ہاں میں ہاں اور ناں میں ناں پسند ہے ایسے لوگوں کے سلوک ناروا سے متاثر ہو کر قیصر شمیم فرماتے ہیں :

قیصر خود اپنی ذات سے کیا کیا نہ تھا مگر　　　سمجھا گیا نہ کچھ بھی وہ اک فرد کے سوا

فہرست ان کے اپنوں کی　　　میں ہمیشہ ہی دوسروں میں تھا

قیصر شمیم اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ جھوٹا غرور انسان کو کور چشم ہی نہیں بناتا بلکہ عمل سے روک دیتا ہے۔قومی شاعر رام دھاری سنگھ "دنکر" کا اشارہ ایسے ہی جھوٹے مغرور اور بے عمل لوگوں کی طرف ہے :

پوجیہ مان کر پوجیہ ماننے میں جو بادھا کرم ہے　　　وہی منوج کا اہنکار ہے وہی منوج کا بھرم ہے

(کورکشیتر)

مغربی بنگال کے اردو میں گیتوں کی پونجی نہیں کے برابر تھی۔قیصر شمیم ہی ایک ایسے کامیاب اور قابل شاعر ہیں جنھوں نے اردو ادب کا دامن مغربی بنگال کی دھرتی پر اپنے گیتوں سے بھر دیا۔سالک لکھنوی صاحب (مغربی بنگال کے صف اول کے شاعر، "آبشار" اردو کے مدیر اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے سابق چیئرمین) نے قیصر شمیم کے بارے میں کہا ہے :

"یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ گیت اچھا لکھتے ہیں یا غزل عمدہ کہتے ہیں۔"

صدی ادب میں پرگاتھا حال کے شاعروں کے اظہار بیان اور جنگجویانہ عمل دونوں ہی مشہور ہے۔ نتیجتاً وہ جنگ کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر سکے۔اس طرح کچھ کیفیت قیصر شمیم کی بھی ہے۔انھوں نے مزدوروں کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ان کے آنسوؤں سے قیصر شمیم کا دامن بھیگا ہے۔لگ بھگ پچاس برسوں میں شاید ہی کوئی ایسا لمحہ گزرا ہو جب انھیں مزدوروں کی دکھ تکلیف کا احساس نہیں ہوا ہو۔

سچ تو یہ ہے ہوڑہ کے شیب پور کا علاقہ کل کارخانوں اور مزدوروں کا علاقہ ہے اور اسی علاقے میں قیصر شمیم کا اپنا گھر ہے۔خدا کی طرف سے انھیں شاعر کا دل،شعر کہنے کی قدرتی صلاحیت اور ایک مخصوص اظہار بیان حاصل ہے۔اس لیے جب وہ کچھ کہتے ہیں تو ان کے اشعار میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کی گونج سنائی دیتی ہے:

بھرم کھلا ہے وہیں کتنے ہی بہاروں کا　　　رہ حیات میں جب بھی کہیں گرا ہوں میں

انھوں نے جہاں نظم "تاش کے پتے" میں مزدوروں اور مالکوں کے رشتے کو گاگر میں ساگر بھرنے کی کوشش کی ہے وہیں نظم "میرا کمرہ" مزدوروں کے گھر کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔اسی طرح "اسپ تازہ شدہ مجروح" میں تیکھا طنز ہے۔

www.taemeernews.com

قیصر شمیم کا ادبی میدان بہت وسیع ہے جس میں انسان زندگی اور کائنات سے تعلق رکھنے والے بے شمار موضوعات اور احساسات بیان کیے گئے ہیں۔ وہ بھارت کی مٹی اور یہاں کی تہذیب سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی نظموں میں جہاں مندروں کے گھنٹے اور مسجدوں کی اذانیں سنائی دیتی ہیں وہاں شری کرشن کی بنسی کی تان بھی سنائی دیتی ہے۔ جہاں شاعر کا یہ عقیدہ ہے کہ اب راون اپنے برے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوگا وہیں گوپیوں کی رنگ بھری پچکاریاں بھی اسے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ وہ جہاں پرویز شاہدی سے موقع پرست شعرا کے اور نئی صف کے شاعروں کے بارے میں اپنی دو باتیں کہتا ہے وہیں بنگلہ شاعر قاضی نذرالاسلام اور منشی پریم چند کے متعلق اپنے جذبات کو شعروں میں ڈھالتا ہے۔ وہ تلسی اور جامی کو بھی یاد کرتا ہے۔ جہاں ان کی نظموں کے عنوان "انتباہ، سرِ راہ، شامِ غم اور اپنے لہو کا حصہ" ہے وہیں "ایمان، آرتی، سندیسہ اور بختی کے دو بول" اور "جیون پتھ پر" بھی ہے۔ اسی طرح قیصر شمیم صاحب نے دونوں تہذیبوں کو قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

میرا مذہب عشق کا مذہب، جس میں کوئی تفریق نہیں　　میرے حلقے میں آتے ہیں تلسی بھی اور جامی بھی

وہاں پر انھیں قدرت حاصل ہے جب کہ آسان زبان استعمال کرنے میں تو شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ نظر آتا ہے اور جب عربی فارسی الفاظ کا استعمال شروع ہوتا ہے تو آخر تک نباہتے ہیں۔ ورنہ ہندی، فارسی، عربی، بنگلہ پر قدرت حاصل ہونے کے سبب ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ قیصر شمیم نے کچھ نئی تراکیب استعمال کی ہیں اور تشبیہات ان کے مشاہدے اور ان کے طرزِ بیان سے خوشنما نظر آتے ہیں۔ قیصر صاحب جیسی شخصیت ہماری زبان کی آبرو کہلانے کی مستحق ہے۔

آگہی گر نہیں ہوتی

کلیم حاذق، صفحہ ۱۴۲

انسان گھٹائے جاتے ہیں سایوں کو بڑھایا جاتا ہے　　دنیا میں ہماری یہ کیسا اندھیرا چھایا جاتا ہے

بقول منیر نیازی، نیوز ایڈیٹر "آزاد ہند" یہ ایک دیرینہ راز ہے کہ شاعر قیصر شمیم کے شاگردوں کی تعداد سو سے ہرگز کم نہیں۔ (سہ ماہی "مژگاں" جولائی تا دسمبر ۲۰۰۲ء) ان کا اسلوب انوکھا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا ان کی خوبی ہے۔ ان کی نظم "آدمی اور آئینہ" اس کی خوبصورت مثال ہے :

دونوں اپنے رب سے پوچھیں

کیا دیکھا ہے

دونوں گونگے بن جائیں

www.taemeernews.com

مشتاق انجم کے والد محترم صابر جمیل فرماتے ہیں :

اللہ فیضِ حضرتِ قیصر شمیم نے

مشتاق جیسے ذرے کو انجم بنا دیا

۲۶ر دسمبر ۲۰۰۴ء دہلی کی روانگی ہمراہ جناب مشتاق انجم، جناب فراغ روہوی، جناب سید حسن، جناب شبیر احمد انجمن ترقی اردو ہند کے ہیڈکوارٹر اردو گھر میں ۲۸ر دسمبر ۲۰۰۴ء کی شام حضرتِ قیصر شمیم کو اعزاز سے نوازا گیا۔ صدارت معروف ناول نگار اور آئی پی ایس جناب پیغام آفاقی نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر قمر رئیس، جناب مظہر امام، شری بھیشم نرائن سنگھ، کئی ریاستوں کے سابق گورنر، مشتاق انجم بعدازاں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اعزازی جلسہ اور ریڈیو اسٹیشن میں پروگرام۔

غــزل

قیصر شمیم

گھر کے کونے میں پڑا ہوں بابا
ایک بوسیدہ ردا ہوں بابا

ساحلی بھر بھر مٹی کی طرح
دم بہ دم ٹوٹ رہا ہوں بابا

اب وہیں ڈوب کے ڈھونڈو مجھ کو
میں جہاں غرق ہوا ہوں بابا

تم پرکھنا تو بتا بھی دینا
میں برا ہوں کہ بھلا ہوں بابا

بند دروازہ ہے کیسے جاؤں
میں بھی کیا کوئی ہوا ہوں بابا

www.taemeernews.com

ایم. کے. اثر
کلکتہ

قیصر شمیم اور ان کی شخصیت

سرزمین بنگال کے اساتذہ کی فہرست میں نظر آنے والی ایک اہم اور ہردل عزیز شخصیت کے مالک حضرت مظہر انصاری کے اس مطلع

مجھ کو کس کس نے کیا قتل بتاؤں کیسے
اپنی عادت ہی نہیں انگلی اٹھاؤں کیسے

کے پیش نظر ادبی شخصیتوں بالخصوص قیصر شمیم صاحب کی شاعرانہ عظمت اور شخصیت پر چند سطور پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، یوں تو ممکن نہیں کہ مقالے میں بیک وقت سبھی حضرات کو شامل کر سکوں لیکن قیصر شمیم صاحب کے فکر و فن اور حیات قلم بند کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا صحیح تجزیہ آپ جیسے اہل فن ہی کریں گے کیوں کہ ایک ہمہ گیر، ہمہ صفت اور پہلو دار شخصیت پر جتنا لکھا جائے کم ہے لیکن یہ المیہ ہے کہ ہم کسی حقدار سے بے اعتنائی برتنے کے خوگر ہو چکے ہیں، مجھے یقین ہے کہ میری اس نحیف آواز پر اہل قلم مثبت ردعمل کے اظہار کے لیے خامہ کو جنبش دیں گے حقیقت یہ کہ میں قیصر شمیم صاحب کو ہوڑہ یا صرف بنگال تک ہی قید کرنے یا کہنے کی بدعت کرنے سے رہا کیوں کہ ہر نئی صبح اپنی پوری توانائی کے ساتھ اپنی نمو چاہتی ہے اور یہ نمو اس کا بنیادی حق ہے، جس طرح نئی سمت کی تلاش و جستجو قلم کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں قیصر شمیم صاحب کی شخصیت اور فن کی تلاش مقصود ہے جو ہمیشہ سے علاقائی تعصب کے شکار رہے ہیں۔ شاید سازشی اذہان کو اس کا علم نہیں کہ تعصب سے فرد کا خاتمہ تو ہو سکتا ہے لیکن فن نہیں، فن کبھی سازشی اذہان کی حد کا قائل نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات سچ ہوتی تو قیصر شمیم صاحب کا فن جو اردو ادب کے شانہ بشانہ آواز دیتا ہوا نظر آ رہا ہے کب کا کسی قبرستان میں دفن ہو چکا ہوتا، حقیقت تو یہ ہے کہ قیصر شمیم صاحب کو دوسرے مستحق اساتذۂ فن کے علاوہ حضرت مظہر انصاری کی طرح ہر مقام پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے معاملہ خواہ بارگاہ ادب کا ہو یا مقام تعلیم کا، چوں کہ حقیقت ایک ایسی شے کا نام ہے جو بظاہر بے آواز تو ہوتی ہے لیکن اس کی خاموشی ہی ایک ایسی کسک ہوتی ہے جو دیکھنے والی انصاف پسند آنکھوں کو متحرک اور خامہ کو سچ اگلنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر غالب کی فکری شناخت

www.taemeernews.com

کرانے میں حالی، داغ کی لے اقبال اور اقبال کے لیے جگن ناتھ آزاد کے خامہ کو زنگ لگ جانا چاہیے تھا۔ لیکن حقیقت کی اس کسک کو ایک زندہ قوم، زندہ زبان کا فنکار ہی محسوس کرسکتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ آنے والے دور میں کل کی نسل بنگال کی اردو شاعری میں نساخ اور وحشت کے بعد سالک لکھنوی، پرویز شاہدی، ابراہیم ہوش، قیصر شمیم، اعزاز افضل اور علقمہ شبلی کے فن کو یقیناً فضیلت کا مقام عطا کرے گی۔ ممکن ہو ہوڑہ کی نئی نسل بھی انھیں بحیثیت بلند مرتبت شاعر، عظیم انسان، شفیق باپ کے علاوہ ان کی شاعرانہ عظمت اور ادبی خدمات کا اعتراف اور اس کے اظہار میں اپنی بصیرت سے ایسے تمام گوشے اور اس سرمائے کو تلاش کرنے کی سعی جمیل کرے گی جس کی ابتدا ساڑھے پانچ فٹ سے نکلتا ہوا قد، گندمی رنگ پاؤں، میں باٹا کمپنی کی معمولی چپل، پائجامے اور کرتے سے سجا ہوا خوبصورت چہرہ، چہرے پر موٹے فریم سے بنا ہوا چشمہ، چشمے سے جھانکتی ہوئی سرخ خوبصورت چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بسا ہوا حسرت ویاس کا سمندر، نزلے کا شکار، عمر کی چودھری میں زلف سے محروم، سر کے چاروں طرف شانے پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی شاعرانہ زلفیں، منھ میں زردہ پان کی گلوریاں دبائے، بائیں ہاتھ میں انگلو سوئز گھڑی، داہنے ہاتھ میں چھتری اٹھائے بائیں جانب کاندھے پر ذمہ داریوں کے بوجھ سے بھرا ہوا کپڑے کا معمولی تھیلا، تھیلے میں چند ادبی و درسی کتابیں اور نئی نسل کے ذہنوں سے نکلی ہوئی غزلوں اور نظموں سے کاغذوں کا ڈھیر جو بغرضِ اصلاح منتظر ہے اور یہ انتظار نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ ہوڑہ سے بذریعہ روٹ نمبر ۵۵ یا A۵۵ یا پھر منی بسوں سے سی۔ ایم۔ او ہائی اسکول کے درمیان رینگتا ہوا کبھی اپایان ریسٹورینٹ اور پھر ریسٹورینٹ سے اسکول اور اسکول سے تھکا ماندہ شام میں منھ بولے والد محترم حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب کے مطب میں چند ساعت ٹھہر کر پھر گھر کی طرف رخ کرنے والے سلسلوں کی مکمل تصویر قیصر شمیم صاحب جن کی پیدائش ۲؍ اپریل ۱۹۳۶ء محلہ انکس ضلع ہوگلی صوبہ مغربی بنگال میں ہوئی۔ آپ کے دادا حضور کا اسم گرامی مصطفےٰ خان تھا۔ مصطفےٰ خان صاحب اپنے شباب کے زمانے میں اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ملک میں چلنے والی سودیشی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ ضلع غازی پور صوبہ اتر پردیش آپ کا وطن تھا لیکن حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ۱۹۱۶ء میں بنگال کا رخ کیا اور یہیں کے ہو کر بھی رہ گئے۔ آپ کی چار اولادیں تھیں۔ قیصر شمیم صاحب کے والد محترم خلد آشیانی عبدالرحیم خان صاحب کا انتقال ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ والدہ محترمہ سکینہ بی بی ۱۹۳۸ء میں داغ مفارقت دے گئی تھیں۔ پھوپھی اسلام النساء صاحبہ کا انتقال ۱۳؍ مئی ۱۹۹۵ء کو ہوا۔ قیصر شمیم صاحب کا خاندان ۸۲ سال سے انکس ضلع ہوگلی میں آباد ہے۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والے مزدور باپ کے بیٹے قیصر شمیم صاحب نے دینی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی لیکن اقبال کی طرح کسی مولوی صاحب سے ابن عربی کی فصوص الحکم نہیں پڑھی جب کہ

www.taemeernews.com

مذہبی معلومات میں اچھی معلومات رکھنے کے باوجود خود کو مذہبی بحثوں سے الگ رکھتے ہیں۔ زمانہ طفلی امریکن گاڑیوں اور ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان گذرا، روزانہ علاقوں کے غریب بچوں کی جھولیوں اور ہاتھوں میں امریکی جھولیوں سے ملنے والی بسکٹ پاؤروٹی اور دوسری خوراک دیکھ کر قیوم خان (قیصر شمیم) کی نظریں بھی ان کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتیں، کبھی ملنے پر خوش تو کبھی نفرت کے معنی تلاش کرتیں، رینگنے والی زندگی کے شب و روز گذرتے رہے۔ اس طرح قیوم خان کا عنوان شباب منتشر اذہان کے درمیان مستقبل کی تلاش میں سرگرداں رہا۔

ہندوستان کی تقسیم کا زمانہ اور اس سے تغیر پزیر معاشرے کی تبدیلی نے قیوم خان کو عمید انکس بننے پر مجبور کیا، ۱۹۴۰ء میں انکس بوائز اسکول میں پرائمری تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے داخل کیے گئے۔ ۱۹۴۵ء میں پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لیا لیکن ملک میں فسادات کی وجہ سے ۱۹۴۶ء میں اسکول چھوڑنا پڑا۔ تین چار سال تک تعلیمی میدان سے الگ رہنے کے باوجود پڑھنے کا شوق اور دوسری جانب بچپن کے ساتھی دل شیر علی اور شمس الدین صاحبان کے بار بار اصرار پر پھر سے تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۴۸ء میں لائبریری قائم کی۔ ۱۹۴۹ء میں گاروایا جوٹ مل ہائی اسکول شیام نگر میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۰ء میں ہوڑہ ضلع ہائی اسکول سے پرائیوٹ ٹسٹ میں بیٹھ کر ٹسٹ اچھے نمبر سے پاس کیا، فائنل امتحان کے لیے روپئے اور فارم بھی جمع ہو گئے لیکن اسی درمیان یہ خبر ملی کہ بورڈ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو شکایت بھیج دی گئی ہے کہ ایک طالب علم قبل از وقت میٹرک کے امتحان میں شریک ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قیصر شمیم صاحب نے اپنے فارم اور روپئے واپس لے لیے۔ اس کے بعد ہوگلی مدرسہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان دے کر فرسٹ ڈویژن اور پورے بورڈ میں سکنڈ پوزیشن حاصل کی جس کی وجہ سے دو سال تک ۲۴ روپئے ماہانہ وظیفہ پانے کے مستحق قرار دیے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں شاعری شروع کی اور سب سے پہلے شمس الہدیٰ (شمس مظفر پوری تلمیذ حضرت محوی لکھنوی) سے تین چار غزلوں پر اصلاح لی۔ ۱۹۵۱ء نثر و تعلیم کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی بار ۱۹۵۱ء میں ایک افسانہ ہفتہ وار پارس دہلی (ایڈیٹر لالہ کرم چند) میں شائع ہوا، اور ایک غزل نما نظم بعنوان ''حالات'' ماہنامہ ''ساگر'' کلکتہ (ایڈیٹر عاجز مونگیری) میں شائع ہوئی۔ ۸ راگست ۱۹۵۱ء میں اپنی پھوپھی زاد بہن نجمہ خاتون کے ساتھ ازدواجی زندگی سے منسلک کیے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں انکس، چاپدانی میں ادبی سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس نے ۱۹۵۳ء میں ادبی سوسائٹی مدرسہ قائم کیا (جواب ہائی مدرسہ بن چکا ہے)۔ ۵۷-۱۹۵۳ء تک پروفیسر عباس علی خان بیخود سے اصلاح لیتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی اصلاح اور استاد عباس علی خان بیخود کے مشفق مشوروں نے قیصر شمیم صاحب کو اعتدال پسندی کا نظریہ اور راہ عطا کی، حقیقت تو یہ ہے کہ آج قیصر شمیم صاحب کی شرافت میں حضرت عباس علی خان بیخود کی جھلک ملتی ہے اور یہ شے

www.taemeernews.com

قیصر شمیم صاحب کو چند روز کی صحبت میں نہیں بلکہ کافی قربت کی وجہ سے اور وجد کے بعد ہی دو عباس پر نصیب ہوئی۔ شاید اس وقت پورے بنگال میں کوئی دوسرا قیصر شمیم نہیں جو یہ اعلیٰ تہذیبی وراثت پیش کر سکے۔ ۱۹۵۴ء میں انکس سے ہوڑہ کا رخ کیا اپنی دوست شمس صابری مرحوم کے مکان میں تین چار ماہ قیام کرنے کے بعد قلم سردار صاحب کے بچوں کو تعلیم دینے کی غرض سے وہیں رہنے لگے۔ اسی سال ۱۹۵۴ء میں بنگال کے مشہور استاد شاعر حضرت غواص قریشی سے متعارف بھی ہوئے دونوں کے درمیان یہ خلوص ہمیشہ رہا۔ درحقیقت ان کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں پروفیسر عباس علی خان بیخود کی تربیت کو بہت دخل حاصل رہا، نیز قیصر شمیم صاحب کی ذہنی تربیت میں بالواسطہ طور پر جن بزرگوں نے حصہ لیا ان میں شمس الہدیٰ شمس مظفر پوری اور پروفیسر پرویز شاہدی صاحب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں سنٹرل کلکتہ کالج سے آئی۔ اے فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں یعنی ۱۹۵٦ء میں ورڈز ورتھ کی مشہور نظم Daffodils سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں نئے رجحانات کے اثرات قبول کئے۔ جون ۱۹۵۷ء کو عمید انکسی سے قیصر شمیم بنے۔ ۱۹۵۷ء تا ۱۵، اپریل ۱۹٦۸ء تک ہوڑہ مسلم ہائی اسکول میں ملازمت کرتے رہے۔ ۵۹-۱۹۵۸ء میں ماہنامہ کہانی کلکتہ کی مجلس ادارت میں شامل کیے گئے۔ ۱۹٦۰ء سے صحافتی زندگی شروع کی۔ روزنامہ "اخوت" کلکتہ میں مترجم کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹٦۴ء میں ایم۔ اے کی تعلیم کے دوران پرویز شاہدی صاحب سے تین چار تخلیقات پر اصلاح لی۔ ۹ مارچ ۱۹٦۴ء کو اولاد نرینہ عرفان الحیات کی پیدائش ہوئی۔ ۱۹٦۲ء میں روزنامہ "آزاد ہند" سے منسلک ہوئے، ہفتہ وار کسان مزدور سے بھی وابستہ رہے لیکن ۱۹٦۸ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر صحافتی زندگی ترک کر دی۔ ۱٦ ر ستمبر ۱۹٦٦ء میں رائٹرس ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی ۱٦۔ اپریل ۱۹٦۸ء میں سی۔ ایم۔ او ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کی۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں پندرہ روزہ "ہوڑہ ٹائمز" کے اعزازی مدیر مقرر ہوئے لیکن مارچ ۱۹۷۱ء میں اس سے الگ ہو گئے۔ اسی سال ۱۹۷۱ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "ساعتوں کا سمندر" شائع ہوا اور اپریل ۱۹۷۱ء ہی میں "ادارۂ فکار" "ضیا برج" کا نام تجویز کرنے پر اس کے سرپرست بنائے گئے۔ ۱۹۷۱ء میں پارٹ ٹائم لکچرر کی حیثیت سے خضر پور کالج سے وابستہ ہوئے اور اس کے بعد ۸۰-۱۹۷۹ء میں پہلے پارٹ ٹائم لکچرر پھر فل ٹائم لکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۷۱ء میں "بک لینڈ" کی بنیاد رکھی اور ۱۹۸۳ء سے میں اپنے پھوپھی زاد بھائی اور برادر نسبتی جناب اشرف علی صاحب کے حوالے کیا۔ ۱۹۸۲ء "ادب اور اسپورٹس" "ضیا برج" کے سرپرست منتخب کیے گئے۔ ۱۹۸۳ء میں "ادبی سنگم" "ضیا برج" کے قیام میں مدد بہم پہنچائی اور سرپرست اعلیٰ بنائے گئے۔ ۱٦ مارچ ۱۹۸٦ء کو آل انڈیا مشاعرہ مونگیر (بہار) میں شرکت کی۔ ۱۹۸٦ء میں ہوڑہ سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ "انکشاف" کی مجلس مشاورت

www.taemeernews.com

میں شامل کیے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں بنگلہ ڈکشنری ترتیب دینے کے لیے مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی جانب سے جن چار اشخاص پر مشتمل بورڈ بنایا گیا تھا ان میں ایک قیصر شمیم صاحب بھی منتخب کیے گئے۔ ۱۹۸٦ء میں شہرنامہ۔ کلکتہ کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ان کے کئی مجموعے ساعتوں کا سمندر، تیری دھارا' سانس کی دھار' اور پہاڑ کاٹتے ہوئے کے علاوہ بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو میری چند مجبوریوں کے تحت شامل مضمون ہونے سے رہ گئیں، اس کا مجھے خود بھی افسوس رہے گا۔ آپ ۲۰۰۰ء میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے نائب چیرمین بنائے گئے۔ آپ سہ ماہی ''ترکش'' کے سرپرست بھی ہیں۔

غــــزل

قیصر شمیم

کتنی صدیوں نے پالا ہے مجھے
تب خلاؤں میں اچھالا ہے مجھے

وقت نے اک روشنی کی چاہ میں
کتنے پردوں سے نکالا ہے مجھے

میری اپنی خواہشوں نے آج تک
نت نئے سانچے میں ڈھالا ہے مجھے

زندگی نے آزمانے کے لیے
آگ میں ہر بار ڈالا ہے مجھے

آگئی تھی لڑکھڑاہٹ پاؤں میں
آندھیوں نے کچھ سنبھالا ہے مجھے

کچھ تو قیصر میرے بارے میں کہو
مدتوں تم نے کھنگالا ہے مجھے

www.taemeernews.com

اشرف احمد جعفری
کلکتہ

قیصر شمیم میری نظر میں

انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے The Fi t Impression is the last impression لیکن میرے سلسلے میں یہ بات بالکل الٹ جاتی ہے کیوں کہ میں نے لوگوں کو اپنے متعلق اکثر و بیشتر منفی رائے قائم کرتے ہوئے پایا ہے جو دیرپا ثابت ہونے کی بجائے کچھ ہی عرصہ میں اس کے برعکس ہو جاتی ہے۔ خود حضرت قیصر شمیم صاحب کے ذہن پر بھی مجھ سے متعلق ابتدائی تاثرات کچھ اچھے نہیں تھے۔ انھیں شروع شروع میں مجھ سے مل کر کچھ بیزاری اور کوفت سی ہونے لگتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قیامِ پورولیا کے دوران انھیں ایک بار جو خط لکھ کر یہ پوچھ لیا تھا کہ اب تو ان کے شاگردوں کی تعداد خیر سے کافی ہو چکی ہوگی جس کا انھوں نے سخت برا مان لیا تھا۔ اس ناراضگی کا اظہار انھوں نے نہ صرف ہمایوں جمیل سے بلکہ براہ راست مجھ سے بھی کیا تھا۔ اگر چہ میں نے ان سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی تھی، پھر بھی ان کے تاثر کو "برعکس" ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔ لہٰذا پورولیا سے کلکتہ تبادلہ ہونے کے بعد پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ظہیر انور صاحب کے روم میں ان سے ملنا ہوا تو انھیں یہ جان کر نہ صرف سخت حیرت ہوئی کہ میں کلکتے میں پیدا ہو کر ابھی تک شیب پور ہوڑہ نہیں پہنچا تھا۔ بلکہ اس بات سے کوفت بھی ہوئی کہ مجھے وہاں تک پہنچنے کا کوئی آئیڈیا بھی نہیں تھا۔ چنانچہ کہنے لگے" بہتر یہی ہوگا کہ میرے کاندھوں پر سوار ہو کر چلے چلیے۔'' اسی دن جب انھیں معلوم ہوا کہ میں نے شعر گوئی چھوڑ دی ہے تو لفظ " آپ" پر زور دیتے ہوئے کہا" بہت ہی اچھا ہوا جو آپ نے اسے چھوڑ دیا۔"

۷۷ فیرس لین میں ان سے پہلی ملاقات ۱۵ رنومبر ۱۹۹۳ء پیر کے دن ہوئی تھی لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کافی مصروف تھے اور یہ معلوم ہوا کہ ان کی یہ مصروفیت عارضی نہیں بلکہ گویا دائمی ہے کیوں کہ شاگردوں کے اشعار پر اصلاح دینا، امتحانوں کے پرچے جانچنا، یونیورسٹی میں کلاسس لینا، ملاقاتیوں سے ملنا، فون پر گفتگو کرنا، غرض یہ کہ ان کے پاس خود اپنے لیے وقت کی سخت قلت تھی۔ جبھی تو مظفر شبلی صاحب ان سے کہتے تھے کہ" آپ دوسروں کو تو شاعر بلکہ صاحب مجموعہ بھی بناتے چلے جا رہے ہیں لیکن اپنی شاعری کی طرف دھیان کیوں نہیں دیتے ہیں۔؟"

www.taemeernews.com

بات سوفی صد درست بھی تھی کیوں کہ "ساعتوں کا سمندر" کے بعد سے ابھی تک خود ان کا ہی کوئی دوسرا شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا اور شبلی صاحب کے احساس دلانے کے بعد شاید اب وہ اپنا وقت خود اپنے مصرف میں لانا چاہتے تھے۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۹۸ء جمعہ کے دن قدرے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہنے بھی لگے" مجھ سے ملنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ اب خود مجھی کو اپنا کام کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔''

اسی طرح ۴ر ستمبر ۱۹۹۸ء جمعہ کے دن دیکھا کہ اپنی پنشن کے تعلق سے ضروری کاغذات جلدی جلدی یکجا کرنے کے ساتھ ساتھ ان غزلوں کو بھی سمیٹ رہے تھے جن پر انھیں اصلاح دینا تھی اور اپنی بھاگ دوڑ والی مصروفیت کا منظر خود دیکھنے والوں کے لیے بھی ایسا حواس باختہ کردینے والا تھا کہ لب کھولنے تک کی جرأت نہیں ہوسکی تھی۔

لہٰذا ان کی ایسی ہی مصروفیتوں کو دیکھتے ہوئے ان سے ملنے میں کچھ ڈر سا لگنے لگتا تھا کہ مبادا ان کی اوقات تلخی کا باعث میں خود بھی نہ بن جاؤں۔ اسی لیے جب بھی ان کے یہاں کسی کام سے جاتا، خواہ بزمِ احباب کا دعوت نامہ لے کر یا کسی اور پروگرام کے کارڈ کے ساتھ تو اسے دروازہ کھولنے والے کے حوالے کرتے ہی لوٹ آتا تھا۔ یہاں تک کہ بزمِ شاکری کی طرف سے رمضانی قصائد پر ہونے والے سیمینار کے سلسلے میں ان سے بھی مقالہ لکھانے کی غرض سے ۸ر دسمبر ۱۹۹۸ء منگل کے دن مواد کے طور پر جب چند قصائد کی زیراکس کاپیاں لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھیں ان کو سونپتے ہی رخصت چاہ لی۔

لیکن میری یہ بڑی دیرینہ خواہش تھی کہ جس طرح سالک لکھنوی صاحب، شاہ مقبول احمد صاحب اور عبدالرؤف صاحب کے یہاں بیٹھ کر گھنٹوں ان کی باتیں سننے کی سعادت حاصل کرتا رہا ہوں، اسی طرح ان کی باتوں سے بھی استفادہ کروں اور اسی لیے مجھے ارشاد آرزو پر بڑا رشک آتا تھا کہ بقول ان کے وہ اپنے اشعار پر اصلاح لینے کی غرض سے قیصر شمیم صاحب کو کسی مسجد میں لے جاتے جہاں کی تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے استاد محترم کا پورا وقت اور پوری توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجایا کرتے تھے۔

میں یہ احتیاط اگرچہ خود ان کی خاطر برت رہا تھا لیکن محسوس کیا کہ مجھ سے متعلق ان کے پہلے تاثر میں اب بتدریج تبدیلی شروع ہوچکی تھی چناں چہ ۱۹ر نومبر ۱۹۹۸ء اتوار کی شام انھیں کی صدارت میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کی شامِ ادب کا جلسہ بیادِ آرزو سہارن پوری منعقد ہوا تو اس موقع پر پڑھے گئے میرے مضمون کے متعلق ۱۲ر اپریل ۱۹۹۶ء جمعہ کے دن نہ صرف اپنے نیک مشوروں سے نوازا بلکہ آرزو صاحب کے مذہب کے بارے میں بھی خاص طور پر تحقیق کرنے کی تاکید بھی کی۔

www.taemeernews.com

۲۶/اپریل ۱۹۹۶ء جمعہ کے دن جب ان کی اہلیہ محترمہ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تو مجھے بھی اپنی پریشانی میں شرکت کا شرف بخشتے ہوئے کہا" اسپتال سے آرہا ہوں اور ایک ضروری کام کی انجام دہی کے بعد پھر وہیں لوٹ جانے کا قصد ہے۔

۱۷/جنوری ۱۹۹۷ء جمعہ کے دن میری پرسش پر ہوڑہ کی اردو صحافت کے متعلق کہنے لگے کہ" عبرت" ۱۹۶۴ء کے بعد بھی شائع ہوا تھا اور ۱۹۷۱ء میں داخل ہوگیا تھا۔ غواص قریشی کی یاد میں" فرقان" نامی مجلوں کی تین ضخیم جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

۲۱/اپریل ۱۹۹۷ء پیر کے دن عاصم شہنواز شبلی کی رہنمائی میں ایونیو نرسنگ ہوم میں جا کر ان کی عیادت کی اور ڈاکٹر کی ممانعت کے سبب ان کی مزاج پرسی کی سعادت تو حاصل کرنے سے قاصر رہا تاہم انھوں نے میرے سلام کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دینے کی زحمت ضرور گوارا فرمائی۔

۴/مئی ۱۹۹۸ء پیر کے دن ڈاکٹر سید حسین احمد زاہدی صاحب کو ان کی اس خواہش پر کہ وہ قیصر شمیم صاحب کا خاکہ کھینچنا چاہتے ہیں جب انھیں قیصر صاحب کے یہاں لے گیا تو کافی مصروفیت کے باوجود ان کو میری یہ جرأت رندانہ ناگوار نہیں گزری بلکہ انھوں نے اپنی نئی کتاب" سائنس کی دھار" کی ایک کاپی مجھے عنایت کر کے میری عزت افزائی فرمائی۔

۷/اگست ۱۹۹۸ء جمعہ کے دن جب سہ ماہی" انبساط" آسنسول مدیر عشرت بے تاب کا گوشۂ الیاس احمد گدی کی ایک کاپی ان کی نذر کی تو انھوں نے نہ صرف اسے قبول فرمایا بلکہ میری اس گذارش پر کہ میں یونیورسٹی میں ان کے کلاس کرنے کا متمنی ہوں۔ انھوں نے بغیر کسی چوں چرا کے فوراً اس کی اجازت بھی دے دی۔

۱۹۹۹ء کے آخری ایام میں جب کتاب اور صاحب کتاب کے موضوع کے تحت اس سال کی تقریباً جملہ مطبوعات کا ایک تذکرہ مرتب کرنا چاہا تو اس ضمن میں منشورات سے متعلق کتابوں پر مجھے مضمون لکھنے کا موقع عطا کیا۔

اسی طرح ۲۰۰۰ء کے ابتدائی حصے میں نہ صرف رائٹرز ایسوسی ایشن کی رکنیت کا شرف بخشا بلکہ یہ قید بھی لگادی کہ میں ہر نماز جمعہ سے قبل مسجد بصراوی جانے سے پہلے ان کے دولت کدے پر ضرور حاضری دیا کروں تاکہ ان سے رابطہ قائم رہے۔

اور پھر یکم مارچ/ ۲۰۰۳ء کے دن مولانا آزاد کالج ہال میں پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب مرحوم کی نئی کتاب" شخصیات و تاثرات" کا اجراء ہوا تو متعدد مقررین کے درمیان انھوں نے ہی اس ناچیز کی ناقص کاوش کو بھی قابل اعتنا گردانا۔

www.taemeernews.com

غرض غور کیا جائے تو یہ ساری باتیں دراصل ان کے بڑے پن پر دلالت کرتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے بڑے پن کی مثالیں صرف میری ذات سے وابستہ نہیں بلکہ بلاتفریق دوسروں کی ذات سے متعلق بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۹۸ء میں جب انھیں مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی جانب سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ سے نوازا گیا تو ۲راپریل ۱۹۹۸ء جمعرات کی شام حلقۂ ادب کی جانب سے خود ان کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کے دوران کہی گئی ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ انھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی اس بار وہی کامیاب ہو رہے ہیں، انھوں نے اکاڈمی کی ایک میٹنگ میں انعام کی رقم بڑھانے کے لیے اشارہ تک نہیں کیا لیکن انعام پانے کے بعد ہی اکاڈمی کے ارباب حل و عقد کے سامنے یہ تجویز فوراً رکھ دی کہ گرانی روزگار کے پیش نظر ایوارڈ کی رقم دس ہزار سے بڑھا کر کم سے کم ۱۵رہزار ضرور کر دی جائے۔

۲۲رنومبر ۱۹۹۸ء اتوار کے دن روزنامہ "اخبار مشرق" میں ڈاکٹر شبیر ابروی کے ذریعہ لیے گئے انٹرویو کے دوران جب شبیر صاحب نے ان سے یہ سوال کیا کہ "آپ اپنے شاگردوں کے نام بتانے کی زحمت گوارا کریں جن کی صلاحیت سے آپ مطمئن ہیں؟" تو انھوں نے جواب میں کہا "میں اپنے بیشتر شاگردوں کو باصلاحیت سمجھتا ہوں اسی لیے ان پر اپنا وقت صرف کرتا ہوں۔"

اور پھر ۲۳رمئی ۲۰۰۴ء اتوار کی شام جب مولانا معصومی صاحب کی جانب سے حکیم سید فیضان احمد صاحب کی رہائش گاہ، ۲۵رپن اسٹریٹ میں بزمِ احباب کا جلسہ منعقد ہوا تو ایک طویل عرصہ بعد انھوں نے بھی اس میں شرکت فرمائی اور اسی دن جب ان کی مسلسل غیر حاضر رہنے کی وجہ جان کر کہ معصومی صاحب سے قبل جلسہ ہائے بزم کے کسی بھی میزبان نے انھیں زبانی طور پر آنے کی دعوت نہیں دی تھی، شبلی صاحب نے انھیں قدرے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ "بزمِ احباب دلوں کو کھولنے کے لیے بنی ہے، بند کرنے کے لیے نہیں۔ یہ مناسب نہیں کہ دل میں کوئی شکایت رکھ کر آپ آنا بند کر دیں۔" تو قیصر شمیم صاحب نے کسی سعادت مند بچے کی طرح ان کی اس سرزنش پر اپنا سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا "آپ نے بحیثیت صدر جو کچھ بھی کہا ہے، اب اس کا پابند رہوں گا۔"

قیصر شمیم صاحب کے بڑے پن کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کو بھی کافی اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آج سے بہت دنوں قبل ہماری زبان کے کسی شمارے میں اقبال کرشن صاحب کا ایک خط، عروض کے موضوع پر شائع ہوا تو اسے پڑھ کر ان کی پوری توجہ اسی طرف مبذول ہوگئی۔ اس کا ایک سبب تو مکتوب نگار کا نام جس میں اقبال بھی ہے اور کرشن بھی اور دوسری طرف یہ حیرت تھی کہ کلکتے کا یہ کون شخص ہے جو عروض جیسے مشکل ترین علم سے اس قدر اچھی خاصی واقفیت رکھتا ہے؟ چناں چہ تجسس بڑھا تو ایک دن شہزاد منظر

www.taemeernews.com

صاحب مرحوم کے ساتھ خود جا کر ان سے ملاقات کی۔

اسی طرح جب حاجی انیس دہلوی مرحوم نے ان سے اپنے کسی خط میں اس بات کی سفارش کی کہ وہ کلکتے کی فاطمی داؤد سحر کو اپنی شاگردی میں لے لیں، تو اس وقت بھی ان کا تجسس جاگ اٹھا کہ آخر یہ لڑکی ہے کون؟ اور ایک دن جب وہ خود ان کے یہاں پہنچ گئیں تو قیصر شمیم صاحب نے پہلے تو انھیں کلکتہ یونیورسٹی کی کوئی طالبہ سمجھا، لیکن پھر فوراً پہچان لیا کیوں کہ کسی رسالے میں ان کی تصویر دیکھ چکے تھے۔

یہاں تک کہ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں نے اپنے نام کے ساتھ "جعفری" کا اضافہ کر لیا ہے تو اس اضافت کی وجہ جاننا بھی انھوں نے ضروری سمجھا۔

دراصل یہ سب ان کی ادبی احساسِ ذمہ داری ہے جس کے تحت وہ مجھ جیسے نوشتوں کو بھی اہمیت دینا لازمی سمجھتے ہیں اور یہی احساسِ ذمہ داری انھیں حق بیانی پر بھی مجبور کر دیتا ہے لہٰذا ۲۱ رستمبر ۱۹۹۷ء اتوار کے دن شیب پور، ہوڑہ میں آنجہانی شانتی رنجن بھٹاچاریہ پر سیمینار ہوا تو اپنی تقریر میں کہنے لگے "شانتی بابو کی مقبولیت میں اگر کمی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق جیسے خشک موضوع کو اپنایا تھا۔ اگر وہ بھی شاعری میں طبع آزمائی کرتے تو انھیں بھی اتنی ہی شہرت حاصل ہوتی جتنی کہ ہم ان کے کارناموں کے پیشِ نظر ان کی مقبولیت کی توقع کرتے ہیں۔"

ایسی ہی حق بیانی کی مثالیں ان کے مضامین اور تبصروں میں بھی ملتی ہیں جن سے ان کے تنقیدی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے مثلاً "سرمایۂ سخنوراں" میں ساگر چاندپوری کے متعلق لکھتے ہیں :

> "اشعار میں تغزل کی لطافت نہ سہی، لیکن شاعر کے مشاہدے کا رنگ اور انسانی دردمندی کا ایک زاویہ ضرور موجود ہے۔"

یا پھر مطرب بلیاوی کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں :

> "مطرب کا کلام مطبوعہ ہو یا غیر مطبوعہ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ ان کے کلام کی دلکشی اور اثر آفرینی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ان کی برسوں پرانی غزلیں بھی تازہ غزلوں کا حکم رکھتی ہیں۔
>
> مطرب ہر قدم پر تہذیبِ غزل کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اور حدیثِ شوق ہو یا روداد جہاں، سب کچھ ایسی زبان میں بیان کرتے ہیں جو کبھی لطف سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کی غزلوں میں جہاں کلاسیکی رچاؤ، زبان کی شستگی اور

www.taemeernews.com

بیان کی دل آفرینی ایک ساتھ مل کر اپنا جادو جگاتی ہیں، وہیں جذبہ کا والہانہ پن اور فکر و خیال کی ندرت جا بجا دامن کشِ دل ہوتی ہے۔"

(مقالہ "سرمایۂ سخنوراں پر ایک نظر")

ذخیرۂ الفاظ پیش کرنے کی دھن میں مرتب نے بہت سے ادق اور نامانوس الفاظ کتاب میں شامل کر لیے ہیں جو حرف شناسی کی منزل میں بچوں کے ذہن پر خوش گوار اثر نہیں ڈال سکتے۔

کتاب میں شامل الفاظ کے اعراب پر بھی پوری توجہ نہیں دی گئی ہے لہٰذا بعض الفاظ غلط اعراب کے ساتھ چھپ گئے ہیں جن میں سطر، صحن، وزن، ظہر، سحری، صوم، صحرا وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں شہاب ثاقب کے معنوں میں صرف ثاقب استعمال کیا گیا ہے۔ پھر عربی لفظ ثوب کے ساتھ رسی کی تصویر دی گئی ہے گویا ثوب کے معنی رسی کے ہیں جب کہ یہ لفظ بمعنی کپڑا مستعمل ہیں۔ اسی طرح زال کے تحت ایک ایسے نوجوان پہلوان کی تصویر دی گئی ہے جس کے تمام بال سیاہ ہیں جب کہ زال نام تھا رستم کے باپ کا جس کے پیدائشی بال سب سفید تھے اور اسی لیے اس لفظ سے مراد بوڑھی عورت یا بوڑھا مرد لیتے ہیں۔ کتاب میں یہ لفظ نہ جانے کیوں زائے معجمہ (ز) کے بجائے زائے فارسی (ژ) سے لکھا گیا ہے۔

(تبصرہ بر اعجاز ابتدائی، مرتب عطاالرحمٰن ناشاد، مطبوعہ سہ ماہی روحِ ادب، مدیر محمد نظام الدین، بابت جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء ص ۱۵۸)

رنگ کا حصۂ نثر خصوصاً افسانوں کا حصہ بہت تشنہ ہے۔ افسانے کے ذیل میں جو دو تحریریں نظر آتی ہیں ان میں ایک تو شوکت احمد کے ناول "ندی" کا ایک باب، اور دوسری تحریر نریندر ناگ دیو کی ایک ہندی تخلیق کا ترجمہ ہے جس کے بعد یہ خانہ بالکل خالی ہے۔ ایک مشہور افسانہ نگار کی یاد میں جاری ہونے والے رسالے میں طبع زاد افسانوں کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔"

(تبصرہ بر سہ ماہی رنگ، دھنباد، پہلا شمارہ بیادِ غیاث احمد گدی، مدیران شان بھارتی اور آمر صدیقی، مطبوعہ سہ ماہی دستک، ہوڑہ، مدیر عزیز شمیم، بابت جنوری تا مارچ ۱۹۹۴ء)

www.taemeernews.com

"ان اشعار سے ایک ایسے شاعر کا چہرہ ابھرتا ہے جو اپنی خودداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، جو مصلحت پسندی کے ہر موسم کا مخالف ہے اور یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ پورے شہر میں اس کے خلاف بدگمانی کی ایک فضا قائم ہو چکی ہے، نہ کبھی اپنی بے باکی وصاف گوئی کو ترک کرتا اور نہ کسی مصالحت یا سمجھوتے کے لیے کبھی تیار ہوتا ہے اور بات اگر حاکمِ اعلیٰ تک پہنچتی ہے تو اسے بھی خاطر میں نہیں لاتا اور سرتابی کی سزا سے خائف ہونے کی بجائے اپنی خودسری پر ناز کرتا ہے کیوں کہ یہی خودسری بڑی سے بڑی طاقت کے آگے بھی اس کی جبیں کو سجدہ ریز ہونے سے باز رکھتی ہے۔"

(تبصرہ برکتاب "سمندر، خلاف رہتا ہے" شاعر خورشید اکبر، مطبوعہ سہ ماہی اثبات و نفی، کلکتہ مدیر عاصم شہنواز شبلی، مورخہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء)

لیکن اسی شاعر کے متعلق وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "سمندر خلاف رہتا ہے" میں محاسن زیادہ ہیں اور معائب کم مگر جتنے بھی ہیں ان میں بعض ایسے ہیں جو بہت نمایاں ہیں۔ اور اس ضمن میں انھوں نے گرچہ پوری ۲۵ مثالیں دی ہیں تاہم مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق یہاں صرف چند ہی نمونے پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں :

(الف) بڑا خود سر ہے مظلوی قبیلہ

(یہاں مظلوی غلط ہے، کیا وزن پورا کرنے کے لیے بجائے مظلوم کے مظلوی لایا گیا ہے؟)

(ب)

فصیلِ شہر پر آیت لہو کی — قرآنِ درد کی تفسیر گم صم

(ج)

نوابِ شہر کو لبریز قہقہہ [illegible] — رگیں نچوڑ کے جذبہ انھیں چکا دینا

(ان اشعار میں قرآن (مفعول) کو قران (فعول) اور نواب (مفعول) کو نواب (فعول) باندھا گیا ہے جس کی وجہ سے متعلقہ مصرعے خارج از بحر ہو گئے ہیں۔)

(د)

فضا میں دو پنچھی کا کھو جانا — بالکل میرے تیرے جیسا لگتا ہے

(دو پنچھیوں کا کی بجائے دو پنچھی کا کیوں؟)

www.taemeernews.com

صبح کی پہلی اذاں تعبیر کس کی ہوگئی

(صبح کی اذان تو پہلی اذان ہی ہوتی ہے پھر صبح کی اذان نہ کہہ کر صبح کی پہلی اذان کہنے کی ضرورت کیوں آگئی؟)

ان مثالوں سے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کے رشحاتِ قلم سے نہ صرف ان کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کا یہ شعور الفاظ و محاورات کے صحیح استعمال، قواعد و عروض سے کماحقہٗ واقفیت اور غیر متعلقانہ باتوں کی گرفت کرنا بھی خوب جانتا ہے لیکن چوں کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے سبب انھیں مضامین یا تبصرے لکھنے کی مہلت کم ہی ملتی ہے لہٰذا وہ اس کی کو اپنی تقریروں سے پوری کر لیتے ہیں۔

یہاں تقریر کے لفظ سے میرے شعور کی رو بھٹکتے ہوئے پہلے تو منور رانا صاحب کے ایک مضمون کی طرف چلی جا رہی ہے جس میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "قیصر شمیم صاحب کے پتلے دبلے شاگرد ہوا میں مار کرنے والے لڑاکو جہاز ہیں۔" منور رانا کا اشارہ ان کے کن شاگردوں کی طرف ہے یہ تو مجھے نہیں معلوم البتہ میرے شعور کی رو وہاں سے ناچلے کھاتی ہوئی ایک شام اسلم لکھنوی صاحب کی دکان کے باہر ضرور پہنچ جاتی ہے جہاں ایک مشہور "پتلے دبلے" شاعر نے پہلے تو کلکتہ کے ایک حلیم الطبع استاد شاعر کی تقریر کو پھسپھسی قرار دیا، پھر پتہ نہیں کیوں دوسرے استاد شاعر کے اندازِ تقریر کے سلسلے میں کچھ یوں ارشاد فرمایا تھا کہ "تقریروں کو محض کرکٹ کی اصطلاحوں کے ذریعہ موثر نہیں بنایا جا سکتا ہے۔" اور پھر آخر میں کہنے لگے "پورے بنگال میں صرف ایک ہی شخص ہے جو کسی بھی موضوع پر گھنٹوں اور برمحل بول سکتا ہے اور وہ شخص وہی ہے جس کے خاندان سے ہم لوگ وابستہ ہیں یعنی استادِ محترم قیصر شمیم صاحب۔"

ان شاعر صاحب نے کن استادوں کی تقریروں کو "پھسپھسی" اور "غیر موثر" بتایا تھا یہ تو میں نہیں جانتا لیکن حضرتِ قیصر شمیم صاحب کی تقاریر کی افادیت سے انکار بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ بلاشبہ ان کی تقریروں میں دم ہوتا ہے جن سے ان کی ناقدانہ بصیرت کا پتہ چلنے کے ساتھ ساتھ سامعین کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے مثلاً:

۱۹ر نومبر ۱۹۹۵ء اتوار کے دن مسلم انسٹی ٹیوٹ کی شامِ ادب کی تقریب بیادِ آرزو سہارن پوری کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

> "ایک شاعر جو ہمیشہ نہیں تو طویل مدت تک محرومِ توجہ رہا ہے۔ آج یکایک اتنے برسوں کے بعد اس کی ۔۔ت اور ان کے فنی کارناموں سے متعلق لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کر کے ایک بڑا ادبی فریضہ انجام دیا ہے لیکن کسی

www.taemeernews.com

بھی شاعر کی زندگی سے زیادہ اس کے کارناموں پر روشنی ڈالنی چاہیے اور آرزو صاحب تو واقفِ تصوف ہی نہیں بلکہ وقفِ تصوف بھی تھے۔"

پھر سامعین کی معلومات میں اس طرح اضافہ کیا کہ انجم عظیم آبادی نے دورانِ نقابت جب ایک بار آرزو صاحب کا یہ مصرعہ پڑھا :

وہ رند ساغر و مینا کا لطف کیا جانے

تو قیصر شمیم صاحب نے بڑے ہی اعتماد کے ساتھ بتایا کہ "اصل لفظ لطف نہیں ہے فرق ہے" اور جب انجم صاحب نے کہا "لیکن کتاب میں تو یہی درج ہے تو جواب ملا" ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ صاحب مرحوم کو نوٹ کرنے میں بھول ہوگئی تھی۔"

۲۷ر ستمبر ۱۹۹۷ء سنیچر کے دن مسلم انسٹی ٹیوٹ کے نیاز احمد خاں آڈیٹوریم میں سہ ماہی "دستک" ہوڑہ کے پانچویں شمارے کی تقریب رونمائی تھی۔ صدارت کرتے ہوئے کہا :

"رسالے چھپتے چھپتے اپنا مزاج بناتے ہیں، اپنی روش بناتے ہیں، لیکن دستک نے پانچویں شمارے سے ہی اپنا ایک مزاج بنالیا ہے۔ اپنی ایک روش بنالی ہے۔ دستک اور اثبات ونفی کی اشاعت کا اتنا اچھا اثر ہوا ہے کہ آسنسول سے بھی دوماہی رسالہ "زیرِ لب" اور سہ ماہی "انبساط" کی اشاعت کی شروعات ہوگئی۔

اس شمارے میں چودھری جاوید ارشد کی پی ایچ. ڈی کا مقالہ بھی شامل ہے۔ جس پر بعض لوگوں کو اعتراض ہوا تھا کہ رسالے میں تھیسس شائع کرنے کی کیا تک ہے۔ چنانچہ حاضرینِ جلسہ کے ساتھ ساتھ معترضین کی معلومات میں بھی اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ ہندستان ہی کے ایک رسالے نے ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتہ خاتون ناول نگار مہاشویتا دیوی کے پورے ناول کو شائع کردیا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں ان کے جواب کی بھرپور تائید کی تھی کہ میرے ناقص علم کے مطابق بھی ماہنامہ "مریم" لکھنؤ مدیر نسیم انہونوی اپنے رسالہ میں اپنے علاوہ دوسروں کے بھی پورے پورے ناول کی اشاعت فرمادیا کرتے تھے۔

۳۰ر جون ۱۹۹۸ء منگل کی شام مسلم انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں نوشاد نوری اور صلاح الدین پرویز کو اعزاز دیا گیا تو اس موقع پر قیصر شمیم صاحب کی صدارتی تقریر اتنی اچھی ہوئی کہ میں ہاتھ میں قلم تھامے سامعے

www.taemeernews.com

سنتے ہی محو ہو کر رہ گیا۔ افسوس کہ اس وقت میرے پاس ٹیپ نہیں تھا ورنہ پوری تقریر صدا بند کر لیتا جس میں انھوں نے بالخصوص صلاح الدین پرویز کی شاعری پر اتنا کامیاب اور پُر مغز تبصرہ کیا تھا کہ جب وہ دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہوئے تو صلاح الدین پرویز نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کھڑے ہو کر بڑے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔

۲۹ راگست ۱۹۹۹ء اتوار کے دن مسلم انسٹی ٹیوٹ کی شامِ ادب کے جلسہ بیادگار جوہر غازی پوری میں بحیثیت صدر بڑی موثر بات کہی کہ جوہر صاحب پر جتنے بھی مضامین پڑھے گئے، وہ سب کے سب اہلِ ہوڑہ کے قلم کاروں کے لکھے ہوئے تھے۔ مرکزی کلکتہ جہاں یہ پروگرام ہو رہا ہے یہاں کے کسی بھی صاحب قلم نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ لہٰذا کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ تقریب یہاں کی بجائے ہوڑے میں منعقد کی جاتی ہے۔

پھر کہنے لگے کہ ۱۹۵۴ء کے دوران جب وہ ہوڑہ آکر بسے تو اس وقت یہاں کے سرآلِ شعراء میں غواص قریشی، آرزو سہارن پوری اور جوہر غازی پوری کے نام شامل تھے۔ ان کے علاوہ دیگر اہلِ قلم کے کارناموں کو محفوظ کرنے کے لیے بہت پہلے طے پایا تھا کہ ہوڑے کی اردو ادبی تاریخ مرتب کی جائے جس کے لیے مختلف علاقوں کے مختلف اشخاص کا انتخاب بھی ہوا لیکن کام ہنوز آگے نہیں بڑھ پایا۔

۱۲ ر ستمبر ۱۹۹۹ء کی شام ظہیر انور صاحب کا سفرنامۂ پاکستان "عرضِ تمنا" کی تقریب رونمائی کی صدارتی تقریر کے دوران کہا :

> "مجھے ظہیر انور عزیز ہیں، ان کا قلم عزیز ہے، ان کا ذہن عزیز ہے کیوں کہ سفرنامہ اور خودنوشت سوانحِ حیات میں بڑی گنجائش ہوتی ہے کہ آپ اپنے کو پیش کریں لیکن ظہیر انور نے اپنے آپ کو اس سفرنامے میں پروجیکٹ نہیں کیا اور بین السطور میں بہت کچھ کہہ گئے۔ وہ اپنے ظاہر کو سامنے نہیں لاتے مگر اپنے باطن کو سامنے لے آتے ہیں۔ وہ جذبہ سامنے ہے، وہ پاکیزگی ظاہر ہے جو سب کو ایک ساتھ بہالے جاتا ہے، بہت دردمند ہے یہ باطن، بہت انسانیت نواز ہے یہ باطن اور سچ پوچھیے تو بہت آفاقی ہے یہ باطن۔"

اسی مسلم انسٹی ٹیوٹ ہی میں ۳۱ ر مارچ ۲۰۰۰ء جمعہ کے دن یہاں کے نیاز احمد خان ہال میں ڈاکٹر عذرا رعنا عثمانی کی کتاب "اردو مثنوی میں نسوانی کردار" کا اجراء، ۲۱ راپریل ۲۰۰۰ء جمعہ کے دن، ایک شام نصر غزالی کے نام اور ۳۰ ر ستمبر ۲۰۰۰ء سنیچر کے دن محسن باعشن حسرت کی کتاب "بچے پھول ہوتے ہیں" کی رسم

www.taemeernews.com

رونمائی میں بھی انھوں نے اپنی تقریروں کے جوہر دکھائے لیکن ۳۰ر دسمبر ۲۰۰۱ء اتوار کے دن سہ ماہی "دستخط" بارک پور کے "رباعی نمبر" کی تقریب اجراء کی صدارتی تقریر میں بڑی اچھی بات کہی کہ جب ماہیا اور ہائیکو وغیرہ جیسے اصناف ادب پر طبع آزمائی ہو رہی ہے تو رباعی پر کیوں نہ ہو جو ہمارے ادب کی بہت ہی پرانی صنف ہے۔ یاس پرستوں کی طرح یہ مت سوچیے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے بلکہ یہ دیکھیے کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔"

اور پھر جون ۲۰۰۲ء میں بمقام شیب پور ہوڑہ، حلقۂ سخنوراں کی پہلی اشاعتی کاوش "سرمایۂ سخنوراں" کے اجراء کے موقع پر ایسی تقریر کی کہ کتاب سے متعلق جتنے بھی سوالات ذہن میں اٹھ سکتے تھے ان کے جواب بڑی وضاحت کے ساتھ پہلے ہی دے دیے۔ مثلاً خود میرے ہی ذہن میں یہ بات اٹھی تھی کہ بزمِ اربابِ ادب والوں نے بھی اپنے ادارے کی طرف سے "غزالانِ سخن" کے زیرِ عنوان ایک کتاب چھاپی تھی جس میں اس ادارے کے نہ صرف پورے ایک سو طرحی مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلیں شامل ہیں بلکہ اس کے ممبروں کا مختصر تذکرہ بھی مرتب کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کی اشاعت سے متعلق ایک معقول اور منطقی وجہ سمجھ میں آتی ہے لیکن یہاں ادارے کے قیام کو محض دو ہی سال گزرے ہیں کہ کتاب شائع کر دی گئی اور وہ بھی فقط گیارہ شاعروں کے کلام کا انتخاب جن میں ساگر چاپدانوی اور مطرب بلیاوی کے اشعار پہلے ہی سے مطبوعہ ہیں۔

لیکن قیصر شمیم صاحب کی تقریر سے معلوم ہوا شعرا کی تخصیص اس لیے رکھی گئی کہ سب حلقۂ سخنوراں کے ممبران ہیں۔ دوم سو نشستیں یا سو شعراء کے ہونے کا انتظار کب نو من تیل ہوگا اور کب رادھا ناچے گی والا معاملہ ہو جاتا لہٰذا نیک کام میں دیر نہیں کے مصداق کتاب چھاپ دی گئی اور بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپی گئی۔ سوم ساگر چاپدانوی اور مطرب بلیاوی کی غزلوں کے متعلق تو انھوں نے کتاب میں موجود اپنے مقالہ بعنوان "سرمایۂ سخنوراں پر ایک نظر" میں تحریری طور پر وضاحت کر دی ہے کہ "سرمایۂ سخنوراں" میں ساگر چاپدانوی سب سے پرانے شاعر ہیں لیکن ...... ان کی ...... وہی غزلیں مجموعے میں شامل کی گئیں ہیں جو ان کی وفات کے بعد فوری طور پر بعض اخبارات اور رسائل سے حاصل کی جا سکی ہیں۔" اور مطرب بلیاوی صاحب کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "مطبوعہ کلام شامل کرنے کا سبب غالباً یہ ہے کہ مطرب اپنا نیا مجموعہ ترتیب دے رہے ہیں جس کی وجہ سے انھیں اپنی تازہ غزلوں کی اشاعت سے فی الحال گریز ہے۔"

اسی طرح ذاتی ملاقاتوں کے دوران انھوں نے متعدد بار اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ تقریبات کی رپورٹیں حتی الامکان تفصیل کے ساتھ قلم بند کی جائیں کیوں کہ یہ رپورٹیں بھی مستقبل میں تاریخ مرتب کرتے وقت

www.taemeernews.com

کافی ممد و ثابت ہوں گی۔

اور پھر اپنی کتاب " سائنس کی دھار" کے جواز میں اگر چہ اپنے متعلق لکھتے ہیں تاہم آفاقیت صاف جھلکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ

"ادب کی دنیا میں جانی پہچانی آوازیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش
ر، اوردوسری آوازوں کی طرف سے کان بند رکھنا نہ مناسب ہوتا ہے نہ مفید۔"

لیکن میں یہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ ان ساری سنجیدہ باتوں کے سبب کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ حضرت قیصر شمیم کوئی خشک مزاج مولوی صاحب ہیں، نماز تو وہ بے شک پڑھتے ہیں لیکن ان کی طبیعت میں ظرافت کی چاشنی بھی ہے جو ان کی روزمرہ کی گفتگو سے کم لیکن ان کی تقریروں سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے اور یہ حصہ عموماً ان کی تقاریر کی تمہید سے تعلق رکھتا ہے مثلاً ۲راپریل ۱۹۹۸ء جمعہ کی شام مسلم انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں حلقۂ ادب والوں نے انھیں مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا ملیح آبادی ایوارڈ پانے کی خوشی میں استقبالیہ دیا جو دراصل ان کے جنم دن کی تاریخ بھی تھی تو انھوں نے اپنی تقریر میں کہا :

"میری زندگی آج باسٹھ سال کی ہوگئی ہے۔ لوگ کچھ کہتے ہیں آدمی
جب ساٹھ سال کا ہو جاتا ہے تو سٹھیا جاتا ہے، میں تو بسٹھیا گیا ہوں۔"

۱۲ردسمبر ۱۹۹۹ء کے دن " ایک عرضِ تمنا" کے اجرا کی تقریب میں ارشاد ہوا :

"انسانی فطرت ہے کہ آدمی تعریف سن کر خوش ہو جاتا ہے مگر میں
شرمندہ ہوں۔ اتنی باتیں سنتے سنتے میں تو داد دیتا ہوں آپ کے صبر کی۔ آپ لوگوں
نے احتجاج کیا نہ ہی واک آؤٹ کیا۔"

۴رنومبر ۱۹۹۹ء جمعرات کی شام " تحریریں بولتی ہیں" کے اجرا کے موقع پر جب احمد سلیم صاحب نے نقابت کے فرائض انجام دیتے ہوئے انھیں زحمت تقریر دینے سے قبل کہا " میں اپنے فن کو آخر شب تک لے آیا ہوں۔ آپ آجائیں کہ صبح ہو جائے۔" تو انھوں نے آتے ہی کہا " آج کے جلسے میں اتنے سوالات اٹھائے گئے ہیں کہ اگر ان کے جوابات تلاش کیے جائیں تو واقعی صبح ہو جائے گی۔"

۳۰رستمبر ۲۰۰۰ء سنیچر کی شام " بچے پھول ہوتے ہیں" کے اجرا کی تقریب کے صدارتی خطبے کی تمہید میں کہا " سب سے اچھا ہوا کہ دروازہ بند کر دیا گیا ورنہ باری باری سب لوگ باہر نکل جاتے۔"

اور ۲۷رجنوری ۲۰۰۲ء اتوار کے دن رائٹرز ایسوسی ایشن کی طرف سے بوٹانیکل گارڈن میں پکنک

www.taemeernews.com

اہتمام کیا گیا تو اس میں جاوید دانش نے اپنی نظم "سب وے" سنائی جس کا مطلع تھا :

شہر بدن گلزار ہے بابا من مندر بیمار ہے بابا

مشتاق انجم صاحب نے داد دی تو فیروز مرزا نے فراغ روہوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ انھوں نے ہی جاوید دانش کو یہاں لایا"

ان کے سر دستار ہے بابا

اسی وقت قیصر شمیم صاحب جو کسی کام رک جانے کے سبب کافی دیر بعد تشریف لائے تھے، نظر آئے، انھیں دیکھتے ہی مطرب بلیاوی صاحب نے کہا :

وقت بڑا ہشیار ہے بابا

اور پھر قیصر شمیم صاحب نے جب کلام سنانے کے لیے زور دینے کے بعد بھی فوری طور پر کوئی شعر یاد نہیں کر پائے تو اسی انداز میں کہا :

ذہن ابھی بے کار ہے بابا

مطلب یہ ہے کہ ژرف بینی، دوررسی اور معاملہ فہمی کے ساتھ ساتھ ظرافت کی بھی یہ ساری خوبیاں گویا آدمی میں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں جب وہ اپنے ذہن کی ساری کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رکھے اور اس کے مطالعے کا اشہب رواں بھی تھکنے نہ پائے۔ پس ظاہر ہوا کہ قیصر شمیم صاحب ان ساری صنعتوں سے متصف ہیں اور اس ضمن کوئی دورائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

یہاں بالخصوص ان کی معاملہ فہمی سے متعلق مزید چند مثالیں پیش کرتا ہوں کیوں کہ ان کی وساطت سے ان کی شرافت، تہذیب اور شائستہ مزاجی کا بھی پتہ چلتا ہے یعنی ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۸ء اتوار کی رات گیارہ بجے حاوید نہال صاحب انتقال کر گئے۔ دوسرے دن میت میں قیصر شمیم صاحب بھی شامل تھے۔ اسی دن مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی طرف سے غالب کے دوسو سالہ جشنِ ولادت کے سلسلے میں سہ روزہ تقریبات کا افتتاح بھی تھا۔ چنانچہ عصر بعد قبرستان سے سیدھے اکاڈمی پہنچے، پروگرام کے شروع ہونے میں قدرے تاخیر تھی۔ وہ ڈائمنڈ ہوٹل کی طرف بڑھے جہاں میرے ساتھ شہود عالم آفاقی مرحوم اور مستقیم احمد سکندر پہلے سے موجود تھے۔ ہم نے انھیں آواز دی تو سمجھ گئے چائے پلائی جائے گی۔ لہٰذا ہوٹل میں داخل ہوتے ہی پان کی گلوری منہ میں رکھ لی اور اس طرح بڑی خوش اسلوبی اور شائستگی کے ساتھ ہماری چائے کی دعوت میں شرکت سے بھی معذرت چاہ لی۔

۱۶ر دسمبر ۱۹۹۸ء بدھ کی شام اردو اکاڈمی کی غالب تقریبات کا آخری پروگرام یعنی مشاعرہ تھا۔

www.taemeernews.com

قیصر شمیم صاحب نے غزل کا مطلع سنانے سے قبل جسٹس خواجہ محمد یوسف صاحب کو مخاطب کیا اور کہا :

پر تعصب عدلیے کا فیصلہ بے کار ہے آئینے میں گرد ہو تو آئینہ بے کار ہے

شعر سن کر سامعین میں سے کسی نے کچھ ایسی بات کہہ دی کہ قیصر شمیم صاحب نے فوراً کہا" میں نے خواجہ صاحب کو مخاطب ضرور کیا تھا لیکن یہ شعر ان سے منسوب نہ کیجیے گا۔"

اور پھر ۲۷ر جنوری ۲۰۰۲ء بروز اتوار رائٹرز ایسوسی ایشن کے پکنک کے دن جب وہ کافی دیر سے پہنچے تو صدر مشاعرہ نے بھی اپنا کلام سنا دیا تھا۔ لہٰذا جب لوگوں نے ان سے بھی کلام پیش کرنے کی فرمائش کی تو کہنے لگے:

" روایت شکنی اچھی بات سہی لیکن جو مستحسن روایت ہے اس کی شکنی
نہیں کرنی چاہیے، اسی لیے جاوید دانش کے بعد اس نشست کا خاتمہ ہو گیا۔ اب
ایک فاضل آدمی کی حیثیت سے خود کو پیش نہیں کر سکتا ہوں۔"

یہاں خود کو" فاضل آدمی" کہنا دراصل ان کی خاکسارانہ طبیعت کی غمازی کرتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ خاکساری کی یہ صفت بھی ان کی شخصیت کا ایک جزو لاینفک قرار پاتی ہے۔ لیکن اس خاکساری سے ان کی انا فراموشی نہیں بلکہ عرفانِ ذات کا پتہ چلتا ہے، جھک کر ملنا ان کی سرشت ہے لیکن وہ اتنے بھی نہیں جھکتے ہیں کہ انھیں جھکا کر ہی رکھ دیا جائے۔ دراصل ان کی خاکساری، خودداری سے عاری نہیں۔ یہی وجہ ہے وہ کبھی تو اپنے پاس پڑوس کے شاعر و ادیب کے نام دعوت نامے پہنچوا دینے کے لیے خود قبول کر لیتے ہیں اور کبھی کوئی صاحب کتاب اردو اکاڈمی جا کر اپنی کتاب ان کی نذر کرنا چاہتا ہے تو شرفِ قبولیت بخشنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ" بھائی! اکاڈمی میرے گھر کا پتہ نہیں ہے۔"

اسی طرح وہ ان لوگوں کے جیسے بے جا خاکساری کا مظاہرہ بھی نہیں کرتے جو اپنی کتابوں میں اپنے متعلق کچھ بھی لکھنے کو خود ستائی پر محمول سمجھ کر اس سے گریز کرتے ہیں اور اس طرح مستقبل کے محققین کے لیے دردِ سر بنتے ہیں۔ قیصر شمیم صاحب میں چوں کہ ایسی انکساری کا مرض نہیں، لہٰذا انھوں نے اپنی کتابوں میں اپنے متعلق اچھی خاصی جانکاری فراہم کر دی ہیں مثلاً" ساعتوں کا سمندر" میں کہتے ہیں :

" پہلی بار دس گیارہ سال کی عمر میں باقاعدہ ۱۹۵۱ء سے تخلیقات کی
اشاعت اب تک" صبا" حیدرآباد،" کتاب" لکھنؤ،" تحریک" دہلی،" شب خوں"
الہ آباد،" شاعر" بمبئی،" آج کل" دہلی،" آیات" کلکتہ،" شاخسار" کٹک اور" ا "
کلکتہ وغیرہ میں۔

www.taemeernews.com

میری شاعری نہ آبا واجداد کا ورثہ ہے نہ استادوں کا عطیہ۔ شاعری میرا پیشہ بھی نہیں اور سنڈے پینٹرز کی طرح روز کا مشغلہ بھی نہیں۔ میرے نزدیک شاعری ساعتوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کے عمل سے ملتا جلتا عمل ہے لیکن سخت تر اور لطیف۔"

"سانس کی دھار" کے جواز میں لکھتے ہیں :

"مجھے اعتراف ہے کہ میری شاعری نہ میری ذات سے کبھی جدا رہی نہ میری حیات سے، نہ معاشرے سے نہ کائنات سے۔ گذشتہ چالیس پینتالیس سال کے دوران میرے ذہن و دل کو ہوائے وقت کی مسرت انگیز لہریں کم اور ایذا رساں تھپیڑے زیادہ متاثر کرتے رہے ہیں چنانچہ اس مدت میں قدم قدم پر میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے اسے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے لیکن میں نے یہ کوشش اپنے خول میں بند رہ کر اطمینان کی سانس لینے والے فرد کی طرح نہیں کی بلکہ اس انسان کی طرح کی ہے جو برسوں سے ایک ساتھ کئی خانوں میں بٹا ہوا ہے اور چاہتے ہوئے بھی جس کی توجہ مسلسل ایک خانے پر نہیں رہنے پاتی خواہ وہ نہاں خانہ دل ہی کیوں نہ ہو۔"

اور "پہاڑ کاٹتے ہوئے" میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں کہ :

"مجھے یاد ہے کہ کالج کے دنوں ہی میں، میں کلکتے کی انجمن ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی کے قریب آ گیا تھا اور دونوں کے جلسوں میں شرکت کرتا ۔ان جلسوں کے علاوہ ترقی پسند ادب کے مطالعہ نے ادب، زندگی اور سماج کے رشتوں اور ان رشتوں کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ذہن میں وقتاً فوقتاً ابھرنے والے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کے لیے ایک نئی راہ دکھائی تھی، لیکن اس زمانے میں بھی کسی نظریے کے دیوتا کو خوش کرنے کے لیے ادب کے حسن اور اظہار کی آزادی کو بھینٹ چڑھانا پسند نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس، ادب میں مقصدیت اور افادیت کے درمیان نیز اجتماعیت و انفرادیت کے درمیان معقول تناسب و توازن کا خیال رکھنا مجھے زیادہ پسند تھا۔

www.taemeernews.com

اپنے اسی ذہنی رویے کے ساتھ میں نے ہمیشہ ادب کے نئے نئے رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور ان میں ادب و زندگی کے لیے مجھے جو کچھ قابلِ قبول نظر آیا ہے، اس کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔"

اسی طرح ذاتی ملاقاتوں کے دوران بھی وہ اپنے متعلق کچھ بتانے سے گریز نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات تو بر سبیل تذکرہ بھی بہت سی باتیں بتا جاتے ہیں جیسے :

"بزرگوں کا کہنا ہے کہ مجھے بچپن سے ہی تعلیم حاصل کرنے کا اتنا شوق تھا کہ محلے کے بچوں کے ساتھ خود بھی انگس بوائز پرائمری اسکول میں جا کر بنا داخلہ لیے بیٹھ جایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جب امتحان کا وقت آ گیا تو جب کہیں جا کر ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی میری حقیقت معلوم ہوئی چنانچہ انھوں نے میرے والد عبدالرحیم خان صاحب کو بلا کر تعلیم سے میری رغبت کا ذکر کرتے ہوئے ان سے گذارش کی کہ وہ مجھے باقاعدہ اسکول میں داخل کر دیں اور یوں اسکول میں میرا داخلہ ہوا۔"

"ادب کی دنیا میں قریب قریب ۵۰ سال گزارے ہیں، میری پیدائش ۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی۔ ملک آزاد ہوا تو ۴۷ء میں میری عمر بہت چھوٹی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ اردو زبان پر آزادی کے بعد سے ظلم ٹوٹتے رہے جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔"

"اپنی طالب علمی کے زمانے میں، میں نے اکثر آرزو سہارن پوری صاحب کو غواص قریشی صاحب کے یہاں تشریف لاتے دیکھا تھا۔ دونوں میں زبان و ادب کے موضوع پر گفتگو ہوتی تھی جس کی طرف میں کوئی خاص توجہ نہیں دے پاتا تھا۔"

"۱۹۷۱ء میں شیب پور ٹرام ڈپو کے بائیں طرف ایک دیوار گیر دکان Book Land کے نام سے کھولی تھی لیکن اس کی وجہ سے ادبی سرگرمیاں بالکل ٹھپ پڑ گئیں تو ۱۹۸۱ء میں میں نے اسے اپنے پھوپھا زاد بھائی اشرف علی صاحب کے حوالے کر دیا جو میرے برادرِ نسبتی بھی ہوتے ہیں۔ اس دس سالہ دورِ دکان داری

www.taemeernews.com

میں' میں نے شیب پور والوں کی کم سے کم اتنی خدمت تو ضرور کی ہے کہ وہاں کے
متعدد لوگوں کو اردو اد بیات خرید کر پڑھنا سکھا دیا ورنہ اس Book Land سے
قبل وہاں اردو اد بیات و رسائل کی کوئی دکان موجود نہیں تھی۔"

ان کا اس طرح گھل مل کر بے تکلفی سے باتیں کرنا' ان کے بڑے ملنسار ہونے کا پتہ دیتا ہے جس کے سبب لوگ ان سے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور جو ان سے قریب ہیں وہ میرے اس مختصر مضمون کو پڑھ کر صاف بتا سکتے ہیں کہ میں نے تو ان کی شخصیت کے محض چند ہی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی بہت کم ہی خوبیوں کا ذکر کیا ہے ورنہ ان کے خواہ" دبلے پتلے شاگرد' ہوں خواہ موٹے تازے سبھوں کو مجھ سے کہیں زیادہ ان کی خوبیوں کا علم ہے اور کیوں نہ ہو جب ان کے شاگردانِ رشید انھیں بابا کہتے ہیں تو ایک بیٹے سے زیادہ اس کے والد کے بارے میں اور کون جان سکتا ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ فراغ روہوی صاحب اپنے کمرے کی دیوار پر اپنی تصویر کے ساتھ ان کی تصویر بھی اس طرح آویزاں کیے ہوئے ہیں کہ جیسے بیٹے کے ساتھ اس کے والد کی تصویر بھی ٹنگی ہوئی ہو۔
شگفتہ یاسمین غزل نے ان کی سال گرہ کے موقع پر خود سے ان کی رنگین تصویر بنا کر بڑے سے پورٹریٹ کی صورت میں فریم میں سجا کر ان کی نذر کی ہے جیسے کوئی بیٹی اپنے والدِ عزیز کو نذرانۂ محبت پیش کر رہی ہو۔
رائٹرز ایسوسی ایشن کی پکنک کے موقع پر ان کے آتے ہی ہر شخص کھڑے ہو کر اس طرح بابا، بابا کہہ اٹھتا تھا جیسے بچے باپ کو دیکھ کر بہکنے لگ جاتے ہیں۔
اسی طرح غیر مسلم حضرات جیسے شمبھو پرساد شری واستو، اردو دیوشر پاشان، گوپال پرساد، ڈاکٹر ہری کنور رائے کنور، پنچانن رائے چودھری، سنت کمار داس، گورنگ سین گپتا، اچاریہ رادھا موہن اپادھیائے اور پروفیسر گوپال کھرجی جیسے حضرات کے نزدیک بھی انھیں کافی عزیز و پسندیدہ دیکھا۔ لیکن ان کا ہر دل عزیزی کا بہت ہی بین و نمایاں ثبوت اس وقت ملا جب ۲ راپریل ۱۹۹۸ء جمعرات کی شام حلقۂ ادب والوں نے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں انھیں نہ صرف مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی طرف سے مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی ایوارڈ ملنے کی خوشی میں استقبالیہ دیا تھا بلکہ گلے ہاتھوں ایک پنتھ دو کاج کے مصداق ان کی ۶۲ ویں سال گرہ بھی منائی تھی۔ اسی شام ان کی شاگردہ نسیم مستان نے کہا تھا :

"ان کی پیدائش ہم لوگوں کے لیے بہت ضروری تھی، ورنہ ان کے
اتنے سارے شاگرد کہاں جاتے......سرسبھوں کو چاہتے ہیں جب وہ مجھے بٹیا کہتے

www.taemeernews.com

میں تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہوں کہ میں ہی ایک ان کی بنیا ہوں لیکن ا۔
نہیں ہے کیوں کہ میری طرح ان کی ہر شاگردہ بھی یقیناً ایسا ہی محسوس کرتی ہوگی۔
سچ تو یہ ہے کہ سرچاند کے چاند ہیں۔''

ارشاد آرزو نے کہا :

''استادِ محترم کی مہربانیوں نے اس گیلی مٹی کو ایک شکل دے دی ہے،
یہ اور بات ہے کہ اس گیلی مٹی کو سوکھنے میں ابھی کافی وقت درکار ہے...... ہر لفظ
ہاتھ جوڑ کہتا ہے کہ مجھے پیش مت کرنا کیوں کہ اسے اس بات کا ڈر ہے کہیں استاد
محترم کے احترام میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔''

فراغ روہوی نے یوں اعتراف کیا :

اگر قربِ قیصر میسر ہوتا کبھی ذہن میرا
سکھاتے نہ مجھ کو جو طرزِ تکلم میں کچھ اور ہوتا سخنور نہ ہوتا

ظہیر انور صاحب نے بتایا کہ ۱۵ رسال پہلے وہ اور شکیل احمد صاحب سی ایم او اسکول میں بی۔ایڈ کی پریکٹس ٹیچنگ کلاسس کرنے گئے تو وہاں قیصر شمیم صاحب نے نہ صرف ان لوگوں کا بڑا ساتھ دیا بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملا۔

ف۔س۔اعجاز صاحب نے بڑی اچھی بات کہی" انعام پانے والے کی خوشی اس کی خوشی سے بڑھ کر اس کے چاہنے والوں کی خوشی بن جاتی ہے۔''

احمد سعید ملیح آبادی صاحب نے انکشاف کیا" حیدرآباد کے ا۔ ر"سیاست" کے مالک کی دعوت پر قیصر شمیم صاحب کو مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے راضی کر لیا گیا، جہاں وہ کامیاب بھی رہے لیکن انھیں ریل پر سوار کرانا ہوائی جہاز پر سوار کرانے سے زیادہ مشکل کام ثابت ہوا کیوں کہ وہ خود سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔''

منصور احمد ملک صاحب نے احمد سعید صاحب کی تائید کی۔ کہنے لگے" قیصر شمیم صاحب بیرونی مشاعروں میں شریک ہونے سے ہمیشہ کترایا کرتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے دعوت نامہ آیا لیکن آپ ٹال مٹول کرتے رہے۔ ایسے موقعوں پر انھوں دھکے مار کر بھیجنا پڑتا ہے۔''

اطہر مرزا نے خصوصی اجازت لے کر اپنے تاثرات یوں بیان کیے کہ آج مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ قیصر شمیم صاحب کی شخصیت کتنی ہر دل عزیز ہے تو مجھے افسوس ہوا کہ میں خود بھی ان کا شاگرد کیوں نہیں رہا۔''

www.taemeernews.com

"ازا فضل صاحب نے صدارتی تقریر میں کہا :

"یہ جنم دن صرف عبدالقیوم خان کا ہی نہیں بلکہ قیصر شمیم کا بھی ہے۔
بنگال کی سرزمین میں بڑے بڑے اساتذہ کرام گزرے ہیں لیکن اردو کی خدمت
کرنے والوں میں وحشت اور شاکر کے بعد قیصر نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔
پڑھے لکھوں کو شاعر بنانا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں لیکن کم تعلیم یافتہ لوگوں کی بستیوں
میں شاعر پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے۔اردو اکاڈمی نے انھیں ایوارڈ ضرور دیا ہے
لیکن قیصر شمیم صاحب کو صحیح معنوں میں ایوارڈ دیا ہے ان کے چاہنے والوں نے۔"

اور اسی شام افضل صاحب سے پہلے خود قیصر شمیم صاحب نے بھی اپنے تاثرات یوں بیان کیے :

"انسان کی زندگی میں وہ لمحہ بڑا سخت ہوتا ہے کہ جب اس پر تعریفوں
کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں اور یہ ایسا لگتا ہے جیسے اس پر ڈھیروں پانی برس رہا ہو۔
تقریریں سن رہا تھا۔ شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی اور عجیب و غریب
چبھن بھی محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا میں واقعی ایسا ہی ہوں جو ان تقریروں
کے آئینے میں نظر آ رہا ہے؟!"

اور اس کے بعد انھوں نے بالخصوص اپنے شاگردوں کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا اس سے نہ صرف افضل صاحب کی باتوں کی تائید ہوتی ہے بلکہ قیصر شمیم صاحب کے ایک مشن کا بھی پتہ چلتا ہے جس سے ان کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔انھوں نے کہا :

"میں جس معتوب زبان کا شاعر ہوں، اس میں اپنی حیثیت کے
مطابق کام کرتا ہوں۔لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے بہت زیادہ شاعرگری کی ہے، میں
نے بہت زیادہ شاعر پیدا کیے ہیں، نثر نگار پیدا کیے ہیں، جی نہیں! میں نے اردو
کے خادم پیدا کیے ہیں۔وہ میرؔ، غالبؔ بنیں نہ بنیں اردو کے خادم تو بن جائیں۔
کل کی ہی بات ہے۔سال اول کے طلبہ کو سال دوم کی طرف سے
استقبالیہ دیا گیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ زنجیر کا ایک حلقہ آج اپنے دوسرے حلقے
سے مل کر زنجیر کو دراز کرنے میں مدد ثابت ہوا ہے۔میں نے اس موقع پر تقریر کی اور
انھیں بتایا کہ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد آپ اردو کے

www.taemeernews.com

مجاہد، اردو کے سپاہی بنتے ہیں یا نہیں۔ میں دراصل آپ کو اردو کا سپاہی اور . .
بنانا چاہتا ہوں۔"

واقعی قیصر شمیم صاحب صرف انھیں لوگوں پر اپنی نظر عنایت نہیں ڈالتے ہیں جنھوں نے شعر و ادب کے ضمن میں ان سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے بلکہ وہ بلا تفریق من و تو انھیں بھی اپنے دریائے فیض میں شناوری کا موقع عطا کرتے ہیں جنھوں نے ان کی بارگاہ میں ایک بار زانوئے ادب تہہ کر دینے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اس کی مثال میں صرف ان کے طلبا و طالبات ہی پیش نہیں کیے جا سکتے ہیں بلکہ ایک زندہ ثبوت شبیر احمد (امپلائمنٹ افسر) بھی ہیں کہ جنھوں نے ان سے منسلک ہوتے ہی چشم زدن میں اتنی زیادہ ادبی ترقی کر لی کہ دیکھتے ہی دیکھتے صاحب کتاب ہونے کا اعزاز بھی حاصل کر لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قیصر شمیم صاحب اپنے شاگردوں کو جس قسم کا مجاہد اردو بنانا چاہتے ہیں ان کی تربیت کے نصاب میں صرف زبان و ادب سے واقف کرانا ہی شامل نہیں بلکہ یہ تلقین بھی شامل رہتی ہے کہ اخبارات و رسائل اور کتب و جرائد بالخصوص اردو کے خرید کر پڑھا کریں۔ گویا آج کے زمانے میں وہ ان مجاہد۔ین ادب سے ایسی قربانی چاہتے ہیں جو جان قربان کر دینے سے بھی زیادہ مشکل بنتی جا رہی ہے۔

بہر حال قیصر شمیم صاحب اپنے ان مذکورہ بالا صفات کی روشنی میں بلاشبہ اس بات کے صد فی صد مستحق ہیں کہ ان پر انگلیاں نہیں، قلم اٹھائے جائیں۔

غزل

قیصر شمیم

کیا بتائیں زندگی کس حال میں پائی گئی
جال پھیلایا گیا تھا' جال میں پائی گئی

شہر میں پایا گیا یخ بستہ ہاتھوں کا تپاک
گرم جوشی گاؤں کی چوپال میں پائی گئی

آپ کے عہدِ کرم پر تبصرہ ہم کیا کریں
دل کی دنیا اک نہ اک بھونچال میں پائی گئی

میں کسی البم کی زینت بننے والا تھا کہاں
میری صورت گردِ ماہ و سال میں پائی گئی

یا خدا' کیوں رحم کے قابل مجھے سمجھا گیا
بات ایسی کیا مرے احوال میں پائی گئی

www.taemeernews.com

نعیم انیس
کلکتہ

قیصر شمیم : ایک شجرِ سایہ دار

یادش بخیر! یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں سی ایم او ہائی اسکول میں چھٹی جماعت پاس کرنے کے بعد ساتویں جماعت میں پہنچا تھا۔ نئی جماعت، نیا سال، کچھ نئے ساتھی اور نئی کتابوں کے ساتھ چند نئے اساتذہ سے بھی سابقہ پڑا۔ نئے سیشن کا پہلا دن تھا اور دوسرا پریڈ اردو کا تھا۔ ہم سب طلبا استاد کی آمد کے منتظر تھے کہ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کی باوقار شخصیت، بالوں میں سب کچھ سفیدی، سرخ وسفید رنگت، سفید کرتا اور حد سے زیادہ چوڑا پائجامہ پہنے، کاندھے پر کپڑے کا تھیلا لٹکائے ہاتھ میں ڈبی پڑیا سے پان نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے جماعت میں داخل ہوئے۔ مسکرا کر کلاس میں بیٹھے طلباء پر نظر ڈالی اور پھر اپنی جگہ سنبھالی۔ یہ سی ایم او ہائی اسکول کے مایہ ناز اردو ٹیچر عبدالقیوم خان تھے جنھیں دنیائے اردو قیصر شمیم کے نام سے جانتی ہے اور ان کے فن کی دل سے معترف ہے۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد یہ حکم ملا کہ کتاب نکالی جائے اور اس کے بعد بنا کسی تمہید اور اِدھر اُدھر کی گفتگو کے انھوں نے پڑھانا شروع کر دیا اور ایک ایک لفظ کی وضاحت کرتے گئے کہ سب کچھ بہت آسان نظر آنے لگا۔ یہ عمر بچپنے کی ہوتی ہے۔ طبیعت میں شرارت وشوخی کے علاوہ کھلنڈرے پن کا بھی زیادہ دخل ہوتا ہے۔ لیکن یہ قیصر شمیم صاحب کی مقناطیسی کشش تھی یا ان کی جادو بیانی کہ کلاس میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم سب ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھ رہے تھے اور کلاس کے در و بام میں گونجتی ان کی خوبصورت آواز عجب سماں پیدا کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ گھر آنے کے بعد والد صاحب سے ذکر کیا تو پتہ چلا کہ وہ نہ صرف مغربی بنگال بلکہ ہندستان کے ممتاز و مقبول شاعر ہیں۔ ان کا کلام اکثر ریڈیو سے نشر ہوتا ہے اور ٹیلی ویژن پر بھی وہ پروگرام دیتے ہیں۔ پھر تو یہ ہوا کہ میری یہ کوشش رہنے لگی کہ میں قیصر شمیم صاحب کی کلاس میں صفِ اول میں بیٹھا کروں۔ لیکن یہ خواہش پایۂ تکمیل تک نہ پہنچی۔ ان سے ہم کلامی کی بڑی تمنا تھی۔ اسی وجہ سے میں ان کا دیا ہوا مارا ہوم ورک پابندی سے کرکے لاتا مگر ان کو دکھانے کی ہمت نہ پیدا ہو سکی میرے اندر۔ سب کی کاپیاں کلاس مانیٹر کے توسط سے ان تک جاتیں۔ جب وہ کچھ پڑھاتے ہوئے سوال کرتے تو میرے اندر یہ خواہش سر ابھارتی

www.taemeernews.com

کہ وہ مجھ سے بھی سوال کریں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ طلبہ کے جم غفیر میں ان کی نظر مجھ تک نہیں آ پاتی تھی کیوں کہ میں کلاس کی آخری صف میں بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی سر پہ غصہ بھی آتا کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کیوں نہیں کرتے۔ لیکن پھر دل کو بہلا دیتا کہ یہی کیا کم ہے کہ وہ میرے استاد ہیں۔

اکثر و بیشتر یہی دیکھنے کو ملتا ہے اور تجربہ بھی اب یہی بتاتا ہے کہ ساتویں جماعت میں اردو پڑھاتے ہوئے اساتذہ برائے نام انصاف کر پاتے ہیں۔ لیکن قیصر شمیم صاحب اس الزام سے مبرا ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے پیشے سے مکمل انصاف کرتے ہیں بلکہ اردو زبان و ادب پر انھیں جو قدرت حاصل ہے' اس کا مکمل کر مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ وہ کتاب کے بندے ٹکے مضامین، نظم اور غزل پڑھا کر معاملہ ختم نہ کرتے تھے بلکہ پابندی سے مشق کراتے، معنی یاد کراتے، قواعد کی مکمل جانکاری دیتے اور حتی تدریس کے علاوہ نظموں اور غزلوں کو زبانی سنا بھی کرتے تھے۔ ان کی اس محنت کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ میرے اندر بھی نظم اور غزل یاد کرنے اور کہانیوں کو پڑھنے اور سننے کا شوق پیدا ہو گیا۔ آگے چل ان نظموں، غزلوں اور کہانیوں کو زبانی یاد کرنے کی مشق نے میرے ذہن کو ادب کی جانب موڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لہٰذا یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میرے ادبی سفر کا آغاز قیصر شمیم کی تدریسی محنت اور توجہ سے ہوا۔

جب میں آٹھویں جماعت میں آیا تو یہ دکھ دینے والی خبر سننے کو ملی کہ قیصر شمیم صاحب نے خضر پور کالج جوائن کر لیا ہے۔ ان کی جگہ جو اردو ٹیچر آئے وہ بات ان میں نظر نہ آئی جو قیصر شمیم صاحب کا نمایاں وصف تھی۔ کلاس میں دلچسپی بھی نہ رہی۔ ان کے پڑھانے کا انداز بھی عجیب سا تھا۔ اس پر وہ جب اپنی تعریف خود کرتے تو ہم سب کو ایک طرح کی الجھن ہونے لگتی اور ذہن و دل اسی پُر وقار ہستی، اسی خوبصورت آواز اور اسی طرزِ تدریس کا متلاشی رہتا۔ قیصر شمیم صاحب کی کمی شدت کے ساتھ کھلنے لگی۔ معصوم ذہن الجھ جاتا کہ آخر وہ کیوں ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے؟ کیا وہاں ان کو زیادہ روپے ملتے ہوں گے؟ لیکن یہ خواہش شدت اختیار کرتی کہ کاش وہ پھر سے لوٹ آئیں اور اسی انداز سے ہمیں پڑھائیں۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی کہ پہلے تو ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا اور پھر تنہا کر کے چل دیئے۔ ذرا سوچا بھی نہیں کہ اب ان طلبا کو میری طرح سے کون پڑھائے گا؟

سنا ہے بزرگوں سے معصوم دلوں کی دعائیں خدا جلد ہی سنتا ہے اس پر یقین کامل اس وقت ہوا اور ہم سب طلبہ کی حیرت و خوشی کی انتہا نہ رہی جب درجہ نہم کی کلاس روٹین میں ان کا نام دیکھا۔ دل کو یقین نہیں آ رہا تھا لیکن دیکھا کہ قیصر شمیم صاحب ہیڈ ماسٹر روم میں موجود ہیں اور منصور ملک صاحب سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ ہم لوگوں کی کلاس میں داخل ہوئے اور اسی مخصوص انداز میں پڑھانا شروع کر دیا۔

www.taemeernews.com

دل کی بے قرار موجوں کو سکون مل گیا۔ان کی آمد سے اسکول کے تمام اساتذہ وطلبہ یہاں تک کہ دربان بھی بے حد خوش تھے۔خضر پور کالج کی گورننگ باڈی نے ان کے ساتھ حق تلفی کی تھی لیکن یہاں آ کر ان کو جو بے پایاں خلوص اور محبت ملی اس سے اتنا ضرور ہوا کہ اس تلخ واقعہ کو انھوں نے ذہن سے بھلا دیا اور طلبہ کی ذہنی پرداخت میں گم ہو گئے۔ان کی غیر موجودگی سے اسکول میں جو ایک طرح کا ادھورا پن نظر آتا تھا وہ اب دور ہو گیا تھا۔

میں تو ان کا پرستار تھا ہی اب اس چاہت نے عقیدت واحترام کی شکل اختیار کر لی تھی۔لیکن قیصر شمیم صاحب کو اس قدر چاہنے کے باوجود بھی کھل کر ان سے بات نہ کر سکا تھا۔نویں جماعت میں جانے کے بعد میری جھجک کچھ ٹوٹی اور میں نے ان سے ایک آدھ سوال کرنے کی ہمت کرنے لگا۔وہ تشفی بخش جواب دیتے اور سمجھانے کا انداز ہ ایسا ہوتا کہ ہر بات پر دل پر نقش ہو جاتی۔درجہ نہم میں وہ ہم لوگوں کو غزل اور نظم پڑھایا کرتے تھے۔اشعار کی تشریح کرتے وقت وہ معنی کے در یوں وا کرتے کہ دل عش عش کر اٹھتا۔وہ جس شعر کو پڑھاتے اس کے حالات زندگی اس کا شعری مرتبہ اور اس کے ہم عصر شعرا سے ضرور واقف کراتے۔ان کی اس محنت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میرے اندر بھی لکھنے کی تحریک سر ابھارنے لگی اور میں نے "انجام" کے عنوان سے ایک مختصر سی کہانی لکھی۔مگر سر کو دکھانے کی جرأت اپنے اندر پیدا نہ کر سکا اور پھر خوف کے مارے اسے ضائع کر دیا۔

قیصر شمیم صاحب کے قریب آنے اور ان سے ہم کلام ہونے کا شرف درجہ دہم میں حاصل ہوا۔اسکول کی سالانہ تقریبات ہونے والی تھیں۔غزل،نظم،نعت خوانی کے علاوہ سراج الحق پریمی صاحب کی ہدایت میں ڈراما بھی اسٹیج ہونے والا تھا۔میرے کئی ہم جماعت ڈرامے میں کام کر رہے تھے اور دیگر ساتھی نظم اور غزل سرائی کی تیاری کر رہے تھے۔لہٰذا مجھے ان کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔قیصر شمیم صاحب نظم اور غزل پڑھنے والے طلبہ کے ساتھ جی توڑ محنت کر رہے تھے۔صحتِ الفاظ،آواز کا اتار چڑھاؤ،لفظوں کی مکمل ادائیگی اور ترنم کا خاص خیال رکھ رہے تھے۔انھوں نے پرویز شاہدی کی غزل :

شیخ اندھیرے میں بھاگے ہیں سب پچھم کی سمت
جیسے سارا اجالا ادھر ہی تو ہے

پڑھنے کو کہا لیکن میں اتنی ہمت نہ کر سکا کہ اسٹیج پر غزل پڑھ سکوں۔میرے انکار کرنے پر میرے پڑوسی اور میرے ہم جماعت انوار الحق نے اپنے مخصوص انداز سے یہ غزل پڑھی اور خوب داد وصول کی۔سراج الحق پریمی اور قیصر شمیم صاحبان کی کاوشیں رنگ لائیں اور اسکول کی سالانہ تقریبات انتہائی شاندار طریقے سے انجام پائیں۔اس تقریب کے موقع پر سر کی قربت اور ان سے ہم کلامی کا شرف بار بار حاصل ہوا۔لیکن اسکول سے

www.taemeernews.com

جب تعلیمی سلسلہ منقطع ہوا تو سر سے بھی ایک مدت تک ملاقات کی کوئی صورت نہ نکل پائی۔ اس کے باوجود دل میں ان کی یاد تازہ رہی۔ اکثر ان کا کلام اخبارات و رسائل کے توسط سے پڑھنے کو ملتا رہتا۔ ریڈیو پر ان کی آواز بھی سنتا اور ٹیلی ویژن پر ان کو کلام پڑھتے دیکھتا بھی۔ اب سر کی اہمیت ان کی عظمت اور ان کی فنی صلاحیت کا احساس زیادہ ہونے لگا تھا۔ سر نے کچھ اس طرح اردو ادب سے میرا ناتا جوڑا تھا کہ اس سے دلچسپی برقرار تھی اور لکھنے پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری تھا اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہائر سیکنڈری کا امتحان پاس کرنے کے بعد مولانا آزاد کالج کے شعبۂ اردو میں داخلہ لوں گا۔ لہٰذا رزلٹ آنے کے بعد باآسانی کالج میں داخلہ مل گیا۔ یہاں استادِ محترم اعزاز افضل اور غزالی صاحب کی کلاس کرنے کے بعد قیصر شمیم صاحب کی قدر و منزلت میرے دل میں مزید بڑھ گئی۔ اگر وہ محنت سے نہ پڑھاتے تو افضل صاحب اور غزالی صاحب کی کلاس کر لینا تو دور کی بات ہے ان کے کلاس میں بیٹھنے کی ہمت بھی اپنے اندر پیدا نہ کر سکتا۔ قیصر شمیم صاحب نے شعر و ادب سے جو رغبت دلائی تھی اس پر افضل صاحب اور غزالی صاحب کی محبت اور پڑھانے کے دلکش انداز نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور پھر یہیں سے میں نے باقاعدہ لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن اسکول چھوڑنے کے بعد قیصر شمیم صاحب سے کبھی گفتگو نہ ہو سکی۔ وہ بک اسٹال اور کبھی چائے کی دکان پر نظر آتے یا پھر فیئرس لین سے گزرتے ہوئے ان سے سامنا ہو جاتا تو بات علیک سلیک سے آگے نہ بڑھتی۔

ان ہی دنوں مولانا آزاد کالج کا سالانہ طرحی مشاعرہ ہونے والا تھا۔ شعرا کو مدعو کرنے کی ذمہ داری مجھے، نذرالاسلام نظمی اور شمشاد احمد کو سونپی گئی تھی۔ میری بڑی خواہش تھی کہ قیصر شمیم صاحب بھی اس مشاعرے میں شرکت کریں۔ لہٰذا میں نے نصر غزالی صاحب سے جب یہ کہا تو وہ کہنے لگے بھئی ضرور مدعو کیجیے مگر وہ آتے نہیں ہیں۔ میں نے نجانے کس جذبے کے تحت پُر اعتماد ہو کر ان سے کہا کہ جب میں کہوں گا تو وہ ضرور آئیں گے۔ غزالی صاحب نے کہا یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ ٹھیک ہے تم کوشش کرو۔ شاید کامیابی مل جائے۔ سر کو مدعو کرنے اسکول گیا تو معلوم ہوا کہ وہ جا چکے ہیں۔ شیب پور میں ان کا مکان میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ منصور ملک صاحب کہنے لگے ۷۷ ر فیئرس لین کی پہلی منزل پر ان کی چھوٹی بہن کا مکان ہے۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ وہ شام پانچ بجے تک وہاں مل جاتے ہیں۔ میں دعوت نامہ لے کر ان کی بہن کے مکان پہنچا۔ سر وہاں موجود تھے اور اپنے شاگردوں کی تخلیقات پر اصلاح کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انتہائی خلوص سے ملے۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد واضح کیا تو نہ آنے اور نہ ٹالنے والے انداز میں حامی بھر لی۔ لیکن میں بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو ہر حال میں شرکت کرنی ہے اور اگر آپ نہیں آئے تو میں خود آپ کو لانے کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں سر کوئی عذر کر کے

www.taemeernews.com

ٹال نہ دیں۔ لہٰذا میں خود آپ کو لے جانے ان کے گھر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی سر نے کہا ارے بھئی اب تک غزل بھی نہیں کہی ہے۔ چھوڑ دو میں شکر گزار رہوں گا۔ لیکن میری ایک ہی ضد تھی کہ آپ کو چلنا ہے۔ کہنے لگے اچھا تم بیٹھو اگر کچھ شعر کہہ لیتا ہوں تو پھر چلوں گا۔ مجھے باہر والے کمرے میں بٹھا کر وہ اندر چلے گئے اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد باہر آئے۔ کہنے لگے " تمھاری ضد نے مجبور کر دیا۔" اسی طرح میرے اصرار پر قیصر شمیم صاحب نے مولانا آزاد کالج کے سالانہ مشاعرے میں تقریباً ۲۰ رسال بعد شرکت کی۔

اس مشاعرے میں وحشت کے جس مصرعے پر طبع آزمائی کی دعوت دی گئی وہ یہ:

جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیوں کر وہ اُٹھایا جاتا ہے

قیصر شمیم صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کلام پڑھا۔ جب وہ مائک پر آئے تو ہال میں سناٹا چھا گیا اور ہال سے باہر نکل جانے والے حضرات نے بھی دوبارہ اپنی جگہ پر براجمان ہو گئے۔ ہر ہر شعر پر انھوں نے سامعین سے بے پناہ داد وصول کی۔ ان کی غزل کے جس شعر پر حد سے زیادہ داد ملی اور بار باران سے پڑھنے کی فرمائش کی گئی وہ یہ:

پہلے تو جتائی جاتی ہے ہمدردی پیاس کے ماروں سے
پھر آنکھ بچا کر پانی میں کچھ زہر ملایا جاتا ہے

مشاعرے کے اختتام پر انھوں نے افضل صاحب اور غزالی صاحب سے جب یہ کہا کہ بھئی میں اس مشاعرے میں صرف نسیم کی ضد کی وجہ سے شریک ہوا ہوں تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

بی اے آنرز مکمل کرنے کے بعد میں نے جب کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا تو وہاں قیصر شمیم صاحب بحیثیت گیسٹ لیکچرار اپنی فنی صلاحیتوں سے طلبہ کے ذہنوں کو منور کر رہے تھے۔ نیا ماحول اور نئے اساتذۂ کرام کے درمیان قیصر شمیم صاحب کی موجودگی نے بڑا حوصلہ دیا۔ وہ یونیورسٹی میں جمعہ اور سنیچر کو کلاس لیتے تھے۔ جمعہ کو وہ میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کی غزلیں پڑھاتے تھے اور سنیچر کو " اقبال اسکول" کے طلبہ کی گروپ کلاس لیتے تھے۔ قیصر شمیم صاحب کی وجہ سے میں، شمشاد اور اطہر نے اقبال اسکول جوائن کیا اور کلاس کرنے لگے۔ گروپ کلاس کا پریڈ آخری ہوا کرتا تھا۔ سر پڑھانے میں اس قدر گم ہو جاتے کہ اکثر ساڑھے پانچ بج جاتے اور بعض دفعہ تو چھ بھی بج جاتے اور ایوننگ سیکشن کے طلبہ کی آمد ہمیں یہ بتاتی کہ اب گھر جانا چاہیے۔ گروپ کلاس میں شمشاد، اطہر، قادر نواز، نیلوفر اور رضیہ پابندی سے موجود رہتے۔ قیصر شمیم صاحب کبھی ناغہ نہیں کرتے۔ کلاس میں فضول گفتگو سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو یا طوفان ان کا آنا ضروری تھا۔ یہ قیصر شمیم صاحب کے پڑھانے کا دلکش اور

www.taemeernews.com

منفرد انداز ہی تو تھا جو ہم سب کو دیر گئے کلاس روم میں رہنے پر مجبور کرتا تھا۔

کلکتہ یونیورسٹی میں قیصر شمیم صاحب کے قریب آنے کا زیادہ موقع ملا۔ ان کی سادگی، ان کی سادہ لوحی اور شرافت کے سب ہی معترف تھے۔ درس و تدریس کے معتبر پیشے سے وہ مکمل انصاف کرنا جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار اسکول سے یونیورسٹی تک ہر دل عزیز استاد کی حیثیت سے کیا جاتا تھا۔ جب میں نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا تو ان سے رابطہ قائم اور درخواست کی کہ ادبی سفر میں وہ میری رہنمائی کریں۔ یہ ان کا بڑا پن تھا کہ بے پناہ مصروفیتوں میں گھرے رہنے کے باوجود انھوں نے میری رہنمائی کی اور میری تحریروں کو دیکھنے لگے۔

استاد و شاگرد کا سلسلہ جو اسکول کی ساتویں جماعت سے قائم ہوا' وہ اب تک برقرار ہے۔ اپنے درس و تدریس کے اس طویل عرصے میں انھوں نے نجانے کتنے ذہنوں کی آبیاری کی ہے۔ کتنے لوگوں نے ان کے علم سے کسب فیض کیا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے اور ایسا کرتے ہوئے خود ان کا کس قدر نقصان ہوا اس کی انھوں نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی ادنیٰ سی مثال ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

غزل

قیصر شمیم

نہ چاند مانگے نہ تاروں بھرا گگن مانگے
اداس رات ہماری ترا بدن مانگے

جو انگ انگ سے پھوٹے ہے تیرے نغمات گئے
اکیلے پن کا اندھیرا وہی کرن مانگے

جہاں بھی چاہے تری یاد آ کے لے جائے
نہ شہر مانگے مرا دل نہ کوئی بن مانگے

نہ جانے کیسی وہ لذت ہے جس کا چسکا ہے
عجیب دل ہے کہ ہر وقت اک چبھن مانگے

پھنسی ہے قید میں تو روح کا یہ عالم ہے
دعا رہائی کی جیسے کوئی ہرن مانگے

www.taemeernews.com

مظہر امام
دہلی

قیصر شمیم اور غزل کی نئی دھار

کچھ لوگ شعر کہتے ہیں۔ کچھ لوگ مشہور ہوتے ہیں یا ہو جاتے ہیں۔ قیصر شمیم کو میں ان لوگوں میں شمار کرتا ہوں جو شعر کہتے اور شعر کہنا جانتے ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا کرتے ہیں نہ صلے کی پروا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے سچے تخلیق کاروں کے مقدر میں محرومی ہی آتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شہرت طلبی کی ہوس اچھے اچھوں کو کاسہ لیسی پر مجبور کرتی ہے، اور فاقہ مستوں کی غیرت گداگری کو گوارا نہیں کرتی۔

میں قیصر شمیم کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میں دربھنگہ جیسے قصبہ نما شہر سے کلکتہ جیسے وشال شہر میں نیا نیا آیا تھا، اور یہاں اپنے پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ۲۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کو اس شہر میں قدم رکھا، اور ایک ڈیڑھ سال تک یہاں کے ادبی اور سماجی حلقوں میں اپنے آپ کو متعارف کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ان دنوں کلکتہ میں ادبی معاشرے سے اپنی شناخت کا سب سے بڑا ذریعہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی اردو ہندی کی مشترکہ شاخ تھی جس کے جلسے ہر ہفتہ باقاعدگی کے ساتھ سوترکن اسٹریٹ میں ہوا کرتے تھے۔ یاد آتا ہے کہ قیصر شمیم سے میری ملاقات انجمن ہی کے کسی جلسے میں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ عمید انگسی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ نام مجھے بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ خیر یہ تو انھوں نے بتایا کہ وہ انگس ضلع ہگلی کے رہنے والے ہیں۔ لیکن ''عمید'' کی غرابت مجھے برابر کھلتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد ''شاہراہ'' میں ان کی ایک غزل شائع ہوئی جس کا مقطع اس زمانے سے اب تک میرے حافظے میں موجود ہے :

رک گئی شاعری کی مشق عمید　　　　ہائے کم بخت امتحاں نہ رکا

پتہ چلا کہ ان ہی دنوں انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا تھا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد ہندوستان سے شائع ہونے والے رسالوں میں ''شاہراہ'' کا مقام سب سے اونچا تھا، اور اس میں شائع ہونا شاعر یا ادیب کی شناخت کا باعث ہوتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب ساقی، ادبی دنیا اور ادب لطیف میں چھپنا ادیب اور شاعر کو راتوں رات مشہور کر دیتا تھا۔ ''شاہراہ'' اس حد تک نہ سہی، لیکن اپنی اشاعت کے پہلے چند برسوں میں بڑی حد تک ایسی

www.taemeernews.com

ہی سا کھو رکھتا تھا۔

اُن دنوں عمید انکسی کی کئی غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہوئیں، جو اپنے سادہ لیکن تاثر آمیز لہجے کے باعث مجھے پسند آتی رہیں۔ ان سے قربت کا سبب یہی شاعری تھی اور آہستہ آہستہ یہ قربت دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ شاید اسی دوستی کے زیرِ اثر انھوں نے میرے مشورے پر اپنا قلمی نام قیصر شمیم رکھنا پسند کیا۔ اور جلد ہی ان کی شہرت مغربی بنگال کی حدود کو پار کر گئی۔ ان کا کلام اردو اور ہندی کے کئی انتخابات میں نظر آنے لگا۔

قیصر شمیم سے میری دوستی کی عمر کی نصف صدی کو مکمل ہونے میں بہ مشکل چار پانچ سال باقی ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت قبول کرنے کے بعد مجھے کلکتہ کو خیر باد کہنا پڑا۔ کٹک کے قیام کے دوران تو خیر ان سے کبھی کبھی ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ ایک بار میری درخواست پر وہ کٹک کے ایک مشاعرے میں بھی تشریف لائے تھے اور انھوں نے میرے یہاں قیام فرمایا تھا۔ بہت عرصہ بعد میں نے دوردرشن سری نگر کے مجوزہ مشاعرے میں بھی انھیں زحمت دینی چاہی تھی، مگر وہ مشاعرہ بوجوہ ملتوی ہوگیا۔ ایک زمانے میں، میں نے انھیں طول طویل خط لکھے تھے، جنھیں اب دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ غالباً میں نے اتنے تفصیلی اور بے تکلف خط کسی اور کو نہیں لکھے۔

پھر میں اپنی منصبی اور گھریلو ذمہ داریوں میں الجھ گیا۔ مکروہاتِ زمانہ بڑھتے گئے اور قیصر شمیم اپنی ملاقاتوں میں تو نہیں، اپنی یادوں میں قریب رہے۔ ستم ہائے روزگار نے ان کی یادوں سے کبھی غافل نہیں ہونے دیا۔ اور ان کے بارے میں وقفے وقفے سے سہی، اطلاعات ملتی رہیں۔ ان کی مسرت اور ان کے رنج میں دل برابر شریک رہا۔

خلوص و محبت کا دوسرا نام قیصر شمیم ہے۔ ان کی خوش اخلاقی کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ اپنا نقصان کرکے دوسروں کو فائدہ یا فیض پہنچانا ان کا وتیرہ ہے۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی ذات سے کسی کا نقصان ہو۔ رشید احمد صدیقی کا یہ بیان کہ اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے، یا اسے ہونا چاہیے قیصر شمیم پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

قیصر شمیم کے کلام کی نمایاں خصوصیت اس کی خوش آہنگی ہے جو آج کی یبوست زدہ شاعری کے دور میں اور نمایاں ہوجاتی ہے گیت سے ان کے مزاج کو خاص مناسبت ہے۔ گیت بنیادی طور پر گائے جانے والی صنف ہے۔ اس کا اثر ان کی غزلوں اور نظموں پر بھی پڑا ہے۔ یہی وہ اثر ہے جسے میں نغمگی سے تعبیر کرتا ہوں۔

قیصر شمیم کے یہاں خیال کی تازگی بھی ہے اور اسلوب کی نادرہ کاری بھی۔ انگریزی، ہندی اور بنگلہ

www.taemeernews.com

ادبیات پر ان کی گہری نگاہ ہے اور ان زبانوں کی اعلیٰ ادبی اقدار سے انھوں نے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے غزلیں، نظمیں، گیت سب ہی لکھے ہیں۔ گیتوں میں ایک خاص سوچ اور نرمی ہے۔ انھیں مغربی بنگال کا واحد گیت کار سمجھنا چاہیے۔ زندگی کی ناکامیوں کے باوجود ان کے اشعار میں رجائیت ہے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ہے :

بتا کہ میرے لیے تیرا کیا حکم ہوگا   کوئی سزا بھی اگر میرا سر جھکا نہ سکے

قیصر شمیم کا پہلا مجموعہ کلام " ساعتوں کا سمندر" ۱۹۷۱ء میں اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں شائع ہوا تھا۔ مجموعہ مختصر تھا لیکن اس نے اہلِ نظر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور مجموعے کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ موقر ادبی جریدوں نے بڑے حوصلہ افزا تبصرے شائع کیے۔

قیصر شمیم غزل کے ہی نہیں، نظموں کے بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ " ساعتوں کا سمندر" میں شامل ان کی نظمیں " آئینہ آب، تاش کے پتے، اسپ تازی شدہ مجروح، امکانات کا قتل" مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں۔ اپنی ایک نظم " بتیسویں پہاڑ کٹنے کے بعد" میں وہ کہتے ہیں :

لیکن وہ آرزو، وہ طرح دار آرزو
بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے بعد ہی
گھبرا کے پوچھتی ہے کہ کیا آگے جاؤ گے؟
کیا دوسرے پہاڑ پہ تیشہ چلاؤ گے ؟
کب تک سیہ پہاڑوں سے پنجے لڑاؤ گے؟
فرہاد کا یہ فرض کہاں تک نبھاؤ گے؟
جس نہر کی تلاش ہے، وہ نہر پاؤ گے؟

ان ناگہاں سوالوں پہ پل بھر رکا ہوں میں
پھر مسکرا کے تیشہ لیے چل پڑا ہوں میں

قیصر شمیم تیشہ بدست آج بھی فرہاد کا فرض نبھا رہے ہیں ــــــ کامیابی یا ناکامی کے انجام سے بے پروا۔ قیصر شمیم کی غزلوں کے اشعار کی تازہ کاری ان کے اپنے تجربے، مشاہدے اور احساس کی پروردہ ہے۔ وہ انسانی زندگی کے رمز آشنا اور انسانی تجربات کے مزاج شناس ہیں۔ طرزِ اظہار میں وہ زبان و بیان کی لطافت، شستگی اور دل آسائی کا پورا خیال رکھتے ہیں :

www.taemeernews.com

سامنا سرد ہوا کا ہوگا / دھوپ اوڑھے ہوئے چلنا ہوگا
ناؤ ٹوٹی ہے تو تختہ لے لے / راہ میں پھر کوئی دریا ہوگا
زندگی ان دنوں کیا ہے قیصر / جھیلنے والا سمجھتا ہوگا

اب تقریباً ستائیس (۲۷) سال کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ "سانس کی دھار" شائع ہوا ہے۔ یہ وقفہ بہت طویل ہے اور شاعر جب تک ادبی منظر نامے پر مستقل اپنے وجود کا ثبوت نہ دیتا رہے۔ اس کی طرف توجہ کم ہو جاتی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۹۶ء تک یعنی ۴۶ (چھیالیس) سال کی سو غزلوں پر مشتمل ہے۔ گیتوں اور نظموں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ قیصر شمیم سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ کمیت سے زیادہ کیفیت کے قائل ہیں، اس لیے ان کا شعری سرمایہ جو ہم تک پہنچا ہے، بہت زیادہ مفید نہیں ہے مگر جو ہے وہ منتخب ہے اور ان کی تعیینِ قدر کے لیے کافی ہے۔

مغربی بنگال میں جدید رنگ سخن اختیار کرنے والوں میں قیصر شمیم کو اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے بنگال کی نئی نسل کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ ان کی تربیت میں بھی اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔

"سانس کی دھار" سے اچھے اشعار کا انتخاب ایک مشکل کام ہے۔ قیصر شمیم نے یہ انتخاب سختی سے کیا ہے۔ تمام غزلیں ایک مخصوص معیار کی حامل ہیں۔ چند اشعار میرے اس بیان کی ہم نوائی کریں گے۔

پہلے عمید انکسی کے نام سے شائع ہونے والی ابتدائی دور کی غزلوں کے کچھ شعر دیکھیے۔ ان میں بھی ایک خاص نوع کا چٹیلا پن ہے۔

دھیمے سروں میں گاتا ہوں / جی کو یوں ہی بہلاتا ہوں
سب سے چھپا کر اشکوں کو / ہنستا ہوں یا گاتا ہوں
ہائے وہ صحبتیں وہ ہنگامے / ہائے وہ بزم دوستاں اے دوست
اے غم دہر مری راہ نہ روک / جانے وہ کب سے انتظار میں ہے
جس کو کبھی دیکھا ہی نہیں ہے وہ ہے اپنے دل کے قریب / ہم تم برسوں ساتھ رہے ہیں پھر بھی کتنی دوری ہے

اور پھر بعد کے اشعار :

اس کے کوچے میں رہ کر بھی ناشائستہ ہیں یہ لوگ / اب بھی قیصر دست و گریباں دیوانے آپس میں ہیں
ہم کو بھی کبھی حسرت آزار بہت تھی / افسوس کہ اب اس پہ بھی دھوکے کا گماں ہے
چلوں زمانے کے ہم راہ کس طرح قیصر / ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ

www.taemeernews.com

آپ زمانے کے ہم راہ نہ چل سکیں تو آپ زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں، مگر ہر باضمیر شخص کا یہی مقدر ہے۔ قیصر شمیم جو کہتے ہیں، لفظوں کو شیریں بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انھوں نے ''رس گلے'' کے لفظ کو کس خوبصورتی سے ہماری غزل کا حصہ بنایا ہے :

لفظوں کے رس گلے میرے پاس نہیں　　　تلخ اگر لہجہ ہے بابا تیرا کیا

اس غزل کا یہ شعر بھی دیکھیے :

اس کا ہنسنا رونے سے تو بہتر ہے　　　وہ مجھ پر ہنستا ہے بابا، تیرا کیا

ہنسنا زہر خندہ ہی سہی، لیکن ماتم گساری سے تو بہتر ہے۔ قیصر شمیم 'رو خاص' کے نہیں 'رو عام' کے شاعر ہیں۔ آج کے ادیب و شاعر جب ''اشرافیہ'' میں شامل ہونے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ قیصر شمیم کا یہ شعر خاص طور پر توجہ کا مطالبہ کرتا ہے :

کوئی ہم خیال قیصر ہو مری طرح تو سیکھے　　　رو خاص بھول جانا ' رو عام یاد رکھنا

ان کی خودشناسی اور خودداری بھی طرح دار ہے :

ہاتھ اٹھاتا ہوں تو یہ سوچ کے رک جاتا ہوں　　　کچھ بھی ہو دستِ دعا کاسہ نما ہوتا ہے

قیصر شمیم نے اپنی سانسوں کی دھار تیز رکھی ہے۔ یہی ان کے نئے شعری مجموعے کا جواز ہے۔

قیصر شمیم کی ایک غزل

گرد آلود منظروں میں تھا　　　میں بکھرتے ہی بے گھروں میں تھا

وقت دکھلا رہا تھا اپنے کھیل　　　اور میں اس کے ششدروں میں تھا

مشتقوں میں بٹا ہوا انساں　　　محو کتنے ہی مصدروں میں تھا

ایک محور پہ تھی زمیں ' لیکن　　　میں تو لاکھوں ہی محوروں میں تھا

اپنی پہچان کتنی جھوٹی تھی　　　مدتوں میں بھی خودسروں میں تھا

آہ ' فہرست اس کے اپنوں کی

میں ہمیشہ ہی دوسروں میں تھا

www.taemeernews.com

پروفیسر علیم اللہ حالی
گیا

عرفانِ حیات کا شاعر : قیصر شمیم

جناب قیصر شمیم ہمارے ان بزرگ شعراء میں ہیں جنہوں نے ادھر کئی دہائیوں سے خدمت شعر و سخن کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ آج سے کم و بیش چالیس پینتالیس سال پہلے تک وہ عمید انکسی کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ جون ۱۹۵۷ء کے بعد انھوں نے اپنا قلمی نام بدلا اور قیصر شمیم ہو گئے۔ یوں غزل تو ان کا مخصوص میدانِ تخلیق ہے لیکن ان کی فکر انگیز منظومات کو ان کی تخلیقی فتوحات سے الگ نہیں رکھا جا سکتا اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک غزل اور نظم دونوں اثاثے کو سامنے نہیں رکھا جائے اس وقت تک قیصر شمیم کے فکر و فن کا صحیح جائزہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے قیصر شمیم کی غزلوں کے مجموعے" سانس کی دھار" کے ساتھ ساتھ ان کی منظومات کے مجموعے" پیاز کاٹتے ہوئے" کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قیصر شمیم کی شاعری مجموعی طور پر زندگی کی ہموائی کرتی ہے۔ غزل ہو یا نظم دونوں جگہ ایک مخصوص فلسفیانہ طرزِ فکر قیصر شمیم کی شناخت ہے۔ اس فکر میں حیاتِ اجتماعی کے مثبت اجزا، تحرک و توانائی پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کی شاعری کے اسی طرزِ خاص کی وجہ سے انھیں عرفانِ حیات کا شاعر قرار دیا ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ ان کے صاحب زادے کا نام بھی عرفان الحیات ہے۔ اسے محض حسنِ اتفاق قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال قیصر شمیم کی جملہ تخلیقات کا مطالعہ یہ پتہ دیتا ہے کہ وہ انفرادی جذبوں میں اجتماعی صورتِ حال کی عکاسی پر زور دیتے ہیں۔ ان کا اپنا درد اکثر و بیشتر عہد اور معاشرے کی کہانی بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی غزلیہ شاعری کے ان اشعار میں جہاں وہ حدیثِ دل بیان کرتے ہیں۔ ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ وہ جذبات میں لت پت ہو گئے ہیں اور احساس کی شدت کی اس منزل تک پہنچ گئے ہیں جہاں شعور دم توڑنے لگتا ہے اور اظہار گم ہو جاتا ہے۔ قیصر شمیم کے نجی محسوسات سے ان کی وابستگی اور دوری کے لیے انگریزی کی اصطلاح Objective Co-relative استعمال کی جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کی تشریح و تعبیر تفصیل کی متقاضی ہے۔ اس لیے اپنی بات صرف یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ قیصر شمیم کی داخلی شخصیت اتنی جری و بے باک ہے اور ان میں انسانی وجود کے سلسلے میں اتنا ایقان و اعتماد ہے کہ وہ نجی آلام سے زیر نہیں ہوتے اور تمام تر

www.taemeernews.com

آلامِ حیات کے باوجود زندگی کے ان عوامل پر بھروسہ رکھتے ہیں جو تقویت عطا کرتے ہیں۔ قیصر شمیم کے یہاں ایک خاص طرح کی خودداری اور بے نیازی کی خصوصیت ملتی ہے جس پر کبھی کبھی ہلکی سی تعلّی کا گمان بھی ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ انا، خودداری کا وہ جذبہ ہے جو محدود وسائلِ حیات میں بھی انسان کو فروکش بناتا ہے اور استغنا و توکل کی قوتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہی وہ امتیازی لکیر ہے جس کی وجہ سے قیصر شمیم کو میر کی ہم سفری کا شائبہ ہوتا ہے (کبھی کبھی نظر آتے ہیں میر میرے ساتھ) قیصر شمیم کی خودداری اور دنیا سے ان کی بے نیازی نہ احساسِ نایافت کا نتیجہ ہے اور نہ دنیا یا اہلِ دنیا سے برسرپیکار ہو کر کنارہ کش ہو جانے کا پتہ دیتی ہے۔ ان کے اس تیور کی صحیح تفہیم کے لیے مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے مجموعی تاثر پر غور کرنا ضروری ہے۔

ہاتھ اٹھاتا ہوں تو یہ سوچ کے رک جاتا ہوں
کچھ بھی ہو دستِ دعا کاسہ نما ہوتا ہے

خفا ہوئے بھی کسی سے تو کیا کیا ہم نے
بہت ہوا تو رہا دل کا قہر آنکھوں میں

گھر کے کونے میں پڑا ہوں بابا
ایک بوسیدہ ہوں

جس نے دنیا کو خوب دیکھا تھا
اس کی آنکھوں میں قہقہہ سا تھا

ہے سمندر میں تو رکھ گہرائیوں کا وصف بھی
سرپھری موجوں کی صورت سطح کی ہلچل نہ بن

ہم مسافر ہیں سبھی دنیا میں
راہ میں اپنے پرائے نہ نکالو لوگو

آج ہیں سب کے سب بے حال
آج کسی کا حال پوچھ

یوں تو سکوں کے لیے قیصر ہوتے ہیں اصول مگر
اکثر میرے کام آتی ہے دل کی بے آرامی بھی

کسی منزل میں بھی حاصل نہ ہوا دل کا قرار
زندگی خواہشِ ناکام ہی کرتے گزری

ہنگامۂ حیات میں رہ کر اسے برداشت کرتے رہنا، بے نیازی اور خودداری کے ساتھ نجی زندگی کے لیے اپنا دستورِ حیات بنا کر اس پر عمل کرنا، ناکامیاں اور ان کا شدید احساس...... اس کے باوجود گریز سے اجتناب، ہر حال میں اخلاقی قدروں کی پاسداری، رموزِ حیات کی تفہیم کی کوشش، اپنی ذات پر اعتماد کے باوجود ایک ماورائی طاقت کے پابند رہنے کا تصور...... یہی خصوصیات ہیں جو قیصر شمیم کو امتیاز بخشتی ہیں اور یہیں میر کا عکس نظر آتا ہے۔

قیصر شمیم کے یہاں ایک فلسفیانہ لہجہ صاف طور پر نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ فلسفہ ان کی شاعری کو بوجھل اور بے کیف بنا دے۔ ہمارے بعض بزرگ شعراء فکر و فلسفہ کی گراں باری کے نیچے دبے دبائے نظر آتے ہیں۔ تفکر و تفلسف کے ساتھ شعری جمالیات سے وابستگی اکثر و بیشتر دشوار ہو جاتی ہے خاص طور پر غزل کے باب میں یہ امر اور بھی مشکل ہے۔ یہیں پہنچ کر غزل کی نزاکت اور لطافت کا احساس ہوتا ہے جب تک فکر کا احساس

www.taemeernews.com

کا رنگ نہ دیا جائے غزل اسے قبول نہیں کرتی اور یہ کام آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا Content باریک، مختصر اور لطیف ہوتا ہے...... اتنا لطیف کہ یہ اظہار و بیان کے جادوئی حسن اور غنائیت کے دلکش پردوں پر پرواز کر سکتا ہے۔

قیصر شمیم کا فلسفہ نغمہ بدوش ہے۔ منظومات ہوں یا غزل کے اشعار دونوں صورتوں میں ان کا تعلق اس شعری جمالیات سے قائم رہتا ہے جس میں الفاظ کے متنوع استعمال سے شعری و صوتی نظام قائم ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں اضافتوں کا حسن انہیں اپنے بہت سے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔

جدت قیصر شمیم کے یہاں سنبھل سنبھل کر آتی ہے۔ بہت سے جدید شعراء جدت کی راہ کو روایت سے بالکل الگ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایسے راستوں پر چلتے ہوئے وہ بری طرح گمراہی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ صالح جدت روایت کے انقطاع (Discontinuance) سے نہیں آتی بلکہ یہ روایت کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ روایت سے یکسر اجتناب کرنے کی بجائے اس کا ایسا استعمال ہو جو شعر کے معنوی منظر نامے کو بدل کر رکھ دے۔ اس کا تعلق الفاظ کے نئے تخلیقی استعمال سے بھی ہے۔ اس خوبی و خصوصیت کا اظہار غزل میں زیادہ بہتر طور سے ہو سکتا ہے اس لیے کہ غزل بنیادی طور پر لفظ شناس ہوتی ہے۔ قیصر شمیم روایت کو جدت میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں۔ الفاظ کو نئی تخلیقی توانائی عطا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں الفاظ اور تراکیب اچھے فن کار کے یہاں کبھی متروک اور از کار رفتہ نہیں ہوتے اس لیے کہ وہ یہ ہنر جانتا ہے کہ پرانے لفظوں میں معنوی جہات کیوں کر پیدا کی جاتی ہیں۔ قیصر شمیم کا ایک شعر ہے

بدلا ہوا لہجہ ہے نہ تقریر نئی ہے　　　پھر بھی تری ہر بات میں تاثیر نئی ہے

یہ حقیقت خود ان پر پورے طور منطبق ہوتی ہے۔ قیصر شمیم کی تخلیقی شخصیت کی تربیت ہماری ثابتہ شعری قدروں کے تحت ہوئی ہے اس لیے کہ لفظوں کے استعمال پر انہیں مکمل دسترس حاصل ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تمام تر تخلیقی یورش کے بعد بھی الفاظ مکمل طور پر تخلیقی ہیجانات کو پیش نہیں کر سکتے۔

دل کے اندر جو کچھ بھی ہے لفظوں میں کب ڈھلتا ہے　　　درد لبوں تک آتے آتے اپنی شکل بدلتا ہے

قیصر شمیم کے یہاں شہر کاری کا دکھ، فکر و احساس کے نئے گوشے پیدا کرتا ہے۔ بڑے شہروں میں رہنے والا ہی Urbanization کی تباہ کاریوں کو محسوس کرتا ہے۔ قیصر شمیم بار بار ایک ایسی فضا کے متلاشی نظر آتے ہیں جہاں انسان مصنوعی ماحول میں اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس نہ کرے۔ حساس انسان کو ایک ایسی فضا چاہیے جہاں اسے اپنے وجود کا احساس و ایقان حاصل ہو سکے۔ قیصر شمیم کے مندرجہ ذیل اشعار ان کے اس

www.taemeernews.com

دردوغم کے ترجمان ہیں جو شہر کاری کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں :

شہر میں پایا گیا یخ بستہ ہاتھوں کا تپاک
گرم جوشی گاؤں کی چوپال میں پائی گئی

اب گاؤں سے آتی ہے یہ کیسی خبر قیصر
خط دیتے ہوئے ہم کو ہرکارے لرزتے ہیں

گاؤں کی پرسکون اور روح پرور فضا کی تمنا اور کلکتے جیسے شہر کا قیام قیصر شمیم کی داخلی شخصیت میں جگہ جگہ مسماری پیدا کرتا ہے۔ کچھ کھوتے رہنے کا خوف اور کچھ پالینے کی انہونی خواہش فنکار کو اندر اندر لرزہ براندام کیے دیتی ہے اور اسی لیے فن کار یہ کہتا ہے :

چھوٹے نہ کبھی پھولوں کا نگر کوشش تو یہی ہے اپنی مگر
اک روز اڑا لے جائے گی پتوں کی طرح بے درد ہوا

ریت پر نقشِ کفِ پا نہیں رہنے پاتے
اہلِ صحرا کو کوئی نشانی دینا

نہ بھاگنے کی سہولت نہ سانس لینے کی
اڑا رہا ہے یہاں زہر کا دھواں کوئی

شکستہ خواب کے ملبے میں ڈھونڈتا کیا ہے
کھنڈر کھنڈر ہے یہاں دھول کے سوا کیا ہے

اداس رات کی خاموشیوں میں اے قیصر
قریب آتی ہوئی دور کی صدا کیا ہے

وہ خواب کہ جس کے لیے بھٹکا کیے برسوں
آخر کو یہ سمجھے کہ حقیقت کا دھواں ہے

یہ اور اس طرح کے متعدد اشعار قیصر شمیم کی داخلی شخصیت کی شکست و ریخت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی، نامساعد فضا میں زندگی کے شب و روز گزارتے رہنے کا کرب، لاحاصلی کا غم، مسلسل کھوتے رہنے کا ایک لازوال خوف ...... اور اسی طرح کے بہت سے منفی اور مہلک احساسات ہیں جو فن کار کو اندر اندر کھرچتے رہتے ہیں۔ یہ منفی احساسات سہی لیکن شاید تخلیقیت کو مہمیز کرنے کے لیے ہی وسیلے کا کام کرتے ہیں۔ فن کار کرزور اور خوف زدہ صورتِ حال میں تخلیقی سچائیوں کا بہتر ترجمان بن سکتا ہے۔ قیصر شمیم کے مندرجہ بالا تمام اشعار نیز ان کے علاوہ بھی متعدد اشعار ان کے اصیل فن کار ہونے پر اصرار کرتے ہیں اور ان کے فن کارانہ امتیاز کا اثبات کرتے ہیں۔

قیصر شمیم کے دو اشعار

ہر رخ سے اک چراغ ہے برسوں سے آج تک
دل ہے کہ داغ داغ ہے برسوں سے آج تک

اللہ رے زخم زخم کہ کھلتے ہیں روز روز
دل میرا باغ باغ ہے برسوں سے آج تک

www.taemeernews.com

پروفیسر نصر غزالی
کلکتہ

قیصر شمیم : شکستِ خواب کا نوحہ خواں

جناب قیصر شمیم کے شعری اکتسابات پر اظہارِ خیال کے لیے میں نے قلم سنبھالا تو مجھ پر کھلا کہ یہ بھی مات ہونے تک کے مرحلۂ دشوار سے کچھ کم نہیں۔ وہ ساری صفت جس نے اپنے نام پر عمید انکسی اور قیصر شمیم کا لیبل ہی نہیں لگایا بلکہ اپنی پوری ذات پر ایک پردۂ طلسم ڈال رکھا ہے۔ اس کی دریافت کی ہر کوشش رایگاں ثابت ہوگی اور رسوائی کا سبب بنے گی۔ اس کا اندیشہ ہے مجھے۔ مگر خوشتہ دبے نوشتہ جھیلنے کے لیے پیدا ہوئے لوگ جن کی ہر بازی مات پر ختم ہوتی ہے ایک آدھ چوٹ اور سہہ لیں تو فرق ہی کیا پڑتا ہے۔

میں عمید انکسی سے کبھی نہیں ملا۔ عبدالقیوم خان سے بھی میری ملاقات نہیں ہوئی۔ جس مردِ فقیر سے ملنے کا شرف حاصل ہوا وہ قیصر شمیم تھے۔ بہت بعد میں یہ راز کھلا کہ موصوف ہی عبدالقیوم خان اور عمید انکسی ہیں۔ یہ جان کر کچھ کچھ حیرت تو ضرور ہوئی مگر اس سے زیادہ افسوس ہوا کہ شکل وشباہت وضع قطع اور رفتار وگفتار سے مجذوب یا اس سے کچھ کم ہی نظر آنے والا شخص پٹھان ہے۔ انکسار وبردباری کی لیس جسم وجاں پر سجائے رکھنے والے قیصر شمیم کا پٹھان ہونا، جچا نہیں۔ خان تو اسے ہونا زیب دیتا ہے جس کے طور طریق پر پٹھانیت کی گوٹ چڑھی ہو اور جو قیصر شمیم کی طرح نرم دمِ گفتگو ہرگز نہ ہو۔ طرفہ تماشا یہ کہ موصوف جیتے ہیں Computer Age مگر شاعر دکھائی دیتے ہیں اڑن طشتری کے زمانے کے ہیں اس کی وضاحت میں میں نہیں جاؤں گا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ڈھیلا ڈھالا کرتا، چوڑی مہری کا اونچا پاجامہ، بغل میں جھولا اور منہ میں پان یہ تمام لوازمات بیک وقت کسی میں Revical سے جڑے نظر آئیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ قیصر شمیم دریافت ہو گئے۔

قیصر شمیم کی حیاتِ شاعری کافی طویل ہے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "ساعتوں کا سمندر" یہ اطلاع فراہم کرتا ہے کہ دس گیارہ سال کی عمر میں ہی وہ لفظوں کا تانا بانا بننے لگے تھے اور ۱۹۵۱ء میں جب وہ پندرہ کے ہوئے تو محبوبۂ سخن کے اسیروں میں باقاعدہ طور پر شامل ہو گئے۔ گویا وہ شاعروں کی اس پیڑھی سے تعلق رکھتے ہیں جو آزادی کے بعد سامنے آئی۔ پٹھان ہونے کے ناطے پیشۂ آبا سپہ گری تھا یا نہیں میں نہیں جانتا مگر مجموعے کے

www.taemeernews.com

حوالے سے یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شاعری نہ تھا۔ اسی لیے اپنی شاعری کو انھوں نے ورثۂ آبا نہیں کہا۔ یہ بقول ان کے عطیۂ استاد بھی نہیں۔ ورثۂ آبا تو سمجھ میں آنے والی بات ہے مگر عطیۂ استاد سے روئے سخن کس کی جانب ہے اس کی وضاحت وہی کر سکتے ہیں۔ شاعری کو انھوں نے اپنا پیشہ بھی قرار نہیں دیا ہے اور نہ ہی سنڈے پینٹرز کی طرح اتوار کا مشغلہ کہا ہے۔ ''ساعتوں کا سمندر'' کے حوالے سے ان کے شعری رویے کی وضاحت یوں ہوتی ہے :

> ''میرے نزدیک شاعری ساعتوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے ہاتھ
> پاؤں مارتے رہنے کے عمل سے ملتا جلتا ایک عمل ہے لیکن سخت تر اور لطیف۔''

ساعتوں کے سمندر میں ڈوبنے ابھرنے کی شروعات کلاسیکی روایات سے ہوئی مگر وقت کے ایذا رساں تھپیڑوں نے بعد میں انھیں اس طرزِ فکر کا دیوانہ بنایا جس پر سماجی ذمہ داری کا رنگ چڑھا تھا اور وہی طرزِ فکر ان کی پہچان کا وسیلہ بنی۔ اس میں دو رائے نہیں کہ اس دور کے سماجی اقدار و نظریات ان کی ذہنی و فکری تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور چھٹی دہائی کے اوائل تک نظریاتی تصورِ شعری ہی ان کے ذہن پر غالب رہا مگر تخلیقیت کی راہ میں جب فکر و نظر کا نیا موڑ آیا تو انھیں رد و قبول کی منزل سے گزرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ بند دروازے کے شاعروں نے جس تصورِ شعری کو مجہول و مفلوج ذہنوں کی پیداوار کہا وہ قیصر شمیم کے دل کو بھایا۔ اس کے بعد ان کے فکر و اظہار میں جو نمایاں تبدیلی آئی اسے اچھی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں بات کو آگے بڑھاؤں ان کے مجموعۂ غزلیات ''سانس کی دھار'' کے مقدمہ بعنوان ''جواز'' کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔

> ''میری شاعری نہ کبھی میری ذات سے جدا رہی ہے نہ میری حیات سے نہ
> معاشرے سے نہ کائنات سے۔ گذشتہ چالیس پینتالیس سال کے دوران میرے
> ذہن و دل کو ہوائے وقت کی مسرت انگیز لہریں کم اور ایذا رساں تھپیڑے زیادہ متاثر
> کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس مدت میں قدم قدم پر میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے
> اسے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے۔''

اس اقتباس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس سے شاعر کے شعری رویے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے دوسری طرف اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ جو شاعر کسی زمانے میں پابندِ نظریات تھا اسے یہ کہنے میں اب کوئی جھجک نہیں کہ اس نے جو کچھ محسوس کیا اسے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی۔

لکھنے کو تو قیصر شمیم نے یہ لکھ دیا ہے کہ ان کی شاعری میں ذہنی تحفظ کا کوئی دخل نہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی ہے۔ میں ان ہی سے ایماندارانہ طور پر پوچھنا چاہوں گا کیا اندر ہی اندر سلگتے رہنے

www.taemeernews.com

کی کیفیت، شدید احساسِ محرومی اور ان کا اسلوبِ سخن کیا یہ مخصوص رجحان کے اشاریہ نہیں ہیں؟ اس کے باوجود وہ انکار کرتے ہیں تو میں یہی کہوں گا کہ آخری فیصلہ وقت کو کرنا ہے مگر کم بخت وقت بھی تو کبھی کبھی فیصلہ غلط ہی کرتا ہے ورنہ حافظؔ کو صدیوں قبل زمانے سے یہ گلہ نہ ہوتا کہ :

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

اور نہ آج قیصر شمیم یوں شکوہ کناں ہوتے :

ذہانتوں اور محنتوں کی جو قدر بھی ہے تو بس یہی ہے

کہ ان کے ماتھے پہ اک ستارہ بلند قامت سفارشوں نے بنا دیا ہو

تو ان کی قیمت بہت بڑی ہے وگرنہ قسمت بہت بری ہے

قیصر شمیم تقریباً پینتالیس برسوں سے دادِ سخن دے رہے ہیں۔ یہ طویل سلسلۂ سخنوری اور اس کا حاصل دو تین شعری مجموعے اور بس۔ بے نیازانہ جینے کی اپنی افادیت ہو سکتی ہے بلکہ ہے بھی مگر نقصانات کی فہرست کچھ لمبی ہی ہوا کرتی ہے۔ مردِ فقیر گرہ میں مال کا رونا روتا رہا۔ کاش اپنے سلیقہ شعار یاروں سے زندگی کرنے کا ڈھب سیکھ لیا ہوتا جو ہواؤں میں بھی گرہ لگانے کا ہنر جانتے ہیں۔ میری کارکردگی سے واقف احباب میرے اس کھوکھلے مشورے پر ہنس رہے ہوں گے کہ ناکارہ لوگوں پر ہنسا ہی جا سکتا ہے۔ ناکارہ لوگ کچھ کرتے بھی کہاں وہ تو صرف مشورے دیا کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے پچھلے سال مجھ سے پوچھا کہ آپ کے مجموعے کو نکلے زمانہ ہو گیا دوسرا کب تک آرہا ہے؟ میں اس کے سوا کہتا بھی کیا کہ پہلے پر جمی گرد کو صاف کرنے سے فرصت ملے تو دوسرے کی سوچوں۔ اور صورتِ حال منٹو کے الفاظ میں جب یہ ہو کہ آدھ سیر کوئلے شاعر کے دو دیوانوں کے مقابلے میں زیادہ دیر تک جلتے ہوں اور زیادہ گرمی پہنچاتے ہوں تو آدمی شاعری کی بجائے کوئلے ہی چننے کا کام کیوں نہ کرے۔ مگر قانونِ قدرت یہ ہے کہ جس کا جو کام ہے وہی اسے کرتا ہے۔ قیصر شمیم کی ہتھیلی پر جو ریکھائیں ہیں ان کا سلسلہ سخنوری سے ملتا ہے کوئلے سے نہیں۔ اور اگر کوئلے سے ملتا بھی تو اس شاعرانہ ادا سے وہ چنتے کہ اپنی خاصیت بھول کر کوئلہ بھی شاعروں جیسا ناکارہ ہو جاتا ہے۔ خدانخواستہ شمیم صاحب کو میں نے ناکارہ نہیں کہا۔ میں تو ان کی اس بے نیازی کے ساتھ ان کی اس مجبوری کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اطمینان کی سانس لینے والے فرد کی طرح جینا انھیں کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ وہ ہمیشہ ہی خانوں میں بٹے رہے اور چاہتے ہوئے بھی کسی ایک خانے پر اپنی توجہ مرکوز نہ کر سکے۔

قیصر شمیم کا سرمایۂ شعری مختصر سہی مگر ان کے شعورِ شعری کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ ان کی شاعری کو میں ان کی شناخت کا تخلیقی اور حسیاتی اظہار کہوں تو نامناسب نہ ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اسے لمحۂ گزراں کی

www.taemeernews.com

تخلیقی دریافت کا خوبصورت عمل بنادیا ہے مگر وہ برا نہ مانیں تو میں یہ بھی کہوں کہ ان کے یہاں جتنی پھیلاؤ کی کمی ہے۔ مجموعی تاثر بھی قایم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نارسائی کا سفر ہے۔ ایک ایسے آبلہ پا کی روداد ہے جو وقت کی تیز تپتی ہوئی ریت پر چل رہا ہے یا چلنے پر مجبور ہے۔ کچھ ترقی پسندرجائی حوالے ضرور ملتے ہیں اور حوصلہ نہ ہارنے کا وہ رویہ بھی جو چوتھی اور پانچویں دہائی کے شعراء میں خود بخود ابھرتا تھا مثلاً :

تھکن تو راہ کا اک موڑ ہے ٹھہرنا کیا ۔۔۔ اسی خیال سے پھر اٹھ کے چل پڑا ہوں میں
خاک ہو جانا مگر دوشِ ہوا پر رہنا ۔۔۔ فرض ہے دشت میں یہ حدِ سفر مجھ پر بھی
اپنا کنواں ہے اپنا پانی پھر کیوں پیاس ہو قسمت میں ۔۔۔ اپنے حق سے ہاتھ نہ کھینچو کس کو خبر ہے کل کیا ہو

مگر بالادستی اسی تصور و تاثر کو حاصل ہے جسے موجودہ نظام کے عطا کردہ تہذیبی و معاشرتی جبر کی پیداوار کہنا چاہیے۔ یہ کوئی غیر فطری عمل بھی نہیں اس لیے کہ قیصر شمیم نے فنی بلوغت کی منزل میں قدم رکھا تو یہی دیکھا کہ وہ ساعتوں کے سمندر میں ڈوبنے ابھرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ قیصر شمیم نے اپنے مجموعۂ غزلیات کا نام" سانس کی دھار" رکھا ہے۔ یہ محض ایک کتاب نہیں شاعر کی تخلیقی شخصیت کا ایک استعارۂ کرب ہے۔ آتی جاتی سانس اس کے حق میں ایک ایسی دھار ہے جو اسے مسلسل کاٹتی جارہی ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ اجل کے آنے تک نہ جانے اور کن کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑے :

ابھی تو کاٹ رہی ہر ایک سانس کی دھار ۔۔۔ اجل جب آئے تو دیکھوں کہ انتہا کیا ہے

"سانس کی دھار" میں خواب ملتے ہیں مگر خواب سے زیادہ شکستِ خواب کے عکس دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر معاشرے کا ایک حساس اور باشعور فرد سمجھا جاتا یا اس کا شمار دیدہ وروں میں ہوتا تو کیا ضروری ہے کہ اس کی آنکھیں ایک ہی طرح کے منظروں کے لیے کھلی رہیں۔ مثالیں بہت سی ہیں مگر میں چند ایک پر اکتفا کروں گا

نہ بھاگنے کی سہولت نہ سانس لینے کی ۔۔۔ اُڑا رہا ہے یہاں زہر کا دھواں کوئی
رات آئی ہے فصیلوں میں گھرے رہنے کی ۔۔۔ جس طرف جاؤ گے دیوار سے ٹکراؤ گے
آنکھوں میں کسی کی بھی اب نیند نہیں آتی ۔۔۔ یہ کون سی لوری ہے گہوارے لرزتے ہیں
شجر شجر پہ نئی رت نے کیا اثر ڈالا ۔۔۔ خزاں جو کر نہیں سکتی تھی وہ بھی کر ڈالا
خواب دے گا وہ اگر آنکھوں کو ۔۔۔ عمر بھر نیند نہ آنے دے گا
ریت پر بنتے بگڑتے کچھ نقوش ۔۔۔ لیجیے آپ کی دنیا ہوئی
مری صداؤں کی پلکیں بھی بھیگ جاتی ہیں ۔۔۔ نہ جانے کون مرے دل میں چھپ کے روتا ہے

www.taemeernews.com

کل کے سماج میں شاید لوگوں کو لوگ تب کھوتے تھے جب سانسوں کا سلسلہ ٹوٹتا تھا لیکن آج کے خود غرض اور سفاک معاشرے کا آدمی سانسوں کا تار کٹنے سے پہلے ہی ایک دوسرے کے لیے جنسِ گم شدہ بن جاتا ہے۔ موجودہ دور کی اربن سوسائٹی کا یہ المیہ ہے۔ قیصر شمیم کو جس شہر اور ماحول میں جینا پڑ رہا ہے وہاں کی اکثریت آدمی سے زیادہ روبوٹ بن چکی ہے اور مشینی خصایل رکھتی ہے لوگ اس قدر صنعت زدہ ہو چکے ہیں کہ اقتدار و اختیار اور عہدہ و مرتبہ ہی ان کا پیمانۂ قدر بن گیا ہے۔ منافقوں اور ریاکاروں کے بیچ جینے والے شاعر کے احساسات پر جب ضرب لگتی ہے تو کبھی کبھی اس کی نرم گفتاری بھی تلخ نوائی اور لطیف طنز میں بدل جاتی ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار پیش ہیں جن سے میرے خیال کی تصدیق ہو گی :

پشت پر " وار کس کا یہ بتاؤں کس طرح
دوست ہی پیچھے تھے میرے اور تو کوئی نہ "

مرے خلاف ہی دیتے ہیں مشورے مجھ کو
خلوص رکھتے ہیں میرے مشیر میرے ساتھ

تیر لفظوں کے چلاتا ہے وہ غیروں پر مگر
وار کرتا ہے بہ انداز دگر مجھ پر بھی

ناپ رہا ہے تو کیوں اونچے عہدوں سے
میرا قد چھوٹا ہے بابا تیرا کیا

لفظوں کے رس گھلے میرے پاس نہیں
تلخ اگر لہجہ ہے بابا تیرا کیا

داد و فن کا سلسلہ ختم کرنے سے پہلے میں یہ چاہوں گا کہ چند باتیں قیصر شمیم کی نظموں سے متعلق بھی کہوں مگر دشواری یہ ہے کہ جو دو شعری مجموعے میرے سامنے ہیں ان میں سے ایک غزلیات پر مشتمل ہے اور دوسرے میں کل ۱۶ نظمیں ہیں۔ سنا ہے کہ نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ مگر مجھ تک ہنوز نہیں پہنچا۔ اس لیے جو باتیں ہوں گی ان ہی ۱۶ نظموں کے حوالے سے ہوں گی اور مختصر ہوں گی۔ میں اپنی بات چند جملوں میں ختم کرنا چاہوں تو یہی کہوں گا کہ موضوع کے اعتبار سے ان کی غزلوں اور نظموں میں زیادہ فرق نہیں۔ سب کی سب ایک ہی مخصوص مزاج اور رویے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے۔ نظموں کی سرحدیں بھی زندگی اور معاشرے کی شکست و ریخت اور اس معاشرے میں سانس لینے والوں کی نارسائیوں اور ناآسودگیوں سے ملتی ہیں۔ خوبی ان نظموں کی یہ ہے کہ ابہام و اشکال کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اس لیے ابلاغ و ادراک میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ "تاش کے پتے، ایک صبح، انقلشن، تہذیب کا زندانی، اسپ تازی شدہ مجروح، گم شدگی" نمائندہ نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔ "گم شدگی" نہایت مختصر سی مگر بلیغ نظم اور اسے انسان کی بے وجودی کا خستہ اظہار کہنا چاہیے۔ نظم یوں ہے :

اپنی اپنی گم شدگی کی دنیا میں / اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں ہم نادان!
کون یہاں ہے، جس سے پوچھیں اپنا پتا، اپنی پہچان!

www.taemeernews.com

ظہیر انور
کلکتہ

قیصر شمیم : شخص اور شاعر

اکثر ادب عالیہ میں شخصیت اور فن کے درمیان بعد کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ لیکن ایسی ہی مثالیں جن میں شخصیت کا پرتو فن پر گہرے اثرات مرتسم کرتا ہے، تحریری ادب کے ہر صفحے پر تلاش کی جاسکتی ہیں۔ قیصر شمیم کی نئی کتاب ''تری دھارا'' (ہندی رسم الخط) کچھ ایسی ہی کیفیات کی حامل ہے جہاں شخصیت اور شاعری کے اتصال نے ایک عجیب سا جال بن رکھا ہے۔ 'تری دھارا' میں مضمر فکر و فن اور اس کے حقیقی منبع اور مصدر کی تلاش میرے لیے تخلیق کار کی شخصیت کے حوالے سے ایک ناگزیر عمل بن گیا ہے۔ برسوں سے میں قیصر شمیم صاحب کی شخصیت اور فن کا ذاتی طور پر گواہ رہا ہوں لہٰذا ان کی شاعری میں بلندیٔ فکر کی تلاش، عصری سماجیات کے پہلو بہ پہلو ان کے خواب اور لاشعور میں پلنے والی کیفیات کا اندازہ لگانا اور معروضی طور پر تجزیہ کرنا، ایک ایسا شعوری عمل بن گیا ہے کہ جس کے تحت ہی میں شاعر اور اس کی شخصیت دونوں کے مزاج اور فضا کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ فن شخصیت کا مظہر ہوا کرتا ہے۔ فن کار کا ماضی، اس کی زندگی کے ابتدائی نقوش، دنیا، سماج اور ماحول سے اس کا ناتا اور رابطہ نیز زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ نسلی اور خاندانی مشاہدات اور تجربات اس کے فن کے تار و پود بنتے ہیں۔ تخلیق کی ایک سطح ذاتی ہوا کرتی ہے جس کی جڑیں لاشعور میں پیوست ہوتی ہیں۔ ایک تخلیق فن کار کی ذاتی فتح ہوسکتی ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ کوئی Isolated حادثہ نہیں۔ اس تخلیق کی تکمیل میں ماضی سے لے کر ماحول تک کے مشاہدات کی شعوری اور لاشعوری شمولیت ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ناتراشیدہ اور غیر تسلی بخش جذبہ بھی جب رنگ افشانی کرتا ہے تو تخلیق مکمل ہوتی ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ماضی کی کوئی یاد، حادثہ، غم یا دکھ یا خوشی کے حوالے سے فن کار فن کی تکمیل کرتا ہے۔ یہ فن اور شخصیت کا نفسیاتی پہلو ہے۔ وٹمن نے اپنی شاعری کے سلسلے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب آپ کسی کتاب کو چھوتے یا پڑھتے ہیں تو درحقیقت ایک شخص کو یا بالفاظ دیگر کتاب کے تخلیق کار کو پڑھتے اور چھوتے ہیں۔

قیصر شمیم کی شاعری اور شخصیت کے مخفی گوشے میرے لیے اس تعلق سے آشکار ہونے کے امکانات رکھتے ہیں۔

www.taemeernews.com

قیصر شمیم کا علمی اور ادبی سفر بہت طویل ہے۔ نصف صدی پر محیط یہ سفر مختلف پڑاؤ سے گزر کر آج آبدار ہوا ہے۔ اس طویل عرصے کا تجربہ اور مشاہدہ انسان کو کمزور بھی بنا سکتا ہے اور آتشِ سیال کی طرح خطرناک لاوے میں بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ ان کی زندگی کھلی کتاب کی طرح بیشتر لوگوں کے سامنے رہی ہے اور اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قیصر شمیم کی حیثیت ایک دبستان سے کم نہیں۔ ایک ایسا شجرِ سایہ دار جس کی چھاؤں میں سستانے اور اپنے فن کو مربوط اور پختہ کرنے کے لیے سینکڑوں شاعر یا ادیب رکے ہیں۔ وا‍‍ یہ ہے کہ قیصر شمیم اردو ادب اور علم کے ان بے لوث خدمت گزاروں کی صف میں انتہائی معتبر ہیں جنھوں نے پوری زندگی اس زبان اور فن کی شائستگی کو بچانے میں لگادی۔ نصف صدی تک علم و ادب کی خدمت کرنے کے صلے اور ستائش سے یک گونہ بے خودی کا شکار رہنا کم بڑی بات نہیں۔ اپنی زبان اور فن سے ان کا قلبی لگاؤ کلکتہ اور ہوڑہ کے علاقے کا ایک نادر واقعہ ہے۔ ظاہری خد و خال کو بیان کیے بغیر ان چند صفحات میں ان کے شخصیاتی مطالعے کا قرض پورا کرنا کارِ دارد ہے۔ میں صرف ان کی پچاس سالہ خدمات ادب اور اپنے رفقائے کار سے ان کے حسنِ سلوک کے حوالے سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں جو مجھے ان کی شاعری کا محرک بھی نظر آتے ہیں۔ اصل میں شخصیاتی مطالعے کے لیے کسی شخص سے صرف ملنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس کی تحریر، اس کی گفتگو، اس کے خواب اور ذاتی انسلاکات کا بھی، جو ادب اور سماج کی سطح پر اسے فعال بنائے رکھتے ہیں ادراک رکھنا نہایت ضروری ہے۔ متذکرہ شخص کے قلبی واردات اور حسنِ سلوک کا غائر مطالعہ بھی اہم ہے کہ انھیں راستوں سے ہو کر اس کی شخصیت کے مخفی گوشوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

قیصر شمیم کی شخصیت پہلو دار ہے۔ ایک نوع کی درویشی کو برقرار رکھتے ہوئے وہ مجلسی بھی رہے ہیں۔ ان کا کردار بڑی حد تک صاف اور ذاتی سطح پر بے باک بھی رہا ہے۔ لیکن کردار کی کرشمہ سازیاں اور اس میں رنگ و روغن، اس کی بشر دوستی اور رفقائے کار سے حسنِ سلوک تیز سماجی سطح پر پابندیوں اور مصلحتوں کے دبیز پردے کردار میں رنگ آمیزی کرتے ہیں اور اسے منفرد بناتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وقت نے قیصر صاحب کو بہت ہی نرم و نازک بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا احساس بھی متاثر ہوا ہے۔ یہ ساری باتیں فن کار قیصر شمیم کی شخصیت کے اہم پڑاؤ بھی ہیں۔ انھوں نے ایک طویل عرصے میں جو سرمایۂ حیات جمع کیا ہے، وہ ان کی شخصیت کا ایک معتبر حوالہ بن چکا ہے۔ وہ خود سر نہیں، منہ پھٹ نہیں، گستاخ نہیں، سنگ دل نہیں، گفتار میں نخوت کے نشان تک نہیں، دوسروں کے نفع و نقصان کے ساتھی، دوسروں کے غموں کے شریک کار، وہ ایک ایسے فن کار کے روپ میں ابھرے ہیں جنھوں نے اپنی طرف نگاہ کم کی اور غیروں کی ذہنی تشکیل و تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ چوں کہ وہ لسانی اعتبار سے اپنی

www.taemeernews.com

زبان کا گہرا ادراک رکھتے ہیں، اور فن کے رموز سے کما حقہ واقف ہیں۔ لہٰذا درس و تدریس کا طریق کار ان کے تعلق سے انتہائی کارگر ثابت ہوا ہے۔ تعلیمی اور تدریسی کاموں سے منسلک رہنے کی وجہ سے اور طبیعت کی نرمی، ہمدردی اور شگفتگی کی بنا پر ان کے احباب اور شاگردوں کا وسیع حلقہ نہ صرف ان سے فیض یاب ہوا ہے بلکہ چند ایک نے تو ادب میں بھی اپنی جگہ بنالی ہے۔ ایک اچھا استاد، فطری قرابت اور انس، اپنے علم کی گہرائی اور دانش مندی، اپنی انکساری، وضع داری اور پاس داری سے اپنے شاگردوں اور رفیقوں کو گہری بصیرت فراہم کرتا ہے۔ قیصر شمیم میں یہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ اپنے وسیع تر حلقے کے نمایاں دانشور ہیں اور ان کے گرد جمع یہ حلقہ ہمہ وقت تخلیقی طور پر مصروف کار نظر آتا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ ان کی تخلیق کی سطح کس حد تک قابل قدر ہے)۔ ایک ذرا اور تحقی سے احتساب کریں تو ان کی شاعری اور شخصیت سے جو خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے، اس میں غم والم اور نالہ و شیون سے قلبی رشتے کا سراغ ملتا ہے۔ ذاتی نقصان کا حوالہ ہے، دل آزاری اور دل شکنی سے دور کا بھی علاقہ نہیں، اور وہ " زہر فیہ موضوعات واثرات سے پاک رہے ہیں۔ ان ساری چیزوں نے انھیں ایک بہترین انسان اور قابل تقلید استاد بنا دیا ہے۔

میرے چند سوالات اس بے پناہ شخصیت پر ہیں اور اسی حوالے سے ان کی شاعری پر بھی!

اگر اس طویل عرصے میں وہ مصالحتی انداز فکر سے گریزاں رہے یا حاکم وقت اور جاہ و حشمت کی جبہ سائی نہیں کی تو انحراف کی کیسی لے اور احتجاج کی کیسی صدا بلند کی؟ زبان و بیان پر بے پناہ قدرت رکھنے کے باوجود زبان کے ذخیرے اور لسانیات کے پہلوؤں کو کہاں تک روشن کیا؟ اگر وہ سنگ دل نہیں، گستاخ نہیں، خود سر نہیں، نفع و نقصان سے بے نیاز ہیں تو یہ اچھی بات ہے لیکن وہ درویش سدا مست کا غصہ کہاں ہے جو اپنی پرواہ کیے بغیر حاکم وقت سے لے کر سماج کی پراگندہ خلقت کو خاکستر کر دے۔ ان کی تحریریں دردمندی کے عناصر سے لبریز ہیں لیکن بے مثال خوش گواری اور پرستش کرنے والی وہ بھی اس قدر کم یاب کیوں ہے جو موجود حقیقت اور واقعات کے مشاہدے سے نمو پذیر ہوتی ہے۔ ان کی شاعری اپنے عصر کا ایک حوالہ ہے لیکن یہ حوالہ وہ جوالہ مکھی کیوں نہیں بنتا جو قاری سے سرفروشی کی تمنا کرتا ہے۔ تمام شعری صنعت گری پر قادر ہونے کے باوجود غالب رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کا قائل نہیں رہا ____ لہو کی آنکھ سے جاری ہونے پر جوشِ فکر کا جو اندازہ ہوتا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ذہنوں کی تربیت و تشکیل کا صلہ تو خیر ان کے نام ہوگا ہی لیکن انا کی ڈور کو اس قدر ڈھیل چھوڑ دینا اور معاشرے میں مسلسل جنم لینے والی بد لعلیوں کو انکساری اور ایمائیت کے ساتھ نشانے پہ رکھنا ____ کیا یہ موبت کی مثالیں نہیں۔ ہمیں قیصر شمیم ایک قد آور اور نامور شاعر چاہیے شاعر گر یا ادیب گر نہیں۔

www.taemeernews.com

اصل میں شاعر کا ردعمل حساس اور دردمند ہونے کے باوجود روایت سے منحرف نہیں۔ وہ نیا رنگ و آہنگ جو اے میں" ساعتوں کا سمندر" کے بعد ہماری شاعری کو آب و رنگ عطا کر رہا تھا، اپنی کلاسیکی قدروں کے باعث ذرا کم کم ثمردار ہوا ہے۔ ایسا کہنے سے میری مراد یہ نہیں کہ قیصر صاحب کی شاعری میں Dimensions نہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فکر و فن سے مکمل آگہی کے باوجود ان کی طبیعت نے گوشہ نشینی کو اپنی ذات اور اپنی شاعری پر تطبیق کر کے اپنے فن کو نالۂ شیون سے تو لبریز کیا ہے جو ان کی شاعری کا انتہائی بلیغ اور روشن پہلو ہے۔ لیکن تقاضائے وقت کے تحت سرفروشی اور سرخوشی کی جو لے ہونی چاہیے تھی اس سے راہ و رسم کم رہی۔

آیئے! اب شاعر سے دو بدو ملتے ہیں :

" تری دھارا" میں غزلیں بھی ہیں، نظمیں اور گیت بھی۔ اس مجموعے کے سرسری مطالعے سے بھی یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ شاعر نے کسب فن سے کسی لمحے بھی آنکھ نہیں چرائی۔ پہلی نظر میں جو چیز مجھے متاثر کرتی ہے وہ اظہار بیان ہے جو نہ صرف صاف، شستہ اور شگفتہ ہے بلکہ بہت نمایاں بھی۔ ان غزلوں، نظموں اور گیتوں کا مطالعہ کیجیے تو اس کے آئینے میں آپ کو ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر اور ایک انتہائی دردمند خود آگاہ مگر ایک ذرا کم حوصلہ انسان ملے گا۔

"You touch the book and you touch the man, you touch the book and you touch the man." قیصر صاحب کی شاعری فصاحت اور بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ شاعری اپنی جملہ کیفیات میں انتہائی دھیمی اور پل پل سلگتی آنچ کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ سادگی اور پُرکاری نیز اسلوب بیان میں پر لطف یہ شاعری جملہ عیوب سے پاک ہے۔ آپ پوری شاعری کو پڑھ جائیں شاعر کا ایمائی لہجہ، صنعتِ شعر پر قدرت، غم و الم کا غالب عنصر اور بشر دوستی کا خوب صورت آمیزہ آپ کے شعور کا حصہ بنے گا۔ اگرچہ خیال اور فارم کے لحاظ سے بڑی حد تک یہ روایتی اور کلاسیکی شعریات کا حصہ ہے تاہم یہاں عصر کا دل بھی دھڑکتا ہے جس عہد میں شاعر جی رہا ہے، اور جس انداز کے روح فرسا مناظر کا وہ گواہ ہے۔ اس کی صاف تصویر یہ شاعری پیش کرتی ہے۔" ساعتوں کا سمندر" ایک اہم قدر ذات کی شناخت تھی۔ یہاں شاعر کی نگاہ ذات کے نہاں خانے سے نکل کر کائنات کو اپنے حصار فکر میں لینے کی کوشش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں رموز سخن سے آگہی اور زبان کی شائستگی ہے۔ لہجے کی دھیمی آنچ ہے اور فکر کی میانہ روی ___ یہ شاعری قیصر شمیم کی شخصیت کے بنیادی گوشوں اور بدلتے ہوئے حالات کے اثرات سے بھی ہمارا تعارف کراتی ہے۔ مثالیں دیکھیے :

سرمایۂ حیات ہمارا بھی تو ہے   میراث میں یہ کثرتِ آلام کون لے

www.taemeernews.com

احترامِ غم ایام ہی کرتے گزری | زندگی یوں ہی سحر و شام کرتے گزری

میخانے کی یہ اچھی تنظیم ہوئی | ساغر ساغر تشنہ لبی تقسیم ہوئی

کبھی خطرہ رہزنوں کا، کبھی خوف رہبروں کا | کہیں عمر کٹ نہ جائے اسی طرح بزدلی میں

بے مکانی کی خلش ختم یہاں کیوں کر ہو | ریت ہی ریت ہے، تعمیر مکاں کیوں کر ہو

قیصر وطن میں رہ کے بھی اپنا یہ حال ہے | جیسے کوئی ظفر کسی اجڑے دیار میں

ہمیں بھی اپنا ثنا خواں قرار دے لینا | ہمارے شعروں کے تیور تو چھین لو پہلے

کیوں خاطرِ نازک پہ گزرتے ہیں گراں ہم | سب کچھ ہیں مگر شکوۂ بے جا تو نہیں ہیں

ان اشعار سے ایک محترم شاعر کی شبیہ ابھرتی ہے جو فن کے رموز سے آگاہ ہے۔ غم کی شائستگی کو اولیت کا درجہ دیتا ہے۔ اپنی شہرت کو درد کے حوالے سے ہی معتبر جانتا ہے۔ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے کھنڈر میں رقصِ ضیا سے زیادہ شعلوں کا رقص دیکھتا ہے۔ اپنے عہد اور اس کی سفاکی سے آگاہ ہے اور اپنے مخصوص ایمائی لہجہ میں طنز کے نشتر بھی چلاتا ہے۔ طبقہ بندی سے لے کر بے مکانی کی خلش اور تعمیر مکان کے پردے میں شہر شہر قریہ قریہ ریت گھر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ شاعری نرمی سے احتساب کرتی ہے تشنہ لبی کی، موجودہ عہد کی بے چہرگی کی، ریت ساحل سمندر کے استعاروں کے وسیلے سے پیاس کی شدت کی ____ فصیلوں میں گھری ہوئی رات اور شہر کا منظر، ظاہر و باطن کی خلیج، خواب اور حقیقت کے درمیان کا فاصلہ، دل شکستہ سے نکلی ہوئی صداؤں کا تعاقب اور مظلوموں کا ذکر خیر، شعلے اور پھول مناسب سی دنیا کا ایک پیکر، سخن شناسی کی چاہ اور اپنی سزاؤں کی غیر واجبی طلب ____ یہ سب اور اپنے عہد کی اور بھی کئی نہاں اور عیاں واردات اور کیفیات کے تعلق سے قیصر صاحب کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے اور اس شاعری میں ذرا جھانک کر سوچیے تو قیصر صاحب کی شخصیت کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ وہ خلاق ذہن بھی ابھرتا ہے جو تصوراتی سطح پر ذات اور کائنات کے مسائل سے نبرد آزما رہا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ شاعری ایک طرح سے قیصر شمیم شخص اور قیصر شمیم شاعر کے درمیان Intimate یا Interior Monologue Dialogue ہے جہاں شاعر اور شخص دونوں ہی اپنے کم مائیگی اور سماج کی بالادستی کا ادراک رکھتا ہے ____ اور پھر زبان کی صفائی اپنے تصورات قاری کے حوالے کر دیتا ہے۔

قیصر شمیم کی غزلوں کا ایک وصف غزلوں کا تسلسل بھی ہے۔ ان کے مافی الضمیر کے اظہار میں یہ تسلسل، واردات اور مشاہدات کو ایک وسیع تناظر میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ مثلاً ان کی ایک غزل :

کہاں ہے کوئی خدا کا، خدا کے بندوں میں | گھرا ہوا ہوں ابھی تک انا کے بندوں میں

www.taemeernews.com

میں انسان کی نفسیات، اس کے جذبات اور اس کی وضع کردہ سماجیات کا ایک جامع تصور ابھرتا ہے۔ شاعرانہ صنعت میں یہاں بھی کوئی جھول نہیں، ابلاغ و اظہار کا کوئی مسئلہ نہیں، عصرِ حاضر کے آدمی کی تصویر، اس کے بنائے ہوئے سماج پر ایقان کی کمی، تشکیک، ڈر، بےزاری، یہاں تک کہ خود اذیتی نے پوری غزل کو غزل مسلسل کا روپ دے دیا ہے۔ اگر کوئی بات کھٹکتی ہے تو شاعر کے فکر کے حوالے سے کھٹکتی ہے۔ فکر کو غزل کی روایت کے عین مطابق نرم و ملائم روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن روایت اور تجربے نیز انحراف اور انہدام کے امکانات مدھم ہیں۔ سادگی کے ساتھ والہانہ پن اور حیرت انگیزی کا باہم دیگر اتصال ہوتا تو غزل کی نئی شعریات کو یہ بنگال کا تحفہ ہوتا۔

''تری دھارا'' کا ایک حصہ نظموں اور ایک حصہ گیتوں پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں حصے نہ صرف جاندار ہیں بلکہ ہمارے لیے تازہ کار فکر اور نادر خوشبوں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ ان کی اکثر نظموں اور گیتوں کا معیار اعلیٰ ہے۔ خصوصاً گیتوں کے سلسلے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گیت نہ صرف موسیقی ریز اور فکر آسا ہیں بلکہ شاعر کی دردمندی اور اس صنف کی مخصوص لفظیات پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ نظموں اور گیتوں کی اکائی ایسی مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہے کہ ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہے اور انھیں ادھر ادھر کرنے سے شاعر کی بےپناہ سادگی اور پرکاری پر حرف آ سکتا ہے۔ گیت کے یہ ٹکڑے دیکھیں:

تیرے روپ کی چرچا ہوگی
جگ میں تیری پوجا ہوگی
اپنی کلا کا امرت دے کے
آ میں تجھے امر کردوں
سنگار کروں

یا پھر

ان کے آنگن روز گھٹائیں ٹوٹ کے برسیں
ہمیں سوکھے پیڑ ہیں ایسے ایک بوند کو ترسیں
ہم پر کوئی بوند پڑے گی کیسے
جیون بھر کی پیاس بجھے گی کیسے

ان گیتوں کے لفظیات میں ایک نوع کی سحر کاری ہے۔ مجبور و مجبور برہن کے گیت میں درد کا لاوا پلتا ہے اور ہم اس کی موسیقی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قیصر شمیم نے برسوں سے گیت لکھنا بند کر رکھا ہے۔ قاری کا ان سے

www.taemeernews.com

جائز سوال ہو سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس طرح نظموں میں اظہار بیاں صاف اور نمایاں ہے۔ موضوعات کی بوقلمونی اور بلندیٔ فکر کی امتیازی حیثیت کے طور پر یہ نظمیں ان کی سابقہ نظموں کی ہم پلہ بلکہ آگے کی چیزیں ہیں۔ ان نظموں کے حوالے سے بھی شاعر کی شخصیت کے مخفی گوشوں تک رسائی ممکن ہے۔ یہاں ایک نوع کا کلائمکس ہے اور غزلوں کے مقابلے میں ایک انچ کی بلند آہنگی بھی ہے۔

دونوں اپنے آپ سے پوچھیں
کیا دیکھا ہے؟
دونوں گونگے بن جائیں گے

اس ہاہو کے مقام پر
نئے حوصلوں کا ہے امتحاں
نئی منزلوں کے خواب ہیں
نئے کوہ قاف کی کھوج میں کہیں گم نہ ہوں، کبھی گم نہ ہوں
ابھی مرحلے کئی اور ہیں
ابھی مسئلے کئی اور ہیں

"ساعتوں کا سمندر" میں بھی نظموں کی ایک مخصوص فضا ہے، وہاں ذات کی تشخیص کا مسئلہ سنگین تھا۔ یہاں ذات کے علاوہ کائنات پر فکر کی جولانیاں نظر آتی ہیں۔ "تمہاری یاد آتی ہے"، "سب کو خوشی دے دے"، "یہ سرو شب ہے"، "سمندر بے کراں ہے"، "کلکتہ"، "سندیس"، "میرا ساتھ کہاں تک دو گے" وغیرہ نظمیں، مخصوص شاعرانہ فضا اور گہرے احساسات سے عبارت ہیں۔ مزید برآں یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے ان نظموں میں ایمائیت کے پہلو بہ پہلو اپنی آواز کی صداقت کو ذرا بلند آہنگ عطا کیا ہے۔ ان کا یہ لہجہ پُر تاثیر ہے کچھ رومانی اور تمثیلی نظمیں بھی مجموعہ میں شامل ہیں لیکن ترسیل وابلاغ میں یہاں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

ان کی کتاب کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قیصر شمیم اس خطے کے ایک قد آور شاعر ہیں۔ ان کی نئی چیزوں میں خوش گوار تبدیلیاں بھی نظر آئی ہیں۔ یہ بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کلی طور پر زندہ ہے۔ لیکن اپنے اس مذ کرہ شاعر کو ہندوستان کے دیگر برگزیدہ شاعروں اور ان کے فن کی باریکیوں سے موازنہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ روایت سے استفادہ ادب میں ایک ناگزیر قدر ہے لیکن انحراف کی لے کو سننا اور اسے لبیک کہنا

www.taemeernews.com

نیز زبان و بیان کو وسعت دینا بھی بڑے شاعروں کا وطیرہ رہا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ''ساعتوں کا سمندر'' کی اشاعت نے ایک تیکھا، نرالا، نئے رنگ و آہنگ کا ہم نوا، فکر کی دنیا میں اپنا منفرد نقش ابھارنے والے شاعر قیصر شمیم کی شاعری کو ہمارے معیار وا" ار پر کھرا اتارا"۔ وہ شاعر تو قیصر شمیم کی شخصیت میں اب بھی زندہ ہے مگر کم کم ____ ہاں ار" پذیر ضرور ہے۔

اپنے درد و غم اور اپنے تجربوں کے حوالے سے اپنی شناخت بنانے والے شاعر قیصر شمیم میں یہ امکان موجود ہے کہ وہ اپنے لفظوں کی تہہ میں راکھ اور دھوئیں کی بجائے اندر کی مقدس آگ کی شرکت سے ایک ایسی کائنات خلق کریں جو دنیا کی پرواہ بھی نہ کرے اور صاحب فہم و ذوق کو ایک بار پھر دیوانہ بنا دے۔

قیصر شمیم مغربی بنگال کے ایسے معروف شاعر ہیں' جن کی عمر کا ایک بڑا حصہ صنف شاعری کی ریاضت میں گزرا ہے۔ وہ اپنے مجموعۂ کلام'' سانس کی دھار'' میں کہتے ہیں کہ شاعری ان کی ذات سے کبھی جدا نہیں رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شاعری میں ذات کے علاوہ معاشرہ اور کائنات کے اسرار سے بھی رشتہ طے ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات کو' جو مسرت انگیز لہروں سے کم اور ایذا رساں تھپیڑوں سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں' نہایت سادگی' سلیقے اور ایک مخصوص صوتی آہنگ کے حوالے سے رقم کیا ہے۔ ان کے خیال میں شاعر کی شناخت اس کی منفرد آواز ہے جو بھیڑ میں بھی پہچانی جا سکتی ہے۔'' جواز'' کے تحت مختصر سے پیش لفظ میں شاعر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے' ان کی گونج قیصر شمیم کی شاعری میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

خاک ہو جانا' مگر دوشِ ہوا پر رہنا
فرض ہے دشت میں یہ بعد سفر مجھ پر

موسم تو بدلتے ہیں لیکن' کیا گرم ہوا' کیا سرد ہوا
اے دوست ہمارے آنگن میں رہتی ہے ہمیشہ زرد ہوا

ہے سمندر میں تو رکھ گہرائیوں کا وصف بھی
سر پھری موجوں کی صورت سطح کا ہلچل نہ بن

وہی ہے پیاس کا منظر' وہی لہو قیصر
ہنوز پھرتی ہے کوفے کی نہر آنکھوں میں

ان اشعار میں گہرائی بھی ہے' گیرائی بھی' یہ اپنے عصر کا حوالہ بھی ہیں' پیکر تراشی کا اعجاز بھی ہے اور شعریت بھی' لیکن اس مجموعۂ کلام میں جو لہجہ حاوی ہے' وہ نشاطیہ نہیں بلکہ نالہ و شیون یا غم و الم کا لہجہ ہے۔ زمانے کے سرد و گرم تھپیڑوں نے شاعر کو نرم گفتاری اور سادگی کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ یہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ غم و الم کی فضا صرف شاعر کی ذات پر ہی منتج نہیں ہوتی بلکہ اس کا سرا عام انسانی المیے اور عمومی سیاسی اور نفسیاتی کیفیات سے بھی جا ملا ہے۔ ایسے ترکیب مثلاً شاشتگی، ذوقِ الم، نشستِ غم و آلام، مملکتِ درد، الم دیدگان شہر، شب گزیدہ وغیرہ اس بات پر دال ہیں کہ اس فطری شاعر کو چشم ہی'' غسالہ'' ملی ہے اور اس حوالے سے شاعر نے جن

www.taemeernews.com

لفظوں کو تقریباً علامت کے طور پر استعمال کیا ہے' ان میں موسم زرد' سہما ہوا پرندہ' دست بریدہ' برف بریدہ طائر' ہجوم سنگ باراں' جنگل' سمندر یا پیہم سکوتِ لب نہ صرف رمزیہ کیفیات کے حامل ہیں بلکہ ایک مخصوص صوتی آہنگ سے بھی ہمیں دوچار کرتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کریں :

ایک رہ گزر شعلہ جوالہ ملی ہے — زیست ملی ہے مجھے قتالہ ملی ہے
تمہارے بس میں ہے' بڑھ کر تو چھین لو پہلے — اٹھے گا سر نہ کبھی' سر تو چھین لو پہلے
ہے آگ گھنے جنگل کی' مشکل ہی سے بجھ سکتی ہے — جو لوگ بجھانا چاہیں' لے لے کر سمندر جائیں
گھر گھر میں لوبان جلا کر' لوٹ گئے جو آئے تھے — زہر ہے اب ہر آنکھ میں دیکھو' کس کو خبر کل کیا ہو

شہر الم کی اس دستاویز میں نشاطیہ رنگ و آہنگ کم کم ہے' لیکن ''شہر طرب'' کی طرف مسلسل سفر کرنے کی جستجو موجود ہے۔ غمِ جاں سے غمِ حیات تک دھیمی لو کی رمزیاتی کیفیت سے معمور یہ شاعری قاری کو حیات اور کائنات کا شعور بھی عطا کرتی ہے۔ قیصر شمیم کی اس دھیمی آنچ اور طویل ریاضت کی پروردہ شاعری میں جذباتی سطحیت کی رنگ آمیزی نہیں ہے۔ شعر کی بلاغت، تغزل کا حسن اور ضبط و احتیاط کے معاملے میں قیصر شمیم نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام ''ساعتوں کا سمندر'' سے لے کر'' سانس کی دھار'' تک کامل ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے اشعار کی عمومی فضا اور موضوع کا برتاؤ، نرم صوتی آہنگ اور مخصوص طرز کا رچاؤ ثابت کرتے ہیں کہ کہنہ مشق شاعر نے ہمیشہ بلکہ عہد بہ عہد اپنی شاعری سے وفاداری نبھائی ہے' نیز اردو شاعری کی روایت سے سرفراز ہو کر غیر جانب داری کے ساتھ تجربے اور احساسات کا خوبصورت امتزاج قائم کیا ہے :

لہجہ ہے تقریر نئی ہے — پھر بھی تیری ہر بات میں تاثیر نئی ہے

قیصر شمیم کے دو اشعار

خوشی کے چہرے پہ کیا چھاپ ہے زمانے کی
کبھی قریب سے گزرے تو میں بھی پہچانوں

لگے نہ کچھ بھی تمنا کے ہاتھ' پھر بھی یہاں
یہ فرض کیوں ہے کہ گلیوں کی خاک ہی چھانوں

www.taemeernews.com

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

دہلی

سانس کی دھار : استفسار، استعجاب اور استقلال کی تثلیث

قبل اس کے کہ میں شعری مجموعہ "سانس کی دھار" پر اپنی گفتگو شروع کروں یا کوئی رائے پیش کروں۔ ضروری ہے کہ پہلے آپ کو قیصر شمیم کے شعری احساس اور ان کے مختلف کیفیات میں شریک کروں تاکہ کسی شعری عمل پر آپ بھی اپنے ردعمل کا اظہار کر سکیں۔ ان کا یہ شعر سنیے :

ایک میں تھا در پہ تیرے، اور تو کوئی نہ تھا
کون آتا منہ اندھیرے، اور تو کوئی نہ تھا

اب مختلف اشعار ملاحظہ کیجیے کہ یہاں شاعر نے حیات و کائنات کے حوالے سے کس انداز میں سوچا ہے :

ناپ رہا ہے کیوں تو اونچے عہدوں سے
میرا قد چھوٹا ہے بابا تیرا کیا

میں ہوں صحرا میں تو پھر باغ کی راحت کیسی
کیوں رہے سایہ فگن کوئی شجر مجھ پر بھی

نہ پوچھ مجھ سے حالِ دل کہ ان دنوں ہے زندگی
کسی عروج دیدہ کی شب زوال کی طرح

کیا بات ہوئی، کیوں شہر جلا، اب اس کے سوا کچھ یاد نہیں
اک فرد سراپا آگ ہوا، پل بھر میں ہوا، اک فرد ہوا

دھواں نہیں، نہ سہی، آگ تو نظر آئے
یوں چپکے چپکے سلگنے کا فائدہ کیا ہے

اب وہیں ڈوب کے ڈھونڈو مجھ کو
میں جہاں غرق ہوا ہوں

تم پرکھنا تو بتا بھی دینا
میں برا ہوں کہ بھلا ہوں بابا

ٹوٹتا جاتا ہوں میں تو رنج کیوں دنیا کو ہو
کوئی کعبہ میں نہیں، کوئی کلیسا میں نہیں

ختم ہوتا ہے کہاں مجھ پہ سرابوں کا عذاب
تیرے صحرا کے سرابوں میں تنہا میں نہیں

اور یہ شعر کس قدر بولتا ہوا ہے کہ :

ہے سمندر میں تو رکھ گہرائیوں کا وصف بھی
سرپھری موجوں کی صورت سطح کا ہلچل نہ بن

اتنے سارے اشعار کو ایک مختصر سی تحریر میں پیش کرتے ہوئے مجھے بھی کچھ بہت مناسب نہیں لگ رہا

www.taemeernews.com

ہے مگر میرا عقیدہ ہے کہ متن کو حاشیے میں ڈال کر کسی نتیجے پر پہنچنا کوئی تنقیدی رائے قائم کرنا بھی بہت مناسب بات نہیں ہو سکتی۔ اب جب آپ کے سامنے قیصر شمیم کے یہ اشعار ہیں تو آپ بھی اپنی رائے بنا سکتے ہیں۔

مجھ جیسے بے بضاعت شخص کے لیے "سانس کی دھار" کا مطالعہ اپنے ہم عصر سے بے تکلف شناسائی اور "فردیت" کو "اجتماعیت" سے روشناسی مزید قرب بخشتا ہے۔ قیصر شمیم ایک کہنہ مشق اور سلجھے ہوئے شاعر ہیں، مزاجاً میر سے نسبت ہے مگر فکری اعتبار سے جدید تر ہیں۔ چنانچہ میں ان کے اس شعر کے پہلے مصرعے سے خود کو بہت زیادہ متفق نہیں پاتا۔

پھر بھی تری ہر بات میں تاثیر نئی ہے — لہجہ ہے، نہ تقریر نئی ہے

حقیقت یہ ہے کہ "سانس کی دھار" کے شاعر کا شعری لہجہ بھی بدلا ہوا ہے اور تقریر کی لذت اتنی نئی ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ جو اس نے کہا، میں نے سمجھا یہ ہمارے دل میں ہے۔ نت نئی ترقیات اور انسانی دماغ کے نام پر ہم کیا کچھ کر رہے ہیں، لیکن سچائی یہ ہے کہ ہم سب قیصر شمیم کے ہم زباں یوں ہیں کہ :

آسماں کو چوم، لیکن آگ کا بادل نہ بن — لہلہانا چاہتی ہیں زندگی کی کھیتیاں

لیکن ساتھ ہی وہ یہ تاکید بھی کرتے ہیں کہ :

نرم رکھو گے طبیعت تو سزا پاؤ گے — دوب ہو جیسی بھی، پامال ہوا کرتی ہے

قیصر شمیم کے اشعار کو پڑھتے ہوئے مجھے ان کے یہاں تین اہم نکتے نظر آئے انھیں ہم تثلیث کا نام بھی دے سکتے ہیں اور یہ تثلیث تشکیل پاتی ہے استفسار، استعجاب اور استقلال سے......اور جب کہیں کہیں اس میں اضطراب کی کیفیت شامل ہوتی ہے تو وہ دورِ جدید کے میر تقی میر نظر آنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں :

وقت کو دیکھ، دل کے تیر نہ دیکھ — رات دن کلیاتِ میر نہ دیکھ

یا یہ شعر دیکھیے :

کبھی کبھی نظر آتے میر، میرے ساتھ — میں جانتا ہوں کہ ان کا مزاج کیا ہے مگر

دراصل قیصر شمیم نے جس قلندرانہ شان کے ساتھ اور خود دار انسان کے طور پر اپنی زندگی کے شب و روز گزارے ہیں......انسان اور سماج کے جسم پر ٹوٹتے ہوئے مظالم اور متواتر مظالم کو دیکھا اور حساس شاعر کی حیثیت سے محسوس بھی کیا ہے......اس پر بھی وہ اپنے آپ سے استفسار کرتے ہیں، کبھی سماجی نظام کے نام نہاد ٹھیکے داروں سے......اور پھر انھیں اس دنیا اور کائنات کے رواں دواں ہونے پر حیرت بھی ہوتی ہے کہ آخر اتنی گھٹن، اتنی اس اتنی ناانصافی کے باوجود ہم اسے بدلنے کی کوشش میں کامیاب کیوں نہیں ہوئے گویا زندگی ان کے نزدیک :

www.taemeernews.com

ایک مجبور کی پیشانی ہے　　　　اور خاکِ کفِ پا ہے اس کی

لیکن ان صعوبتوں کو بڑے استقلال سے جھیلنے پر آمادہ ہیں اس لیے کہ نظامِ حیات اور طرزِ حیات کچھ اس کی نوعیت کی ہے کہ ایک حساس انسان کے لیے محسوسات کے کچو کے کھانا ہی اس کا مقدر بن چکا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

ابھی تو کاٹ رہی ہے ہر ایک سانس کی دھار　　　　اجل جب آئے تو دیکھوں کہ انتہا کیا ہے

یہاں میرؔ کا یہ شعر جانے کیوں یاد آتا ہے:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں　　　　تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

دراصل قیصر شمیم کے تیرکے سے لہجے یا شعری مزاج کی تربیت یا انتخاب ان کے ارادے سے زیادہ ان کی طبیعت اور افتاد کو دخل ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں ہی ''جواز'' کے تحت ایک جگہ لکھا ہے :

''احباب ایک بھرپور مجموعے کی اشاعت پر اصرار کرنے لگے تھے،
لیکن کیا کرتا؟ گرہ میں مال تھا نہ مفلسی میں آٹا گیلا کرنے کا خیال! اس پر طبیعت
ایسی کہ کسی اکاڈمی یا کمیٹی سے روپے حاصل کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئی......
میرے دل نے مجھے ہمیشہ یہی مشورہ دیا کہ اللہ جب توفیق دے تو اپنی جیب سے
روپے لگا کر اپنا مجموعہ کلام شائع کرنا اور اگر جیتے جی اس کا موقع نہ ملے تو سینے پر پتھر
رکھ کر آنکھ بند کر لینا!

اللہ کا شکر کہ آنکھ بند کرنے سے پہلے ہی مجھے کسی ادارے کی مدد کے
بغیر ایک نیا شعری مجموعہ شائع کرنے کا موقع مل گیا......

اس عبارت سے ان کے مزاج کی قناعت پسندی، خود اعتمادی اور بھرپور استقلال کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ صوبائی اردو اکیڈمیوں سے مالی اعانت کا حصول کوئی بہت بری یا بات نہیں ہے۔ ایک شاعر کا یہ فیصلہ کہ مالی امداد کے بغیر کتاب شائع ہو، اپنے آپ میں شخصیت اور کردار کی عظمت کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ چنانچہ ان کی شخصیت کا یہ روشن پہلو ان کی پوری شاعری میں نظر آتا ہے۔

جیسا بھی ہے اس میں نقلی پن تو نہیں　　　　یہ میرا چہرا ہے بابا تیرا کیا

چلوں زمانے کے ہمراہ کس طرح قیصر　　　　ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ

حقیقت یہ ہے ''سانس کی دھار'' ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو قیصر شمیم کی شعر و ادب سے دلچسپی کی

www.taemeernews.com

نہ صرف دلیل ہے بلکہ یہ بھی ایمان لانا پڑتا ہے کہ انہیں شاعری کے تمام فن کا علم ہے، وہ لفظ کے استعمال پر اور استعارہ وعلامت کی اختراع پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں استادانہ رنگ صاف جھلکتا ہے۔ یقیناً ان کے یہاں ایک اہم اور بڑے شاعر کے تمام تر امکانات موجود ہیں۔ آغاز گفتگو کے اشعار بھی میری بات کو تقویت پہنچانے کے لیے کافی ہیں یہ شعر ملاحظہ ہو :

ریت پر نقشِ کفِ پا نہیں رہنے پاتے   اہلِ صحرا کو کوئی نشانی

مگر اہل ادب کو قیصر شمیم نے "سانس کی دھار" کی شکل میں جو نشانی دی ہے اس کا نقش تا دیر قائم رہے گا۔ خدا کرے ان کے احساس کی آگ روشن رہے تاکہ خود ان کے الفاظ میں تھوڑی سی تحریف کے ساتھ کر :

ترے سینے کو کچھ اور تیز دھارا دے

غــزل

قیصر شمیم

وقت بدلا ہے کہاں' وقت کے تیور ہیں وہی
درد میں ڈوبے ہوئے آج بھی منظر ہیں وہی

بھیس بدلے ہوئے کیا لوگ یہاں ملتے ہیں
دل جو رکھتے ہی نہیں' شہر میں دلبر ہیں وہی

ہم ہی ٹھہریں گے گنہگار کہ ہیں شکوہ بلب
باعثِ حشر ہیں جو' داورِ محشر ہیں وہی

ایسی مجلس میں کوئی بات نئی کیا ہوگی
سننے والے ہیں وہی' صاحبِ منبر ہیں وہی

پھونک کر محوِ تماشا ہیں وہ نیرو کی طرح
دل ہے بدبخت کہ اس روم کے قیصر ہیں وہی

www.taemeernews.com

علیم صبانویدی
چنئی

قیصر شمیم کی شعری اڑانیں

" سانس کی دھار" جناب قیصر شمیم کی تیسری شعری تصنیف ہے۔ اس سے پیشتر آپ " ساعتوں کا سمندر" اور " تری دھارا" دو شعری مجموعے اردو دنیا کے روبرو پیش کر چکے ہیں۔ " ساعتوں کا سمندر" بخط اردو اور دیوناگری تھا اور " تری دھارا" صرف بخط دیوناگری۔ یہ مجموعے ان کے ہزاروں قارئین کی نظروں سے گزر چکے ہیں۔ شاید " سانس کی دھار" صرف اردو رسم الخط میں چھپی ہے۔ اس مجموعہ میں شاعر موصوف نے " جواز" کے عنوان کے تحت اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ چند نجی باتیں بھی کہی ہیں۔ اپنی شاعری سے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہر شاعر کے حق میں بعینہ صادق آتا ہے۔ ہر شاعر اپنی زندگی میں مسرت انگیز لہریں بہت کم دیکھتا ہے اور ایذا رساں تھپیڑے ہی زیادہ کھاتا ہے۔ بہت کم خوش نصیب ہوں گے جو صرف مسرت انگیزی ہی میں اپنی زندگیاں گذارتے ہوں گے۔ ایسے خوش نصیب شعرا کی شاعری شاید بدنصیب ہے جو وہ کیفیت اپنے اندر پیدا نہیں کر سکی جو کیفیت قیصر شمیم صاحب کے قبیل کے شعرا کی شاعری پیدا کرتی ہے۔ بہر حال قیصر شمیم صاحب کی شاعری کے مطالعہ کے بعد اتنا احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی بسر کرنے کے فن سے شاعری کے فن کی آبیاری کر پائے ہیں۔ چالیس پینتالیس سال کی مشق و مزاولت کے عوض آپ نے نہ صرف اپنے اظہار کی زبان کو گہرائی و گیرائی عطا کی ہے بلکہ تجربات کی کہنگی سے بھی ان کے اندر اشتعال کے عوض احتمال کی خصوصیت پیدا ہوئی ہے۔ یہ ضبط و تحمل بیرونی طور پر سکوت و سکون کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب سہی مگر اندرونی طور پر جو بے چینی و اضطراب ہے، اس کو بھی بخوبی اجاگر کر کے شاعر مزید داد دلواتے ہیں۔ سنگِ مرمر کی درونی تہوں میں بھی سحر ہی ہوتی ہے تیرگی نہیں ہوتی۔ اس ایقان کو جگانے میں قیصر شمیم صاحب کی غزلیں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ شعر کے بطن میں جو بات ہے وہ شاعر کی زندگی کے بطن سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ بعض غزلوں میں ان کی ذات سے پرے کئی اذوات کی شرح و تفسیر ملتی ہے اور یہ شرح و تفسیر تمام شاعرانہ خوبیوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان اذوات کو کہیں آپ نے بغیر نشان دہی کے متعارف کیا ہے تو کہیں واضح نشان دہی کے ساتھ۔ بغیر نشان دہی کے جہاں اشارات ہوئے ہیں

www.taemeernews.com

وہاں پورا سماج ہے یا سماج کے مخصوص افراد اور جہاں واضح بات ہوئی ہے وہاں خود کی ذات ہے یا پھر ان کے متعلقین، دوست، احباب، مخصوص امیر و رئیس یا درویش، فقیر، حاسد و دشمن وغیرہ وغیرہ۔ ہر شاعر کے ماحول میں یہی تمام لوگ ہوتے ہیں مگر قیصر شمیم صاحب کے ہاں ان کی تصویریں بہت صاف اور واضح ہیں۔ عمومیت میں وہ ان تمام کو علامت ''شہر'' میں کھپا لیتے ہیں اور اس علامت کو شاعر موصوف نے بار ہا کئی ڈھنگ سے برتا ہے اور ہر جگہ ان کا مضمون نئی تشبیہات کو ہی سموئے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ آپ کے اظہار کی صفائی اور جمالیت کا اندازہ ان کے ہر قاری کو ہے اور اس کے لیے انھیں بنگال ہی کا نہیں بلکہ ہندوپاک کے بزرگ ترین شاعروں اور اساتذہ میں شمار کرتے ہیں جن کے مداح اور سینکڑوں شاگرد آج بھی آپ کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ علامت ''شہر'' کے تعلق سے آپ کے چند شعر آپ بھی ملاحظہ کریں :

تو مرے شہر کا حاتم ہے تو پھر بات ہے کیا
کیوں لٹاتا نہیں کچھ لعل و گہر مجھ پر بھی

سلگ رہی ہے زمیں یا سپہر آنکھوں میں
دھواں دھواں سا ہے کیوں تیرا شہر آنکھوں میں

وہ جو اک شہر تھا دلداروں کا
کتنی بے درد فضا ہے اس کی

ہمارے شہر کا مشکل کشا تھا وہ لیکن
بلا سمجھ کے ہمیں سر سے ٹالتا ہی رہا

پتھر کے بت نہیں ہیں اہل دیدگانِ شہر
بیم سکوتِ لب سے یہاں کام کون لے

شہر کی بھیڑ میں قیصر ہم نے
ایک اک شخص کو تنہا دیکھا

شہر کی ریت نہ سمجھو گے تو پچھتاؤ گے
اپنے خوابوں کی طرح ٹوٹ کے رہ جاؤ گے

اور کیا ہوگا طوافوں سے بھرے شہر کے بیچ
پھر کوئی تازہ بلا سر پہ اٹھا لاؤ گے

ہر قطرے کو یہ ڈر ہے، اڑ جائے نہ دم بھر میں
کیا دھوپ ہے شہر، اس میں فوارے لرزتے ہیں

معتبر شہر شہر میں قیصر
بیچ، خریدے ہوئے گواہوں کا

شہر کا شہر ہے دشمن مرا
پاؤں کیا مجھ کو جمانے دے گا

غرض اس علامت شہر سے تعلق رکھنے والے اتنے اشعار ہیں کہ یہاں ان سب کا نقل کرنا دشوار ہے۔

اکثر شعراء حقیقی دنیا سے اوب کر ایک حسین قیاسی دنیا کا سہارا لیتے ہیں۔ مگر قیصر شمیم صاحب نے خود کہا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں مسرت انگیز لہریں بہت کم دیکھی ہیں اس لیے قیاسی دنیا میں بھی انھیں اس طرح کی مسرت کے تصور میں دشواری ہی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے خیال میں ہر شخص اپنے اندر کی دنیا ہی میں الجھا ہوا ہے۔ صبح جب گھر سے آدمی نکلتا ہے تو پریشانیاں ہی لے کر گھر لوٹتا ہے اس امید پر کہ گھر پہنچ کر سکون حاصل کرلے۔ قیصر شمیم اس

www.taemeernews.com

طرح کے سکون کے متلاشی کو گھر پہنچ کر مزید گھبراہٹ کا شکار پاتے ہیں۔ شاید ان کی زندگی میں یہ ان کا تجربہ ہو کہ عام انسان کی اذیت کا مشاہدہ یا اس کی اداس دنیا کا مشاہدہ :

یہاں تو قوس قزح بھی ہے آنسوؤں کی قطار ‏ ‏ مرے خیال کی دنیا اداس دنیا ہے

اپنے آپ میں الجھی ہوئی اک دنیا ہے ہر شخص یہاں ‏ ‏ سلجھے ہوئے ذہنوں میں بھی ہیں چھپے ہوئے الجھاؤ بہت

صبح کو گھر سے تو نکلے ہو مگر شام کے بعد ‏ ‏ اپنے دروازے پہ پہنچو گے تو گھبراؤ گے

قیصر شمیم صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہر انسان کا المیہ اپنی جگہ بہت بڑا ہے اور جو اس سے گزرتا ہے وہی اس کے کرب اور اذیت کو محسوس کر سکتا ہے مگر ہر کرب والم سے گزرنا ہی عام بات ہے مگر قیصر شمیم صاحب کو عامیوں سے ممتاز کرتی ہے۔

ممکن ہے کہ ہو درد جگر عام ولیکن ‏ ‏ شائستگیِ ذوقِ الم عام نہیں ہے

اس امتیاز کے باعث شاعر میں ایک طرح کی انا ضرور پیدا ہوتی ہے۔ اگر انا نہیں تو کم از کم بالا ذہنی ہی پیدا ہو جاتی ہے مگر اس کا اظہار بھی وقار ہی سے ہوا ہے :

چلوں زمانے کے ہمراہ کس طرح قیصر ‏ ‏ ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ

قیصر صاحب کے لیے بھی عامیوں ہی کی راہ بھلی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے شاید خواص میں بعض خاص نقائص ہی دیکھے ہیں۔ عوام بہت سادہ مزاج رکھتے ہیں جن میں مفاد پرستی کا عنصر نہیں ہوتا بلکہ بے غرضی اور خلوص ہی زیادہ ہوتا ہے۔ شاید یہی تجربہ نے آپ سے ایسے اشعار کہلوائے ہیں

کوئی ہم خیال قیصر ہو مری طرح تو سیکھے ‏ ‏ رہ خاص بھول جانا ، رہ عام یاد رکھنا

"شہر" کے تعلق سے جو بات کی تھی تو وہاں خواص کا احساس تھا اور گاؤں کی چوپال میں آپ کو سیدھے سادے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔

شہر میں پایا گیا یخ بستہ ہاتھوں کا تپاک ‏ ‏ گرم جوشی گاؤں کی چوپال میں پائی گئی

غرض قیصر شمیم کی شاعری میں ہمارے آگے ہمیشہ دو طرح کی سماجی زندگیوں کا ٹکراؤ دکھائی دیتا ہے۔ ایک بہت ہی ہوشیار، خودغرض، سفاک، دل زاروں سے بھرپور شہریوں کا سماج اور دوسرا بہت ہی بھولے، بے غرض، رحم دل، دلداروں سے بھرا ہوا دیہی سماج اور قیصر شمیم کی پرورش و پرداخت پہلے والے سماج میں ہوئی ہے مگر وہ حیرت انگیز طور پر اس سے زندگی بھر دامن بچانے میں لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور دوسرے سماج کے دلدادہ ہوئے ہیں۔ اس ایک احساس سے آپ کی تمام غزلیں بڑی پرکیف فضا پیدا کرتی ہیں اور ایک طرح سے یہ قارئین

www.taemeernews.com

کے لیے آپ کے ایک خاص پیغام کا کام بھی سرانجام دیتی ہیں۔ وہ پیغام ہے بطور انسان احتیاط، بہتر زندگی کے لوازمات کی پہچان اور حقیقت کے آئینے میں صحیح خدوخال کے تناظر کی سکت اور قابلیت پیدا کرنا۔ جہاں وہ کسی طرح کا کوئی امیج پیدا کرنا نہیں چاہتے وہاں آپ کی شاعرانہ جمالیاتی حس کا جادو چلتا ہے اور اس حیثیت سے آپ کے ہاں ''غزل'' کی تمام روایتی جھلکیاں اجاگر ہو جاتی ہیں جو اس نازک ترین صنف کی جانی پہچانی ادا ہے۔ آپ کے اس طرز کے اشعار بڑے شفاف اور شستہ ہیں جو سماعت سے گزر کر دل و دماغ میں ایک گداز پیدا کرتے ہیں۔

جس کو ملتی نہ تھی فرصت کبھی آئینے سے
وہ نظر رہتی ہے اب شام و سحر مجھ پر بھی

صبح سے تا شام ہم بجتے رہے ہیں
تم نے دی ہے کیا سزا منظر بہ منظر

دیکھیے کس کے بدن پر برسے
بھیگی بھیگی سی گھٹا ہے اس کی

ایک نشہ ہوس کی آنکھوں میں
اک تماشہ برہنہ بانہوں کا

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قیصر شمیم صاحب اپنے دور سے بالکل مطمئن نہیں ہیں۔ وہ ایک اُ۔ دور چاہتے ہیں جو ہمارے صالح اسلاف کا رہا ہے۔ وہ اپنی اس دنیا کو ایک اور غسل دے کر پاک کرنا چاہتے ہیں اور اپنی سانس کی دھار میں ٹھہراؤ اور سکون جیسے غیر آلودہ عناصر شامل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ استدعا کرتے ہیں

غسل دے پھر ہماری دنیا کو
نوح کے عہد کا سمندر لا

قیصر شمیم کی ایک غزل

لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو سنبھالو لوگو
ڈس گیا سانپ کوئی زہر نکالو لوگو

زندگی نام ہے اس کا' یہ گراں بار سہی
بوجھ کہہ کر تو اسے سر سے نہ ٹالو لوگو

کون کہتا ہے' نہیں زیست میں کچھ غم کے سوا
حوصلے کی بھی کوئی بات نکالو لوگو

عین ممکن ہے چلیں ساتھ تو منزل مل جائے
بھولے بھٹکوں کو ذرا ساتھ لگالو لوگو

ہم مسافر ہیں' مسافر ہیں سبھی دنیا میں
راہ میں اپنے پرائے نہ نکالو لوگو

اور کچھ تیز چلو منزلِ جاناں کی طرف
اپنی رو میں غمِ دوراں کو بہالو لوگو

ایک قیصر ہی تو ہے سارے جہاں میں سرکش
اپنے قدموں پہ اسے اور جھکالو لوگو

www.taemeernews.com

ف.س. اعجاز
کلکتہ

قیصر شمیم کا لہجہ اور شعری رویے

"سانس کی دھار" قیصر شمیم کا ایک سو غزلوں پر مشتمل مجموعہ کلام ہے۔ یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جس میں بقول ان کے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۹۶ء تک کا منتخب کلام اس مقصد کے تحت پیش کیا گیا ہے کہ ان کی غزل گوئی کے مختلف مراحل کا ایک مجموعی تصور ابھر سکے۔ اپنا اولین مجموعہ کلام قیصر شمیم نے ۱۹۷۱ء میں "ساعتوں کا سمندر" کے عنوان سے شائع کیا۔ اگر یہ سو غزلیں ۱۹۵۱ء تا ۱۹۹۶ء کے درمیان کہی گئی غزلوں کا انتخاب ہیں تو غزل گوئی میں قیصر شمیم کا سالانہ تخلیقی اوسط تقریباً دو عدد ٹھہرتا ہے۔ میں اس کشمکش میں ہوں کہ قیصر شمیم صاحب کی شانِ نزول کی داد دوں یا ان کی ضبطِ نزول کا قصیدہ پڑھوں جب کہ ان کے کئی چیلے بسیار گوئی میں نام کما رہے ہیں۔ استاد کم کہتے ہیں اور خس و خاشاک سے بچ جاتے ہیں!

قیصر شمیم کے ۴۵ برس کے ہندسے سے تقسیم ہونے والی ان سو غزلوں پر جو شعری زاویے قائم ہوئے ہیں ان میں سیاسی زاویہ کم سے کم ڈگری کا ہے۔ مغربی بنگال کی نمائندہ غزلیہ شاعری اچھے خاصے سیاسی تیور بھی رکھتی ہے جس سے یہاں کے غزل گویوں کی سیاسی صورتِ حال سے متاثر ہونے کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ بیرونِ بنگال غزل کا یہ سیاسی عنصر کتنی داد پاتا ہے اس کا انحصار وہاں کے سامعین کے ذوقِ سیاست پر ہے۔ البتہ قیصر شمیم کی غزلیں مزاجاً مختلف ہیں۔ انھوں نے خود کو سیاسی اثرات سے بچائے رکھ کر اپنی شاعری کو بھی سیاسی علائم کی آلودگی سے محفوظ کر لیا ہے۔ ان کی غزلیں سیاست کا ردِ عمل نہیں ہیں۔ ان کے محسوس کن شعری رویے انسانی ہیں۔ احتجاج کا لہجہ ان کی آوازوں میں شامل نہیں ہو سکا۔ ان کا لہجہ بیشتر مدھم اور کہیں کہیں نرم سا ہے۔ ایسا لہجہ باطنی محسوسات اور ان شخصی تجربات کی ادائیگی کے لیے موزوں سمجھا جاتا ہے جن کے محرکات شاعر کے دل میں طوفان کی طرح اچانک سر نہیں اٹھاتے۔ ایک خیال سر اٹھاتا ہے جس کا بیان کرنا، نہ کرنا شاعر کے اپنے ارادے اور بس کی بات ہوتی ہے۔ جب محرک پر قابو ہو تو شاعر اپنے حالات اور اطراف و اکناف کے دائمی اثرات قبول کرنے اور عارضی تحریکات رد کرنے میں ایک آزاد اور خود بین تخلیق کار کا رویہ اپنا سکتا ہے۔ وہ اپنے جذبے اور فکر کو دھیمی آنچ پر

www.taemeernews.com

سلگنے دیتا ہے تا کہ وہ اس کے پسندیدہ سانچوں میں ڈھلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ چند اشعار قیصر شمیم کے اس رویے کو ظاہر کرتے ہیں :

دل کے اندر جو کچھ بھی ہے لفظوں میں کب ڈھلتا ہے
درد لبوں تک آتے آتے اپنی شکل بدلتا ہے

میری عمرِ رواں کا حاصل آگ ہے میرے سینے کی
دیکھ! مرے احساس کا دامن ساعت ساعت جلتا ہے

جلتے ہوئے دل کی آہیں بھی ٹکرا کے رہ جاتی ہے
پتھر تو پتھر ہے آخر، جلتا ہے نہ پگھلتا ہے

دم سادھے سب کچھ سہہ لینا سب کے بس کی بات نہیں
شام و سحر جب جبر ہو دل پر، ایسا جبر سہے گا کون

کیا کوئی موج ایسی نہیں ہے جو مجھے توڑ کر جذب کر لے
برف کی سل کے مانند کب تک میں سمندر میں بہتا رہوں گا

اِدوں کی میراث ایک غم، میرے دل کے لیے زندگی ہے
کوئی موسم موافق ملے تو پھر نئے خواب قیصر بنوں گا

یہ اشعار قیصر شمیم کی فکر اور لہجے کی تعبیر کے حوالے سے نقل کیے گئے ہیں۔ ہر شاعری کی اساس الگ ہوتی ہے اور یوں نہ ہو تو کوئی شاعر اپنی پہچان الگ قائم نہیں کر سکتا۔ شاعر کس کیفیت سے گزر کر کچھ کہتا ہے۔ یہ مشاہدہ بجائے خود کافی دلچسپ ہوتا ہے۔ اس کے کلام سے اس کی قدرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے فکر اور جذبے کے تحلیل ہونے کی صلاحیت اور اس کے نزدیک چیزوں کی جو ماہیت ہوتی ہے اس کی دریافت سخن فہموں کے ادراک میں اضافے کا موجب ہوتی ہے۔ اس طرح کسی حد تک شاعر کے پیغام کی ترسیل خود سامعین کے ذوق اور فہم رسا کی مرہون منت ہوتی ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ جو اشعار میں نے اوپر نقل کیے ان ہی میں سے کچھ ٹکڑے پھر دہراؤں گا تا کہ اختصار کارآمد بن جائے۔

(۱) درد لبوں تک آتے آتے اپنی شکل بدل لیتا ہے
(۲) میری عمرِ رواں کا حاصل آگ ہے میرے سینے کی
(۳) دیکھ! مرے احساس کا دامن ساعت ساعت جلتا ہے
(۴) پتھر تو پتھر ہے آخر جلتا ہے نہ پگھلتا ہے
(۵) برف کی سل کے مانند کب تک میں سمندر میں بہتا ہوں گا

ان پانچ مصرعوں پر آپ ٹھہر ٹھہر کر غور فرمائیں۔ الفاظ ایک کیمیاوی یا طبیعی جانچ سے گزرتے ہوئے ملیں گے۔ درد کا لبوں تک پہنچتے پہنچتے تبدیل ہو جانا، عمر رواں کا سینے کے اندر آگ بن جانا، پل پل میں احساس کا جل اٹھنا، پتھر کا جلنے اور پگھلنے کے عمل سے متاثر نہ ہونا، برف کی سل کا سمندر کے پانی میں تحلیل ہونے کا وقفہ۔ دیکھیے کن تجربوں سے شاعر گزر گیا اور ہماری آنکھوں کے سامنے لفظی کیمسٹری کا کیسا سائنسی عمل کا وقوع پذیر ہو گیا۔

www.taemeernews.com

مزید شاعر کا یہ کہنا کہ " کوئی موسم موافق ملے تو پھر نئے خواب قیصر بنوں گا" اس پر دال ہے کہ وہ ابھی آپ کو مزید تجربات کا عینی شاہد بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جی چاہتا ہے غالب کا ایک شعر یہاں دہرا کر اس دلیل کو اثبات کا رنگ اور غالب کا محاورہ عطا کر دیا جائے :

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا　　باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

شاعر نے " سانس کی دھار" سے جو کام لیا ہے وہ صرف وہ نہیں ہے جو فطرت کسی ذی نفس سے لینا چاہتی ہے۔ یعنی ناک سے سانس لینا اور منہ سے خارج کر دینا۔ طبعی حیات کا ثبوت دینے کے لیے ایک جاندار کے لیے اتنا عمل کافی ہے۔ سانس کو تلوار مان کر اس کو سان چڑھانا وہ فکری عمل ہے جس کا پابند ایک حساس فنکار اپنے آپ کو کر لیتا ہے۔ اس میں اچھے اچھوں کی سان اتر جاتی ہے، اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ جن کے اوسان خطا نہ ہوں ان کی " تسکینِ اضطراب" بھی دیکھنے کی چیز ہوگی۔ قیصر شمیم نے اپنی تیغ نگہ کو اچھی خاصی آب دی ہوگی تب کہا ہوگا۔

ابھی تو کاٹ رہی ہے ہر ایک سانس کی دھار　　اجل جب آئے تو دیکھوں کہ انتہا کیا ہے

فانی بدایونی کی طرح خود کو انھوں نے بے گور و کفن میت بننے نہیں دیا۔ وہ ایک حس کی چادر میں لپٹے ہوئے سرد گرم کے ردعمل کے لیے پوری توانائی کے ساتھ اپنے مجموعہ غزلیات میں موجود پائے جاتے ہیں۔ زندگی سے خوف یا مخالفت کے فوبیا میں مبتلا نظر نہیں آتے۔ اس لیے انھوں نے الم کو شدت کی راہ نہیں دکھائی بس ایک متعدل اداسی نے انھیں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ جس کے سبب ان کا لہجہ گاہے بگاہے حزنیہ ہو گیا ہے۔ یہ دو اشعار دیکھیں :

گلگونہ عارض کا ترے عکس ہے دل پر　　یا سرخی داغِ جگر لالہ ملی ہے
میں نغمہ گرِ غم ہوں ، مرے سازِ الم کو　　تاثیرِ نوائے دلِ بنگالہ ملی ہے

قیصر شمیم کے لہجے کی زود فہمی ہے۔ دائروی گونجیں ان کے مجموعہ کلام سے نہیں ابھرتیں کیوں کہ اداس لہجہ اپنے مخصوص انداز اور رفتار سے چلتے ہیں اور اندر اندر طبیعتوں پر اثر کرتے چلے جاتے ہیں۔ شاعر نے اپنے ایک شعر اور ایک مقطع میں اپنی آواز کو " گلوگیر" آواز کہا ہے۔ اس کی نمیدہ آواز کی گلوگیر پرچھائیاں مندرجہ ذیل اشعار میں زیادہ نمایاں ہیں :

میری اپنی کتھا ہے بابا تیرا کیا　　میرا دکھ میرا ہے بابا تیرا کیا
چھوٹا سا گھر اور بڑی سی تنہائی　　یہ میری دنیا ہے بابا تیرا کیا
جیسا بھی ہے اس میں نقلی پن تو نہیں　　یہ میرا چہرا ہے بابا تیرا کیا
یہاں تو قوسِ قزح بھی ہے آنسوؤں کی قطار　　مرے خیال کی دنیا اداس دنیا ہے

www.taemeernews.com

ابلتے پانیوں میں ہوں کہاں ابال کی طرح — میں آج بھی ہوں تہہ نشیں گزشتہ سال کی طرح
جو منظر بھی دل کو لبھائے بھر لو اس کو آنکھوں میں — کیا جانے کل کی بارش تک اڑ جائے کس کس کا رنگ
ایک سماں ہے دل کے اندر جیٹھ کے جلتے جنگل کا — آنکھیں بند کیے میں دیکھوں کب تک اپنے گھر کا رنگ
سب کے سب چپ ہیں صدا ہے اسکی — کتنی آسودہ انا ہے اس کی
ہوں اپنی قبر میں یا اپنے گھر میں — کوئی آواز پا ابھرے تو دیکھوں
ابھی ہر شخص لگتا ہے ادھورا — کوئی پورا بشر نکلے تو دیکھوں
سرِ راہ ہے کسی کو دیکھنا کیا — کبھی وہ میرے گھر ٹھہرے تو دیکھوں
نہ لہروں سے نہ بے لہری سے بچنا — سمندر کی بڑی مچھلی سے بچنا
اترنا ناؤ سے اپنی سنبھل کر — کنارے کی ہر اک جھاڑی سے بچنا
دکھ میں آخر یہ کھل گیا قیصر — نام ایک مصلحت کا رشتہ تھا
وقت نے اک روشنی کی چاہ میں — کتنے پردوں سے نکالا ہے مجھے
پ ڈس بادل کی سدا کیا ہوگی — وہ گھڑی کا کوئی سایا ہوگا
میرے اشکوں کی خبر ہے اس کو — وہ بھی چھپ کر کہیں روتا ہوگا
کالے تختوں پہ سر پٹکتا دن — ایک معمول درس گاہوں کا
نرم نرم انگلیاں ہواؤں کی — کھردرا جسم شاہراہوں کا
غسل دے پھر ہماری دنیا کو — نوح کے عہد کا سمندر
دکانِ شیشہ گری میں سجا ہوا ہوں میں — مگر یہ کیا کہ ہوا سے چیخ رہا ہوں میں
تجھ سے ملنا ہے روشنی کی طرح — جسم اپنا جلا کے آؤں میں

قیصر شمیم کی غزلیہ شاعری ناصر کاظمی کی طرح ایک رومانی اداسی کے اثر میں ہے۔ جو سایۂ گل میں اپنے محبوب کو یاد کر کے سے روتا ہے۔ قیصر شمیم نے آہ کو لے بنایا ہے اور زندگی کے ساز پر غزلیں کہی ہیں۔ اگرچہ ان کی عشقیہ شاعری تخیلی زیادہ ہے پھر بھی انھوں نے حسی پیکر تراشے ہیں اور اپنی افسردگی کو پرکشش بنا ڈالا ہے۔ ان کی ایک غزل "رنگ بھرنے کو ملے تھے ہمیں خاکے کیا کیا" سی ایم او ہائی اسکول سے منسوب ہے جہاں سے وہ مدرس کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت انھوں نے یہ غزل کہی۔ Super annuation کے ادب میں یہ غزل ایک اچھا اضافہ ہے۔ سانس کی آمد وشد سے یوں فائدہ اٹھانا تخلیقی عمل ارتفاع کی دین ہے۔

www.taemeernews.com

رؤف خیر

حیدرآباد

قیصرِ قصرِ ادب

کلکتے کے ذکر کے ساتھ ہی غالبؔ کے سینے میں تیر سا تر از و ہو جاتا تھا مگر ہمارے لیے کلکتہ کا مطلب ہے نظم و نثر کے الف دوڑتے اشہب و ابلق پر برابر کی سواری کرنے والے منور رانا، ادب کے طفلانِ مکتب کے مدرس اور دیارِ حرم کے مسافروں کے معلم علقمہ شبلی، چھمیاں چھمیاں کی تال پر ماہیے کی درۂ خیبر پر متعین تیر و ترکش سے لیس فراغ روہوی۔ فراغ روہوی کی توسط سے جناب قیصر شمیم جیسی باغ و بہار شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ پچھلے دنوں ٹیپو سلطان صدی تقاریب حیدرآباد کے سلسلے میں حکومتِ مغربی بنگال نے یار وفادار سلطنتِ برطانیہ کے حیدرآباد سے مجھے بطورِ مہمانِ خصوصی مدعو کیا تھا۔ تقاریب کے اختتام کے بعد مجھے الوداع کہنے سے پہلے مصطفےٰ اکبر نے وکٹوریہ میموریل دکھا کر اس سفر کو یادگار بنا دیا تھا لیکن اس کے بعد فراغ روہوی نے قیصرِ قصرِ ادب جناب قیصر شمیم سے ملوایا اس طرح میرا اسفر ادھورا رہ جانے سے بچ گیا:

نام سے اپنے شہنشاہ تھا قیصر لیکن　　ہم نے جب دیکھا تو وہ شخص قلندر ہی لگا

قیصر شمیم صاحب کے عالمانہ تبصرے، فاضلانہ مضامین اور دل لبھانے والے نظمیں، غزلیں اکثر عنبر شمیم کی ''دستک'' کلیم حاذق کے ''انکشاف'' اور عاصم شہنواز شبلی کے ''اثبات و نفی'' میں پڑھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ انھوں نے کسی صنفِ سخن کو مایوس نہیں ہونے دیا۔ ہر صنفِ سخن کی خود پذیرائی کی اور نئی اصنافِ سخن کے متوالوں کی حوصلہ افزائی بھی کی یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ان کے بیشتر شاگردوں نے نووارد صنفِ سخن ''ماہیے'' کو گلے لگا لیا بلکہ خود قیصر شمیم صاحب نے بھی اس صنفِ نازک کو اپنے حرم میں جگہ دی۔ اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تو مناظر عاشق ہرگانوی بھی اتنے ہی ہیں جتنے حیدر قریشی:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے　　سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

وحشتؔ کلکتوی کے بارے میں مشہور ہے کہ جب کسی کو اپنے شاگردی میں انھیں قبول کرنا ہوتا تو اسے اپنے منہ میں چبائے ہوئے پان کی چھالیے چبانے کے لیے دیتے۔ اگر بلا تکلف وہ شاعران کی بخشی ہوئی

www.taemeernews.com

لیے چاہ لیتا تو وحشت اسے اپنی شاگردی میں قبول کر کے اس کی شعری صلاحیتوں کو نکھارتے ورنہ انکار کر دیتے۔ ان دنوں کلکتے کے بیشتر نو جوان شعراء جناب قیصر شمیم کے دامن سے وابستہ ہیں۔ خدا جانے اس وابستگی کی شرط کیا ہے۔ اُدھر ترقی پسند تحریک جوان ہوئی اِدھر دو اپریل ۱۹۳۶ء کو پیدا ہونے والے عبدالقیوم خان صاحب پتہ نہیں کس ساعت نیک کو قیصر شمیم ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ عمید تخلص کرتے تھے۔ "سانس کی دھار" (سن اشاعت ۱۹۹۱ء) میں شامل آخر آخر کی غزلوں کے مقطعوں میں عمید تخلص استعمال ہوا ہے

رک گئی شاعری کی مشق عمیدؔ　　ہائے کم بخت امتحاں رکا

تم ہی بے خانماں نہیں ہو عمیدؔ　　بھی ہیں جہاں میں خانہ خراب

قیصر شمیم کو زبان و بیان پر جو دسترس حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی ان کے شاگردوں کو مل جائے تو وہ خود استاد ہو جائیں۔

جناب قیصر شمیم جیسے قد آور شاعر کے لہجے کا انکسار ان سے ملتے رہنے پر اکساتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں یہی انکسار ان کی مقبولیت میں اضافے کا سبب بھی بنتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے :

میں ہوں ناچیز مگر ایک نظر مجھ پر بھی　　تو ہے اکسیر تو کچھ ڈال اثر مجھ پر بھی

تو مرے شہر کا حاتم ہے تو پھر بات ہے کیا　　کیوں لٹاتا نہیں کچھ لعل و گہر مجھ پر بھی

جس کو ملتی نہ تھی فرصت کبھی آئینے سے　　وہ نظر رہتی ہے اب شام و سحر مجھ پر بھی

تیر لفظوں کے چلاتا ہے وہ غیروں پہ مگر　　وار کرتا ہے بہ انداز دگر مجھ پر بھی

میں بھی دیکھوں کہ کمالات ہیں کیا کیا قیصرؔ　　آزمائے وہ ذرا اپنا ہنر مجھ پر بھی

ان کی شعری تخلیقات اردو کے ساتھ ساتھ ہندی ادب کے خوش ذوقوں کی تسکین کے سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔ قیصر شمیم صاحب کی زبان نہایت سلیس ہے بلکہ بڑی حد تک ہندی ہی ہے۔ خاص طور پر ان کی نظموں پر ہندی اثرات بہت زیادہ ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کی بعض کتابیں ہندی میں بھی شائع ہوئی ہیں، جیسے "ساحتوں کا سمندر" (۱۹۷۱ء) اور "تری دھارا" (۱۹۹۶ء)۔

قیصر صاحب پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں اور بے شمار درسی کتابوں کی تدوین و ترتیب میں حصہ لے چکے ہیں اس لیے وہ نہ صرف زبان کے مزاج داں ہیں بلکہ زبان جاننے والوں کو نفسیات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے رسیا ان کی غزلوں کے بعض اشعار پر سر دھنتے ہیں تو ہندی والے انھیں اپنا ہی آدمی سمجھتے ہیں۔ منشی پریم چند اور کرشن چندر والا فارمولا جن شاعروں اور ادیبوں نے اپنایا ہے، کبھی نقصان میں نہیں رہے۔

www.taemeernews.com

دراصل قیصر شمیم ترقی پسند ادب کے پالنے میں پلے اور ترقی پسندوں کی انگلی پکڑ کر چلنا شروع کیا اور ترقی پسند ہمیشہ غیر متعصب اور قومی یکجہتی کے بے باک ترجمان رہے ہیں۔ ان کی انسان دوستی۔'' کسان دوستی'' تک محدود نہیں، قیصر شمیم کی سادگی ہیر پھیر سے کوسوں دور ہے۔ وہ ادب میں بھی علامتوں کا گورکھ دھندہ نہیں پالتے۔ ان کی بات سمجھنے کے لیے آدمی کا بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں بس ایک دل دردمند رکھنا ضروری ہے۔ وہ اپنے ماضی کے بارے میں لکھتے ہیں :

'' مجھے یاد ہے کہ جب جب فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں، پڑوسیوں کے شیو منگل چاچا، گورکی چاچی، رام لکھن بھیا، اڑیسہ کے شنکر کا کا، پھوپھی جان کی سہیلی سونیا پھوپوا ور رادھا دیدی کے چہرے آنکھوں میں پھر گئے کیوں کہ انھی لوگوں کے سائے میں پل کر میں جوان ہوا تھا۔'' ('' پہاڑ کاٹتے ہوئے'' کا پیش لفظ)

قیصر شمیم کے لیے گاندھی جی کا قتل ہو کہ لیبیا پر امریکی حملے کے نتیجے میں کرنل قذافی کی گود لی ہوئی بچی کی ہلاکت، دونوں برابر ہے۔ نظم '' سوال'' کے مصرعے دیکھیے :

ابھی تو تیرے قدموں کو کھلونوں کی دکانوں تک سفر کرنا ہی باقی تھا...
......خدا نے کیا اسی دن کے لیے بھیجا تھا دنیا میں
کہ دنیا دیکھنے سے قبل ہی دنیا سے اٹھ جائے؟
خطا کچھ بھی نہ ہو لیکن درندوں سے سزا پائے؟

(نظم : سوال / ص : ۳۸)

جناب قیصر شمیم یاروں کے یار ہیں۔ ان کی تخلیقات سے مترشح ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہم نوا پرویز شاہدی کی آٹھویں برسی پر ایک نظم لکھ کر چپ نہیں ہو جاتے ان کی بارہویں برسی پر بھی نظم کہتے ہیں۔ جناب مظہر امام کی شادی کے شبھ اوسر پر '' سہرا'' جیسی ہندی آمیز نظم کہتے ہیں وہیں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے لیے کلکتے سے مظہر امام کی رخصت پر بھی '' نظم'' لکھتے ہیں :

پل دو پل کا ساتھ ہو چاہے جیون بھر کا ساتھ
مل کے بچھڑنا کر جاتا ہے ہردے پر آگھات
ہردے پر آگھات بڑی ہردے پر آگھات

(نظم : آگھات / ص : ۱۳۹)

www.taemeernews.com

جواباً پتہ نہیں مظہر امام صاحب نے قیصر شمیم صاحب کا ذکر کہاں کہاں کیا۔ یہ لہریں آتی ہی ہیں کہ جاتی بھی ہیں۔

جناب قیصر شمیم کی غزلیں قاری کو محظوظ تو کرتی ہیں مرعوب نہیں کرتیں کہ وہ اپنے غزلوں میں اپنی علمیت اور ادق قوانی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ بیشتر غزلوں کے قوانی حروف علت (اوی) ہی ہیں۔ الف واؤ اور ی ہی سے ان کا کام چل رہا ہے:

میری اپنی کتھا ہے بابا' تیرا کیا　　میرا دکھ میرا ہے بابا' تیرا کیا
دھند لکے کا سماں بدلے تو دیکھوں　　کوئی چہرا کہیں چمکے تو دیکھوں

اپنے گھر کے لیے روشنی تو' میں کسی کے دیے سے نہ لوں گا
اے شب غم ڈراتی ہے کس کو' جانتا ہوں کہ اک دن مروں گا

ان کی نظموں پر ہندی اس قدر غالب ہے کہ آسانی سے دیوناگری میں لکھی جاسکتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تخلیقات ہندی میں بھی چھپتی رہتی ہیں" لفظ بولتے ہیں" تو دل و دماغ متوجہ ہوتے ہیں۔" سانس کی ڑ" سے پہاڑ جیسے دن کٹ ہی جاتے ہیں۔" دھند اور کرن" تو" ساعتوں کے سمندر" کا ساتھ نبھاتے ہی ہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ لفظ لفظ سے قیصر شمیم کا دل نواز چہرہ جھانکتا ہے۔

غزل

قیصر شمیم

سامنا سرد ہوا کا ہوگا　　دھوپ اوڑھے ہوئے چلنا ہوگا
ناؤ ٹوٹی ہے تو تختہ لے لے　　راہ میں پھر کوئی دریا ہوگا
چھاؤں بادل کی سدا کیا ہوگی　　دو گھڑی کا کوئی سایا ہوگا
ایک ہی دور کے مصلوب ہیں ہم　　حال اس کا مرے جیسا ہوگا
کھل گیا ساری پناہوں کا بھرم　　اب کہاں رین بسیرا ہوگا

زندگی ان دنوں کیا ہے قیصرؔ
کھیلنے والا سمجھتا ہوگا

www.taemeernews.com

معین اعجاز

دہلی

مجموعہ غزلیات ''سانس کی دھار'' کا شاعر قیصر شمیم

ایسے کچھ ''پراگندہ طبع لوگ'' اس دور میں بھی مل ہی جاتے ہیں جو فیض کے الفاظ میں اس بات کے قائل ہیں کہ

غم جہاں ہو رخ یار ہو کہ دست عدو سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

کلکتہ میں ایک ایسی ہی شخصیت قیصر شمیم کی بھی ہے۔ان کا اصل اور پورا نام تو عبد القیوم خاں ہے لیکن ادبی دنیا میں قیصر شمیم کے نام سے مشہور ہیں اور سچ پوچھیے تو یہی ان کا اصل نام بن گیا ہے۔ بہت پہلے عمید انکسی کے نام سے شعر کہتے تھے۔شاید یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے :

درد بھرے کچھ گیت عمید دل ہی دل میں گاتا ہوں

دت ضلع ہگلی کے مقام انکس میں ہوئی تھی، گو ان کا خاندان اتر پردیش کے ضلع غازی پور سے آ کر یہاں آباد ہوا تھا۔تعلیم کلکتہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور معلمی کا شغل اختیار کیا۔شروع سے آخر تک ''استاذ'' ہی رہے۔اسکولوں میں استاد، کالج میں استاد اور یونیورسٹی میں بھی جز وقتی استاد۔ باقاعدہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے لیکن یونیورسٹی سے شاید اب بھی جز وقتی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔اپنی ''استادی'' سے کبھی اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔ملازمت سے سبکدوش ہو گئے لیکن شعروں کی اصلاح کرنے والے شاگردوں سے بھلا کیسے رشتہ توڑتا؟ ہوڑہ سے لے کر کلکتہ تک کے شاعروں کا جم غفیر ہمہ وقت ان کے گرد نظر آتا ہے۔

میں اپنے گوشے میں تنہا تڑپ رہا ہوں مگر عجب طرح کا ہے جم غفیر میرے ساتھ

لیکن یہ جم غفیر ان سے بڑی محبت کرتا ہے۔غالبؔ نے اپنے ایک خط میں اپنے کسی شاگرد کو لکھا تھا کہ فلاں کو خدا نے فرض اور رسول نے سنت سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا لہٰذا وہ امید کرتے ہیں کہ کم از کم ان کے (غالبؔ کے) احباب بھی انھیں معاف کریں گے اور اصلاح کے لیے کلام نہیں بھیجیں گے۔ (نقل مطابق اصل) لیکن قیصر شمیم صاحب تو آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کے ڈر سے اپنے شاگردوں سے اشارتاً بھی کبھی کچھ نہیں کہہ سکیں گے۔

www.taemeernews.com

بہر حال" سانس کی دھار" ان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ دہائیوں قبل ان کا پہلا مجموعہ" ساعتوں کا سمندر" اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں شائع ہوا تھا لیکن اسے ان کی شاعری کا نامکمل تعارف قرار دیا گیا تھا۔

ہمارے جسموں کو موجیں نگل گئیں قیصر　　　کہ ساعتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

پہلے اور دوسرے مجموعے کی اشاعت کے درمیان کم وبیش تین دہائیوں کا فاصلہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ انھی کے الفاظ میں یہ ہے کہ" طبیعت ایسی کہ کسی اکاڈمی یا کمیٹی سے روپے حاصل کرنے پر بھی آمادہ ہی نہیں ہوئی۔ میرے دل نے مجھے ہمیشہ یہی مشورہ دیا کہ اللہ جب توفیق دے تو اپنی جیب سے روپیہ لگا کر اپنا مجموعہ کلام شائع کرنا　　"جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا کہ طبیعت میں بے نیازی کا عنصر حد سے بھی سوا ہے۔ سو جب" اللہ نے توفیق دی" تو مجموعہ بھی منظر عام پر آ گیا۔" سانس کی دھار" میں ایک سو غزلیں ہیں جن کا انتخاب ۱۹۵۱ء اور ۱۹۹۶ء تک کے دستیاب کلام سے کیا گیا ہے۔ یعنی ان کی پورے ۴۵ سال کی شاعری کا نچوڑ اس کتاب میں شامل ہے۔ اس کالم میں اس سے پہلے بھی میں نے ایک سے زائد بار کہا ہے کہ شاعری کے رموز ونکات سے میں واقف ہی نہیں ہوں لہٰذا میری رائے کسی نقاد یا اہلِ نظر کی رائے نہیں بلکہ ایک قاری کی ہوتی ہے اور قاری تو اپنی پسند یا ناپسند کا ہی اظہار کر سکتا ہے نا!" سانس کی دھار" ایک پختہ کار اور انتہائی سلجھے ہوئے شاعر کا مجموعہ ہے جس نے ہر آن بدلتی ہوئی دنیا کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ :

پھول، شجر، انسان، سبھی کے چہرے ہم نے دیکھ لیے　　　سامنے آئیں جو تصویریں، سب میں نکلا کچا رنگ

کیا ہوا وہ شعورِ راہِ حیات　　　موڑ آیا پھیل گئے کچھ لوگ

شہر میں جان کا زیاں تھا بہت　　　جنگلوں میں نکل گئے کچھ لوگ

قیصر شمیم نے، بنگال میں ۶۰ کی دہائی کے اواخر اور ۷۰ کی دہائی کے اوائل کا وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جب صورتِ حال فیض کے الفاظ میں یہ تھی کہ

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا　　　تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی

اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی نافذ ہوئی۔ آزادی کے بعد یہ بڑا ہی عجیب اور تلخ تجربہ تھا۔

کریں گے ذکر ہی کیوں سربریدہ شاخوں کا　　　ہماری آنکھوں سے منظر تو چھین لو پہلے

کسی اڑان کا قصہ کوئی نہ لکھے گا　　　مگر خیال کے شہپر تو چھین لو پہلے

صاحبو! یہ مجموعہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ چلتے چلتے ایک اور شعر سن لیجیے۔

نہ پوچھ مجھ سے حالِ دل کساں دونوں ہے زندگی　　　کسی عروج دیدہ کی شب زوال کی طرح

www.taemeernews.com

سیّد شعیب رضا فاطمی

دہلی

گھوڑے کی ڈھائی چال سے آگے؟

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی قصرِ اقلیم سخن سیر کو نکلنے کے دوران قصر کی چوکھٹ کی جاذبیت ہی اتنا مبہوت کر دے کہ اندرونِ قصر جانے کی خواہش کا دم نکل جائے اور قلم ماہی بے آب کی طرح ریگِ قرطاس پر تڑپنے پھڑکنے لگے۔ شاید ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے لیکن ہوتا ضرور ہے۔

کہنہ مشق شاعر جناب قیصر شمیم کے تین مجموعے میرے میز نما بستر پر کئی دنوں سے محوِ استراحت تھے اور میں "سانس کی دھار" کے پیشِ لفظ بعنوان "جواز......" کے دو زینے پار کر کے ہانپنے لگتا تھا۔ بعد از جواز یعنی عنوان جوز ینہ تھا۔

"سوال ہوگا : اس مجموعے کی اشاعت کا جواز؟

میرا جواب ہوگا : میرا وجود"

اس کے بعد کے زینے پر قدم رکھنے کی ہمت جتانے میں کئی دن لگ گئے لیکن ان دو جملوں کے سحر سے میں اب تک آزاد نہیں ہو پایا۔

مجموعے کی اشاعت کا "جواز" وجود بظاہر عام سی بات لگے لیکن اتنی شفاف گفتگو کرنے والے شخص یا شخصیت کی جانے کتنی پرتیں لمحوں میں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ کتنا مطمئن ہوگا وہ شخص اپنے وجود سے؟ کتنا فخر ہوگا اسے اپنے وجود پر؟ کس قدر اعتماد ہوگا اسے اپنی تخلیق پر؟ اور اس کی تخلیق کتنی دو ٹوک ہوگی؟ یہ اور اس طرح کے بہت سارے سوالات عنوان بن کر الجھا دیتے تھے اور میں اپنی عادت کے مطابق داڑھی کھجاتا رہ جاتا تھا۔

حالاں کہ قیصر شمیم کی پوری شعری بساط ترقی پسند تحریک کے ان تمام بازی گروں سے منفرد نہیں کیوں کہ گھوڑے کی ڈھائی چال سے الگ وہ تین چال چل بھی نہیں سکتے تھے لیکن ماہر بازی گر اپنے مہروں کے استعمال کا وقت جانتا ہے اور قیصر شمیم حساس ہی نہیں دور اندیش بھی ہیں اور شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ :

جیسا بھی ہے اس میں نقلی پن تو نہیں یہ میرا چہرہ ہے بابا تیرا کیا

www.taemeernews.com

ہر شاعر کی شخصیت گری اس کا عہد کرتا ہے، معاشرہ اس میں رنگ بھرتا ہے اور زبان اسے مشتہر کرتی ہے لیکن اس کی شخصیت کو تشکیل کرتے ہیں وہ واقعات وحادثات جو اس شاعر کے وجود کو کبھی گرماتے ہیں، کبھی ہلاتے ہیں اور کبھی ریزہ ریزہ بھی کر دیتے ہیں۔

قیصر شمیم کی پوری شاعری میں ایسے واقعات وحادثات کا ایک قافلہ ہے جو کہیں بھی سطحِ شعر سے فرار نہیں ہوتا۔

لفظوں کے رس گلے میرے پاس نہیں — تلخ اگر لہجہ ہے کیا

لہجے میں جھنجلاہٹ تو ہے لیکن اپنے وجود پر اعتماد کس قدر ہے کہ جھنجلاہٹ دب جاتی ہے اور شعر مزہ دیتا ہے:

سروں کے ازدحام میں ہے فکر انھیں کلاہ کی — یہ سر کٹا تو کیا ہوا' وہ سر کٹا تو کیا ہوا

کیا ان نشتر نما شعروں کے خالق کو رواداری میں لیا جاسکتا ہے؟ یا انھیں کسی ازم کے بھیڑیے اٹھا کر لے جاسکتے ہیں؟ یہ اشعار ہماری پوری تہذیب کو اپنی گرفت میں لینے والے مافیاؤں کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے ہیں۔

سروں کے ازدحام میں ہے فکر انھیں کلاہ کی

کلاہ کی فکر کسے ہے جن کے سروں پر کلاہ وقار ہے اور یہ کلاہ وقار رکھنے والے جذبات واحساسات کو بھول کر ان کے کٹے پڑے سروں کے مینار پر کھڑے ہو کر اپنی کلاہ بچانے کی خاطر ظالم سے بیعت کرنے کو مصلحت ودور اندیشی جانتے ہیں۔ یہ سب آج ہمارے مشاہدے اور کھلی آنکھوں کے تجربے کا حصہ ہے لیکن قیصر شمیم کے تجربے اور مشاہدے کو سلام کہ انھوں نے تجربے کو شعر کا قالب دیا اور ہم لب بستہ ہیں۔

قیصر شمیم صاحب آپ یوں بھی خوش قسمت ہیں کہ آپ کو دہلی کی مٹی نہیں ملی کیوں کہ ہماری مٹی میں قصیدہ خوانی کے بیج زیادہ برگ وبار لاتے ہیں اور آپ کے یہاں احتجاج اور یہی احتجاج آپ کا حسن بھی ہے، وقار بھی اور اسی احتجاج نے آپ کو ایسے شعر دیے ہیں:

دھواں نہیں نہ سہی آگ تو نظر آئے — یوں چپکے چپکے سلگنے کا فائدہ کیا ہے

لیکن اس آگ کے شعلے ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا نہیں کرتے۔ بصارت نا آشنا نہیں کرتی کیوں کہ وہ تیرنے کے دوران بھی اس بات کا خیال رکھتے ہیں:

نظر ہر سمت رکھنا تیرنے میں — نئے موسم کی جل کُمبھی سے بچنا

کیوں کہ جل کمبھی نما آکٹوپس ہمارے پورے معاشرے میں بظاہر بڑے ہرے بھرے اور شاداب

www.taemeernews.com

مناظر پیش کرتے ہیں لیکن ان مناظر کی گھات بڑی خطرناک ہوتی ہے۔

میں نے شاید پہلے کہا ہے کہ شاعر کی یہ بہت بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ لفظوں کے استعمال کے وقت انتخاب لفظ اور لفظوں کے اندرون میں پوشیدہ حرارت سے پوری طرح واقف ہو۔ قیصر شمیم کے یہاں یہ خوبی موجود ہے اور شاید اسی لیے ان کے اشعار میں 'جل کبھی' اور 'رس گلے' جیسے غیر شعری الفاظ بھی شعری پیکر کا حصہ بن جاتے ہیں۔

کلاسیکی روایت کی پاسداری ہمارے کہنہ مشق شاعروں کی ایک بڑی صفت ہوتی ہے لیکن قیصر شمیم جب اس روایت کی پاس داری کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو الفاظ ضرور روایتی ہوتے ہیں لیکن ان اشعار میں الفاظ کی ترکیب بدل جاتی ہے اور شعر احتجاج کا پرچم بن جاتا ہے :

پتھر کے بت نہیں ہیں الم دیدگانِ شہر — پیہم سکوتِ لب سے یہاں کون کام لے
اہلِ ہنر کی جان پہ بن آئے بھی تو کیا — خیرات میں عطا ہو تو انعام کون لے

خیرات کے انعام کی بات کرنے کے لیے جس شاعرانہ تہذیب اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے، اس حوصلے سے مملو شاعری ہی قیصر شمیم کی شاعری ہے اور یہ پوری تہذیب انھیں ودیعت ہوئی ہے۔ ان کے اس فکری سرچشمے سے جہاں وہ 1946ء میں سالانہ امتحان کے نتائج سننے سے پہلے بے چینی اور اضطراب کے عالم میں پہنچ گئے تھے اور کہا تھا :

"یا اللہ! مجھ پر رحم کر اس بار کسی طرح کامیاب کر دے"

یہ وہ فکری سرچشمہ ہے جس کے سوتے کبھی سوکھتے نہیں کیوں کہ ان کا تعلق شکم مادر سے ہوتا ہے۔ ماں کے سینے کی گرمی اسے احساس کی وہ نرمی عطا کرتی ہے جن کو اگر سینچ رکھا جائے تو چاہے پوری زندگی بک جائے انسان اپنے اس سرمائے کو کسی قیمت بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

میں نے ترقی پسند شاعروں پر کام کرنے کے دوران یہ بات خاص طور پر نوٹ کی ہے کہ ان کے فکری سرچشموں کی سوت کہیں نہ کہیں انھیں کے مذہبی خانوادے سے ضرور جوڑتی ہے، لیکن ایسے شعرا کی شاعری خود ان کے اس فعل کی چغلی کھاتی ہے :

اپنی پہچان کتنی جھوٹی تھی
مدتوں میں بھی خود سروں میں تھا
کوئی جھلک ملتی تھی شاید اپنے شکستہ ڈھانچے کی
جو پیکر بھی سامنے آیا ہم اس پیکر میں ڈوبے

www.taemeernews.com

اس طرح قیصر شمیم کی غزلوں میں شکست خوردگی اپنے پورے شعری پیکر کے ساتھ جگہ جگہ اس بات کی چغلی کھاتی ہے کہ انھیں اپنے خودسر ہونے پر افسوس ہے اور وہ اپنے اس بوسیدہ ڈھانچے کی تلاش میں ہیں جو مکمل تو تھا لیکن جسے وہ نامکمل سمجھ بیٹھے تھے۔

میں نے پہلے جس وجود کے فخریہ اظہار کا ذکر کیا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے پھر کہوں گا کہ قیصر شمیم نے اپنے شعر سے دغا نہیں کی ہے، جس طرح حالات بدلے ہیں، ان کی شاعری فطری طور پر بدلتی چلی گئی ہے اور جہاں بھی وہ تذبذب کے شکار ہوئے ہیں، شک کا کانٹا ان کے اشعار میں خود بخود دکھڑا ہو جاتا ہے اور وہ شک کے اس کانٹے کو جوں کا توں کھڑا رکھتے ہیں۔ زندگی کے نشیب وفراز سے واقف اس شاعر کے یہاں زخم کو مصلحت کی پٹی نصیب نہیں اور نہ ہی اس کے لہجے میں تھرتھراہٹ ہے۔ وہ

"جو کچھ بھی ہے جیسا بھی ہے، جی لیتا ہے زہرِ ہلاہل پی لیتا ہے"

کے مصداق ہر حال میں مست رہنے والے شاعر ہیں۔

اور اس لیے ان کی شاعری پر بہار ہے جسے کسی موسم خزاں بے برگ وبار نہیں کر سکتی اور آخر میں قیصر شمیم کی یہ چھوٹی نظم شاید میری تحریر کو وقار بخش دے :

بت کدہ بت کدہ تلاش کیا

کون جانے کہاں ہے وہ پتھر
جو صنم تھا کبھی عقیدت کا
ہائے کیا اس کو پاش پاش کیا

رہ گزر رہ گزر تلاش کیا

کون جانے کہاں ہے وہ وحشی
جو کبھی دشت دشت پھرتا تھا
ہائے کس کو جنوں قماش کیا

آئینہ آئینہ تلاش کیا

کون جانے کہاں ہے وہ چہرہ
جو کبھی میرا چہرہ ہوتا تھا
ہائے کتنا غم معاش کیا

www.taemeernews.com

کمال جعفری

پٹنہ

ساعتوں کا سمندر اور قیصر شمیم

مغربی بنگال میں جن شعرائے کرام کو عوام وخواص میں خاصی مقبولیت حاصل ہے ان میں حضرت قیصر شمیم کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ جناب قیصر شمیم کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور ہر مجموعہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے، اس وقت ان کے پہلے شعری مجموعہ" ساعتوں کا سمندر" پر اپنا یہ مضمون قلم بند کر رہا ہوں۔ یہ مجموعہ کلام ۱۹۷۱ء میں ادارہ سپرنا کے زیر اہتمام ہوڑہ سے شائع ہوا تھا اس میں قیصر شمیم صاحب کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں میری نظر میں ان کا یہ شعری مجموعہ شعری فکر وفن کا ایسا حسین مرقع ہے کہ اسے پڑھ کر ذہن کو آسودگی اور دل کو زندگی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ اس بات کی شہادت پیش کرتا ہے کہ غم وآلام زمانہ سے جو تلخ وشیریں تجربات شاعر نے حاصل کیے ہیں یہ اس کا لب ولباب ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں شاعر کو یکساں قدرت حاصل ہے ان کا کلام پڑھ کر قاری سرسری طور سے گزر نہیں سکتا بلکہ گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ زبان و فن اور فکر وتحقیق کا سرچشمہ ان کے کلام میں رواں دواں ہے سب سے پہلے میں ان کے غزلیہ اشعار کا انتخاب پیش کر رہا ہوں جو مجھے بے حد پسند ہیں :

جو نشست ہے کسی اور کی اسے رکھو شوق سے مگر
میرا اپنا جو بھی مقام ہے، مجھے وہ مقام تو دو کبھی

لفظ کی سطح سے گہری ہیں بہت سی باتیں
ہم بھی کچھ عرض کریں کوئی سخن فہم تو ہو

ہمارے جسموں کو موجیں نگل گئیں قیصر
کہ ساعتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

جس کے بغیر دل کی زباں گنگ سی لگے
وہ لفظ کیوں رہے لب اظہار سے الگ

آہ فہرست اس کے اپنوں کی
میں ہمیشہ ہی دوسروں میں تھا

میری زیست کا حال نہ پوچھو یہ ظالم تو ایسی ہے
جیسے کسی رستے کے کنارے برسوں کا بے برگ شجر!

کتاب زیست میں کتنا الجھ گیا ہوں میں
ہر ایک لفظ کو رک رک کے پڑھ رہا ہوں میں

کچھ جھلک ملتی تھی شاید اپنے شکستہ ڈھانچے کی
جو پیکر بھی سامنے آیا ہم اس پیکر میں ڈوبے

www.taemeernews.com

یہ اشعار احساس وفکر کے تاروں کو موسیقی کی لذت فراہم کررہے ہیں، قیصر شمیم صاحب کا کلام آج سے دس سال قبل ہندوپاک کے تمام اہم ادبی رسائل شائع ہوتے تھے اور آج بھی وقتاً فوقتاً ان کا کلام شائع ہوتا ہے اور پڑھنے والے سنجیدہ قاری ان کے پرکشش اشعار سے اپنے دامنِ شوق کو مالا مال کرتے ہیں ان کے کلام میں قدیم وجدید اسلوب کا امتزاج ملتا ہے وہ ترقی پسند اور جدیدیت کے چکر میں نہیں پڑتے بلکہ میرؔ و غالبؔ اور اقبالؔ کی طرح فطری شاعر ہیں ان کے یہاں فکری جو دھم لئے ہے وہ موسیقی کی فضا بناتی ہے۔

حضرت قیصر شمیم غزلوں کی طرح اپنی نظموں کے ذریعہ اردو ادب میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں ان کی چند نظمیں یہ ہیں جو ساعتوں کا سمندر میں موجود ہیں اور کوئی شخص ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا:

(۱) آئینہ آب (۲) تاش کے پتے (۳) ایک صبح (۴) تہذیب کا زندانی (۵) آج کا انسان (۶) تلاش (۷) سوال نامہ (۸) نئی روایت (۹) گمشدگی اور (۱۰) بے وجودی۔

یہ نظمیں خونِ جگر سے لکھی گئی ہیں اور انسانیت کے کرب اور موجودہ ماحول کے دردناک پہلوؤں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ ان میں جذبے کی آنچ کبھی تیز اور کبھی مدھم نظر آتی ہے لیکن دردِ انسانی کا مظہر ہے۔ بطور نمونہ ان کی ایک مختصر نظم "تاش کے پتے" پیش کررہا ہوں۔

ہم سب کیا ہیں تاش کے پتے!
جانے کتنی صدیوں سے ہم
انگلی انگلی ناچ رہے ہیں (جیسے کچھی ناچ رہی ہو)
اور ہمارے ناچ کی دھن پر
کھیلنے والے جھوم رہے ہیں
اپنی تجوری چوم رہے ہیں

قیصر شمیم صاحب جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے انسان ہیں ان کی انسان دوستی پر ان کے احباب رشک کرتے ہیں ان کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑی ہے وہ بے حد ہر دل عزیز ہیں ان کی ہر دل عزیزی کا سب سے اہم سبب شاعری اور طبیعت کی سادگی ہے۔ آج وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں لیکن بطور اعزاز مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے وائس چیرمین ہیں۔ شاعری کی طرح ان کی نثر بھی پرکشش ہے وہ شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا مضمون ان کے ادبی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنے کا متحمل نہیں ہے۔ یہ تو ایک خراجِ تحسین ہے جو میں ان کو بطور خلوص پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں۔

www.taemeernews.com

ابوذر ہاشمی
کلکتہ

تخلیقی اظہار اور لسانی معیار کی کشمکش کا شاعر

ہم نے جب شہرِ ادب میں آنکھیں کھولیں تو چند فنکار منظر بہ منظر نمایاں نظر آئے۔ ان کے نام لوگوں کی زبان پر تھے، رسائل و جرائد کے صفحات پر بھی۔ محفلوں، مجلسوں میں انہیں گاہے گاہے سنا بھی اور محظوظ بھی ہوا۔ ان ناموں میں سے ایک نام قیصر شمیم کا بھی ہے۔ وہ کم و بیش نصف صدی سے زبان و ادب کی خدمت میں لگے ہیں۔ وہ شاعر ہیں، نثر نگار بھی ہیں اور اچھے مبصر بھی۔ ان کے رشحاتِ قلم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذی علم بھی ہیں۔ زبان و ادب کے نکات پر گرفت بھی ہے اور اس کے فیضِ عام سے استفادہ کرنے والوں کا ایک دراز سلسلہ بھی۔ یعنی قیصر شمیم محبوب و مقبول استاد بھی ہیں۔ حضرت دراصل درویش صفت ہیں، صوفی منش ہیں۔ درویش اور صوفی مذہب کی ترویج و اشاعت کے لئے اپنی ذات اور مفادات سے بیگانہ ہو کر سب کچھ لٹا دیتے ہیں، اور رات کی تنہائیوں میں خود کو بارگاہِ ایزدی میں پیش کر دیتے ہیں، تو قیصر شمیم اردو زبان کی اشاعت و فروغ اور معیار کے حصول کی کد و کاوش میں اپنی ذات اور دیگر ترجیحات سے بیگانگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وابستگان کی تکمیلِ ضرورت، خلق کی خدمت اور زندگی کی عقوبت سے جب بھی انہیں فرصت ملتی ہے، نوائے سروش سننے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کے دم سے ایک وسیع علاقے میں شعر و ادب کا ماحول پیدا ہوا ہے۔ بہت سے افراد نے ان سے شاعر ہونے کا حوصلہ بلکہ گمان پایا ہے، اور چند ایک نے تو شہرت اور ناموری بھی حاصل کر لی ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذات سے ایک انجمن بن گئے ہیں۔ ہمارا قلم ان کے اس اخلاص اور اصلاحِ زبان کے لئے ان کی مشقت اور ریاضت کو خراج پیش کرتا ہے۔ لیکن آج کی تقریب میں ان کے تخلیقی اظہار کے تنقیدی مطالعے کی شرط ٹھہری ہے۔ قلم ان کی پرکشش شخصیت، اخلاص اور زبان دوستی کا گرویدہ ہے، تو ساتھ ہی حق و انصاف کے بے کم و کاست اظہار کا حلف بردار بھی۔ زیرِ نظر تحریر اسی کی ترجمان ہے۔

قیصر شمیم کی شاعری کی خصوصیات سے متعلق اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف زبان و بیان میں شستہ اور ناپ تول میں کھرے ہیں۔ بعض دیگر شاعروں کی طرح ان کے یہاں محدود بحروں کا استعمال ہے، نہ ہی

www.taemeernews.com

مخصوص قوانی کی تکرار۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جائے کہ ان کے یہاں غنائیت کے حصول کی شعوری کاوش نہیں۔ ان کی شاعری میں بلاغت کم ہے لیکن فصاحت سے خالی نہیں۔ لفظوں کے استعمال میں وہ اکثر کفایت شعاری کی بجائے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں جو تخلیقی مزاج کے منافی ہے۔ ان کی شاعری کسی عاشق کی خود رفتگی کی داستان نہیں لیکن اس میں الم دیدگان کا بیان ضرور ہے۔ اس سے قبل کہ موصوف کی شاعری پر مکمل کر بحث ہو، چند اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں تا کہ رنگ شاعری کا عمومی اندازہ لگایا جا سکے۔

اپنے مٹنے کا تماشہ دیکھ لیں — اے عہد سزا! کیا دیکھنا

پل نہ تھا اور سامنے اس کے — ایک طوفاں بدوش تھا

آگئی تھی لڑکھڑاہٹ پاؤں میں — آندھیوں نے کچھ سنبھالا ہے مجھے

وجود میرا ہے کیسا یہ جانتا ہوں میں — تمہاری جنبشِ ابرو ہوں اور کیا ہوں میں

سروں کے ازدحام میں ہے فکر انہیں کلاہ کی — یہ سر کٹا تو کیا ہوا وہ سر کٹا تو کیا ہوا

یوں جلوں میں کہ نہ رہوں شرمندہ سورج سے — اور کچھ اور مجھے سوختہ جانی دینا

دل کی خلش بڑھے تو کھلے بابِ زخمِ دل — کانٹا ہمارے سینے میں کھٹکے تو شعر ہو

صبح سے تا شام ہم جلتے رہے ہیں — تم نے دی ہے کیا سزا منظر بہ منظر

ہے پست، بہت معیارِ ستم کیا زور دکھایا جاتا ہے — گردن جو کبھی اٹھتی ہی نہیں اس کو بھی جھکایا جاتا ہے

نہ پوچھ مجھ سے حالِ دل کہ ان دنوں ہے زندگی — کسی عروج دیدہ کی شبِ زوال کی طرح

دیکھئے کہ حالِ دل شبِ زوال نہیں بلکہ شبِ زوال کی طرح ہے۔ لیکن اس تجزیاتی گہرائی میں اترنے سے پہلے ان اشعار سے شاعر کی زبان دانی، شستہ بیانی اور عروضی گرفت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان اشعار سے شاعر کی فنی پختگی کی ایک عمومی شناخت ہی قائم ہو پاتی ہے۔ جب کہ فی الوقت بحث یہ ہے کہ موصوف کی شاعری کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ قیصر شمیم کی غزلوں کے بالاستیعاب مطالعہ اور مختلف پہلو کے پیشِ نظر متعدد قرأت کے بعد پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کا امتیازی وصف تراکیب سازی سے ظاہر ہوا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات زبان پہ عبور اور فنی مہارت میں شاعر کے امتیازات تلاش کریں۔ لیکن اس عاجز کے خیال میں زبان پر عبور یا فنی مہارت کسی شاعر کی امتیازی خصوصیت نہیں۔ ان کی حیثیت تو شاعری کے بنیادی مقتضیات کی ہے۔ تخلیقی اظہار دراصل زبان پر عبور کا مرہونِ منت نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ جذبے کی شدت اور تخیل کی پرواز کا ساتھ دینے کے لیے زبان کے معیار کو دانستہ نظر انداز کر دینا پڑے۔ البتہ اس دانستہ نظر انداز

www.taemeernews.com

کرنے کی بنیادی اہمیت ضرور ہے۔ یہ حق صرف اس شاعر کو ہی حاصل ہوسکتا ہے جو اعلیٰ زبان دانی کا مظاہرہ کرتا رہا ہو لیکن تخلیقی جبر کی بنا پر گاہے گاہے لغزشِ زبان کا شکار ہو گیا ہو۔ ایسی صورت میں لغزشِ زبان کو عیب کی بجائے جذبے کی صداقت اور جنوں کی تقدیس کا خراج تصور کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی شاعری اصلاح سے بلند ہوا کرتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ شاعری کی اصلاح ممکن نہیں۔ یہ سلیقہ تو صرف ان غیر شاعروں کے لیے ایک عطیہ ہے جو زبان و عروض پر حاوی کسی شخص کے اشتراکِ عمل سے شاعر ہونے کا جمہوری حق حاصل کرتے ہیں اور اس کا مقصد ذات یا ضمیر کا اظہار نہیں بلکہ شہرت کا حصول ہوا کرتا ہے۔ گفتگو قدرے پھیل سی گئی ہے۔ عرض یہ کرنا تھا کہ زبان پہ دسترس اور فنی مہارت قیصر شمیم کی شاعری کی اختصاصی جہت نہیں۔ ہمارے خیال میں شاعر کی تخلیقی جہت تراکیب سازی میں زیادہ عیاں ہوئی ہے۔

ترکیبیں یوں تو چند لفظوں کا مجموعہ ہوا کرتی ہیں اور اضافی، توصیفی، توضیحی یا کسی اور وصف کا اظہار کرتی ہیں اور عام طور پر زبان کے قواعد کی پابند ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اصل میں یہ جذبات کے آتش فشاں کو سامنے لاتی ہیں، دریائے معانی کو الفاظ کے کوزے میں سمیٹ لیتی ہیں۔ یہ ترکیبیں عموماً مصرعے کا حصہ ہوا کرتی ہیں، لیکن خلاق شاعر کے یہاں ترکیبیں بسا اوقات مصرعے میں اس طرح پیوست ہو جاتی ہیں کہ پورا مصرع اس ترکیب کے باعث ضرب المثل بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ سعدیؔ کا ایک مصرعہ ملاحظہ ہو وہ کہتے ہیں :

کور مقری نمی شود چشم روشن

یعنی کور مقری چشم روشن نہیں رکھتا۔ یہاں شیخ سعدیؔ نے اگرچہ تخلیقی جبر کے تحت چشمِ روشن کو تخفیف کر کے چشمِ روشن کر دیا اور قواعد کی خلاف ورزی کی، لیکن مصرعے کی شگفتگی نے اسے نادر بنا دیا اور مصرعہ ضرب المثل بن کر صدیوں سے اہلِ علم کی زبان پر ہے۔ قیصرؔ شمیم کے مصرعوں میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت کم کم نظر آتی ہے۔ لیکن مصرعوں کے جزو کے طور پر ان کی ترکیبیں اپنے آپ میں شاعر کے تخلیقی ابال کو پیش ضرور کرتی ہیں۔ اس سے قبل کہ شاعری تراکیب کا مطالعہ کیا جائے اور مثالیں پیش کی جائیں اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ قدرتِ زبان اور استادی کا مظاہرہ کرنے کے لیے وضع کی جانے والی ترکیبیں بوجھل پن اور طبیعت کے انقباض کا سبب بھی بن سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر فی الوقت امیرؔ مینائی کا ایک شعر ملاحظہ ہو :

گلوئے ناطقہ میں مرسلہ سکوت کا طوق

ازارِ سامعہ پنہاں بزیرِ پردۂ گوش

امیرؔ مینائی کی استادی پہ حرف لانے کی کسے مجال۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ راقم کے جدی بزرگ حضرت کے

www.taemeernews.com

علم و فضل کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کر چکے ہوں اس کے لیے کچھ کہنا سوئے ادب ہوگا' عیاں راچہ بیاں؟ نطق اور سامعہ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے' کہنے کے لیے مذکورہ بالا شعر کسی طور پر انگیز کیا جا سکتا ہے' نہ ہی ان تراکیب کی تزئین کی داد دی جا سکتی ہے۔ غالب کے یہاں ایسی بہت سی ترکیبیں ملتی ہیں جن کو انگیز کرنے کے لیے صبر ایوب چاہیے۔ مذکورہ مبحث کی روشنی میں قیصر شمیم کی ترکیبوں کا مطالعہ غماز ہے کہ ان کی ترکیبیں کسی نکتے کو نئے ڈھنگ سے باندھنے کی بجائے فکر کو لفظوں میں سمیٹنے کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ معنی کی ایک دنیا کو لفظوں میں سمیٹ لینا ان ترکیبوں کا خاص وصف ہے۔ نیز یہ کہ یہ ترکیبیں شاعر کے فکری رجحان کا اشاریہ بھی بن گئی ہیں۔ ایک نکتہ اور عرض کرتے چلیں۔ قیصر شمیم کی شاعری میں ترکیبوں کی یہ نادرہ کاری فارسی شاعری کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ قیصر شمیم فارسی تراکیب خوب کاڑھتے ہیں۔ اس عمل میں حافظ کے مطالعہ کا اثر پر نمایاں ہے۔ اردو شاعری پر فارسی کے اساتذہ شعرا بالخصوص حافظ و سعدی کے اثرات براہِ راست مرتب ہوئے۔ حافظ کی نغمگی اور غنائیت نے ہمارے شعرا کو اپنا گرویدہ بنایا ہے تو سعدی کی سادگی اور اخلاقی موضوعات نے اپنا جادو جگایا ہے۔ قیصر شمیم کے یہاں سعدی کے اسلوب کی سادگی اور برجستگی کے اثرات نظر نہیں آتے' لیکن حافظ کے اثرات موجود ہیں۔ بالخصوص ترکیب سازی کا یہ ہنر انہوں نے حافظ سے سیکھا ہے۔ تاہم حافظ کی غنائیت اور شگفتگی ان کی شاعری کا حصہ نہ بن سکی۔ موصوف کی شاعری میں تاثیر کی کمی اور ایک نوع کا فکری بوجھل پن بھی ہے جو تقلیدی رجحان کا نتیجہ ہے' اور کچھ استادی کے مظاہرے کا۔ قیصر شمیم کی شاعری پہ حافظ کے اثرات کا مظاہرہ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ یہاں چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ترکیب سازی کا عمل نمایاں ہے:

پتھر کے بت نہیں ہیں اہلِ دیدگانِ شہر
پیہم سکوتِ لب سے یہاں کون کام لے

ہم تھے تو تھے نشانۂ صد تیرِ آسماں
سوغات ایسی اب سحر و شام کون لے

قیصر نگاہِ طائرِ معصوم بھی ہے تیز
دانہ تو ہے مگر ہے تہِ دام کون لے

اے اہلِ طرب آؤ ذرا جھانک کے دیکھو
کس دل میں نشستِ غم و آلام نہیں ہے

ممکن ہے کہ ہو دردِ جگر عام ولیکن
شائستگیِ ذوقِ الم عام نہیں ہے

قلتِ صہبا کا یہ اثر رندوں پر
رسمِ تنگ بخشی کی بڑی تعظیم ہوئی

سرکش ہونا اہلِ ہنر نے سیکھ لیا
تجھ سے جب توہینِ سرِ تسلیم ہوئی

اول اول دل کی خلش تھی گوشہ نشیں
آخر آخر شورشِ ہفت اقلیم ہوئی

ہم نقش گرِ خطرۂ فردا تو نہیں ہے
شورش کو چھپائے جبہ داماں تو نہیں ہیں

www.taemeernews.com

کیوں شامِ سرِراہ گذر ہنستی ہے ہم پر   واماندہ سہی نقشِ کفِ پا تو نہیں ہیں
بازیچۂ طوفاں کہے کیوں ہم کو زمانہ   دیوانے ہیں گردِ رہِ صحرا تو نہیں ہیں
کیا غضب تھا کہ شب تشنہ لبی بھی اپنی   مدحتِ بادۂ گلفام ہی کرتے گزری

مذکورہ بالا اشعار میں ''الم دیدگاں شہرِ نشانۂ صد تیرِ آسماں، نگاہِ طائرِ معصوم نشستِ غم و آلام، شائستگیِ ذوقِ الم، رسمِ تنک بخشی، توہینِ سرِ تسلیم، شورشِ ہفت اقلیم، نقش گرِ خطرۂ فردا، شامِ سرِراہ گذر، بازیچۂ طوفاں، گردِ رہِ صحرا، دردکردۂ مینا، مدحتِ بادۂ گلفام وغیرہ ترکیبوں کی نادرہ کاری، دل نشینی اور کیفیت دال ہے کہ شاعر کی تخلیقی فعالیت جذب وکیف کی اپنی ایک دنیا آباد کرنے کو ہے۔ یہ ترکیبیں فارمولہ بند نہیں' گھسی پٹی نہیں۔ ندرت نے ان کو پرکشش بنادیا ہے۔ اشعار میں ان سے جان پڑ گئی ہے اور وہ منظوم بیان نہ رہ کر اچھے اشعار کے زمرے میں آ گئے ہیں۔ یہ کیفیت ان کی مٹھی بھر غزلوں میں ہی ملا کرتی ہے۔ تمام شاعری میں ایسی ترکیبوں کا استعمال تواتر سے نہیں ہوا۔ ان تراکیب کا غائر مطالعہ اشعار کے فکری جہان کی خصوصیات کو بھی پیش کرتا ہے۔ ا۔ تراکیب میں الم، نشانہ، تیر، تنک بخشی، توہین، شور، دردکردۂ مینا وغیرہ الفاظ شاعر کی تشنگی اور احساسِ محرومی کا عطیہ ہیں۔ غم والم تو زندگی کا خاصہ ہے۔ شاعری میں اس کا بیان کچھ نئی بات نہیں۔ میؔر کے نالوں کا شور آج بھی ہمیں جگائے رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں قیصر شمیم کے غم کی تخصیص کیا ہے؟ یہ تخصیص شاعر کے اشعار سے واضح ہے۔ قیصؔر شمیم شہر کے ''الم دیدگان'' میں ہیں۔ ان کے دل میں غم و آلام کی ''نشست'' ہے۔ اس کے برخلاف میؔر الم دیدہ نہیں بلکہ الم رسیدہ ہیں۔ میؔر کے یہاں غموں کا ایسا ازدہام ہے کہ وہ غموں کی نشست کی نہیں سوچتے اور اسے اپنا ذوق نہیں بناتے۔ الم کی ا‌بـ‌وں نے میؔر کو نالۂ وشیون پہ آمادہ کیا ہے۔ یہ نالہ وشیون نشتر چبھوتے ہیں۔ زمانے کو رلاتے ہیں۔ دراصل میؔر کے یہاں جذبوں کی ا‌بـ‌وں کا سلسلہ ہے۔ اس سلسلے میں قاری ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے، جب کہ قیصؔر شمیم کے یہاں فکر جذبے میں ڈھلتے ڈھلتے رہ گئی ہے۔ فکر اگر جذبے میں ڈھل جائے تو عرضِ ہنر جنوں کا رقص بن کر سامنے آتا ہے۔ رقصِ جنوں سننے اور دیکھنے والوں کو بھی دیوانہ بنادے تو جنوں نہیں۔ قیصؔر شمیم کے یہاں یہ اندازِ جنوں کم ملتا ہے۔ درستگیِ زبان اور شستگیِ بیان کے حصول کی شدید خواہش نے فکر کو اکثر جذبے میں ڈھلنے سے روکے رکھا ہے۔

شاعری اگر کسی فکر' خیال یا نکتے کا صرف منظوم بیان ہے تو زبان پہ دسترس اور عروضی مہارت ہی شاعری کا جوہرِ خاص ہے۔ لیکن بلندیِ فکر' زباندانی اور عروضی مہارت وغیرہ سروشِ سخن کی ادنیٰ خادم ہیں (اور یقیناً ایسا ہی ہے) تو قیصر شمیم کی شاعری پر ایک بڑا سا سوالیہ نشان نظر آتا ہے۔ واقعہ دراصل یوں ہے کہ ان کے یہاں جذبے کی کمی ہے نہ زبان و بیان کی کمزوری۔ لیکن قیصر شمیم ایک معروف اور معروف استاد بھی ہیں۔ وابستگان کی

www.taemeernews.com

اصلاح کی ذمہ داری انہیں خود پہ ایک نیم تخلیقی ذہنی کیفیت طاری کرنے پر مجبور کرتی ہوگی اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ کوئی جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ حاوی ہے کہ کسی شاگرد کا کم وبیش اسی قبیل کا شعر اصلاح کے لئے آ پہنچا۔ اس شعر کی اصلاح نے شاعر کے اپنے جذبۂ تخلیق کو ماند کر ڈالا۔ اگر وہ جذبہ جس کا شاعر خود اسیر تھا لفظوں میں ڈھلا بھی تو کمزور و ناتواں ہو کر کہ اصلاحِ شعر کے دوران یہ یکسر نہ سہی بہت حد تک خرچ ہو چکا تھا۔ یہ ایک بین حقیقت ہے کہ قیصر شمیم کے یہاں تخلیقی اظہار سے قبل شاعری کے جذبے کے کلی یا جزوی طور پر تسکین پا جانے یا سرد پڑ جانے کے تمام تر امکانات اور لوازمات موجود ہیں۔ کسی کو انکار یا مایوس نہ کرنے کی صوفیانہ روش اور اصلاحِ زبان کے لئے خود شاعر کی تڑپ' یکسوئی کے حصول اور تخلیقی مزاج کی پرورش میں مزاحم ہے۔ تخلیقی یکسوئی اور توجہ کی کمی کے واضح نشانات اس کی شاعری میں در آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ شاعر کو خود اس کا احساس نہ ہو' بلکہ شاگردوں کی لمبی قطار اور مشقت و ریاضت کی طویل مدت کا سرور اسے خود شناسی کی بجائے خود فریبی پہ مجبور کرے اور وہ بہ زبانِ شعر یہ کہے :

نظر جو آئے وہ حرف و نوا کے بندوں میں　　　سخن شناس ہے کتنا یہ پوچھ لوں قیصرؔ

ہمیں سخن شناسی کا دعویٰ نہیں' لیکن مشق و ریاضت کی طوالت معیار کے لئے حجت بھی نہیں۔ ہمیں اسی معیارِ ادب کی جستجو ہے' حق و صداقت کے جرات اظہار کی آرزو ہے۔ یوں بھی شاعرِ موصوف کے جذبے کی واماندگی' توجہ اور یکسوئی کی کمی کب ہماری گفتگو ہے؟ ذرا توجہ سے دیکھیں' تو شاعر کے "حرف و نوا" ہانکے پکارے اس واماندگی کا اعلان کریں گے۔ لیکن شاعر کے جذبے کی واماندگی کی فرد فرد مثالیں اگر پیش بھی کر دی جائیں تو اشعار کے انتخاب کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی۔ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کے کمزور تخلیقی لمحات کا انتخاب کر لیا گیا اور ایسے کمزور لمحات کسی بھی شاعر کے یہاں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ تو کیوں نہ ایک مکمل غزل کا مطالعہ کیا جائے' تاکہ فکر و نظر غزل سے بندھی رہے اور فرد فرد شعر کے انتخاب کا الزام بھی نہ آئے۔ ملاحظہ ہو غزل کا مطلع :

کوئی چہرہ کہیں چمکے تو دیکھوں　　　دھندلکے کا سماں بدلے تو دیکھوں

بحر ہزج مسدس محذوف یعنی مفاعیلن مفاعیلن فعولن کے وزن پر یہ زمین ردیف "تو دیکھوں" کی بنا پر ایک مخصوص کیفیت کی حامل ہے۔ حروفِ قوافی میں صرف حرفِ روی کے اہتمام نے تخلیقی آزادی اور بے پناہ گنجائش فراہم کر دی ہے۔ مضمون کے تعین میں ردیف تو دیکھوں کے ٹکڑے 'تو' نے دیکھنے کے عمل کو مشروط کر دیا ہے۔ اب قوافی چمکنے' بدلنے' چمکے (ایطا سے صرفِ نظر کریں) وغیرہ کے اہتمام کے ساتھ شرط بدنے یا یوں کہیے کہ فکر یا خیال باندھنے کے معیار کا انحصار شاعر کی تخلیقی شمولیت اور عدم شمولیت پر ہوگا۔ اگر یہ شمولیت گہری' صادق اور جانکاہی

www.taemeernews.com

کے ساتھ ہے تو دیکھنے کا عمل بھی غیر موعولی ہوگا اور مسرت و بصیرت کی آنکھوں کو خیرہ کردے گا۔ اگر شاعر کا شعور رچا ہوا نہیں ہے تو فطری طور پر یہ ہوگا کہ حرف شرط کے حوالے سے اس کی علامت 'اگر' از خود در آئے' یعنی اگر بدلے تو دیکھوں بیکے تو دیکھوں اگر چمکے تو دیکھوں وغیرہ۔ یہ 'اگر' غزل کے مختلف شعر میں الگ الگ شکل میں بھی آسکتا ہے مثلاً کسی شعر میں 'بھی چمکے' 'کسی میں کہیں چمکے' 'کوئی چمکے وغیرہ۔ زیر بحث غزل کے آٹھ اشعار میں سے کسی شعر میں علامت شرط 'اگر' اپنی 'اصل شکل میں نہیں آیا اور شاعر زبان کی اس سطحیت سے تو بچ نکلا لیکن اس 'اگر' کی متبادل مگر شکستہ شکل کم و بیش ہر شعر میں آہی گئی۔ مثلاً مطلع کے دوسرے مصرعٔ کوئی چہرہ کہیں چمکے تو دیکھوں میں کوئی اور کہیں کا استعمال ہوا۔ اس مصرعے میں 'کوئی' اور 'کہیں' کا استعمال فقرۂ شرط اور اس کے فاعل چہرہ کے متعلقات محض میں سے ہیں۔ اس سے کوئی معنوی جہت خلق نہیں ہوتی بلکہ '' کہیں '' مکمل طور پر حرف شرط اگر کا متبادل ہے' یعنی مصرعے کو 'کوئی چہرہ اگر چمکے تو دیکھوں' پڑھا جائے تو معنی یا کیفیت میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ ذرا سی توجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مصرعۂ اولیٰ دوسرے مصرعے کی نسبت زیادہ معنی خیز ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مصرعۂ اولیٰ میں ردیف کے علاوہ معنیٰ خلق کرنے والے کم از کم تین الفاظ دھند لکے' سماں اور بدلے استعمال ہوئے۔ جب کہ مصرعۂ ثانی میں صرف دو الفاظ چہرہ اور چمکے استعمال ہو سکے۔ اس غزل کا وزن دراصل تین وتد اور پانچ سبب کی تنگنائی پر مشتمل ہے۔ اب کمال فن یہ ہوگا کہ اس تنگنائی کی خانہ پری کے لئے ایسے الفاظ لائے جائیں کہ معنیٰ خلق کرنے میں بنیادی اہمیت کے حامل ہوں۔ اضافی الفاظ کم سے کم استعمال ہوں۔ زیر نظر غزل میں مطلع کا حال ہم نے دیکھ لیا۔ کوئی اور کہیں کے استعمال نے شعری معنویت کو سکیڑنے پر مجبور کر دیا اور خیر سے اس غزل کے آٹھ اشعار میں کوئی' کہیں' بھی' اور ابھی جیسے الفاظ جو بالواسطہ یا بلا واسطہ حرف شرط 'اگر' کے قائم مقام ہیں' بارہ یا اس سے زیادہ بار آئے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر تخلیقی الفاظ' یعنی وہ الفاظ جو بنیادی اور معنیٰ خلق کرنے والے الفاظ سے متعلق تو ہیں مگر جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں' کی بہتات ہے۔ مثلاً غزل کا دوسرا شعر دیکھئے :

ابھی تو منظروں پر ہے سیاہی افق سے روشنی چھلکے تو دیکھوں

پہلے مصرعے میں منظر اور سیاہی دو کلیدی لفظ آئے۔ بقیہ الفاظ کی حیثیت ان کے سائے کی ہے جب کہ 'تو' خالصتاً حشو ہے اور رکن کی تکمیل کے لئے لایا گیا ہے۔ اس مصرعے کی حیثیت ایک خبر کی ہے کہ ابھی منظر پر سیاہی ہے۔ یہ جملۂ خبریہ اپنے آپ میں اتنا مکمل ہے کہ کسی سوال' کسی استعجاب یا تحیر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے نہ سامع یا قاری کو خیال فکر یا خبر کی ترسیل کے لئے کوئی خاص لفظ اپنی فہم سے شامل کرنا پڑتا ہے' جو شعر کا خاصہ ہے۔ اس لئے یہ خبریہ جملہ غیر شعر ہے۔ لیکن جب شاعر کہتا ہے کہ افق سے روشنی چھلکے تو دیکھوں' تب امید کی ایک قندیل روشن ہو جاتی

www.taemeernews.com

ہے اور سیاہی کو روشنی میں بدلنے کے انتظار کی لذت جذباتی تغیر سے دوچار کرتی ہے۔ اس طرح ایک شعری کیفیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خوبی صرف اس لئے پیدا ہو سکی کہ دوسرے مصرعے میں معنی پیدا کرنے والے الفاظ زیادہ استعمال ہوئے۔ یا یہ کہیے کہ بھرتی کے الفاظ نہیں آئے۔ اب آئیے ذرا اگلے دو اشعار پہ غور کریں :

ہوں اپنی قبر میں یا اپنے گھر میں   کوئی پا ابھرے تو دیکھوں

ہرے پتوں کا موسم ہے تو کیا ہے   کہیں اک پھول بھی مہکے تو دیکھوں

مذکورہ بالا پہلے شعر کے مصرعۂ اول میں معنی خلق کرنے والے صرف دو الفاظ 'قبر' اور 'گھر' آئے ہیں۔ ہر دو لفظ کی توصیف کے لئے 'اپنا' دوبار آیا اور بقیہ وتد اور سبب کی خانہ پری 'ہوں' میں اور 'یا' وغیرہ سے ہو گئی' جب کہ دوسرے مصرعے میں معنی خلق کرنے والے چار الفاظ استعمال ہوئے۔ صرف ایک لفظ 'کوئی' جو اس غزل کی روایت میں شامل ہے' حرفِ تنکیر کے طور پر آیا۔ اس شعر میں کوئی معبود ہی کا اشارہ بھی ہے اس لئے اس کی بھی اپنی حیثیت قائم ہو گئی ہے۔ اس طرح دوسرے مصرعے نے پہلے کمزور اور ناگوار مصرعے کو بھی شعر کا حصہ بنا دیا۔ تاہم فکر و خیال اور جذبے کی سطح بلند نہ ہو سکی۔ مذکورہ بالا دوسرا شعر بھی کسی گہری فکر کا نتیجہ ہونے کی بجائے محض قافیہ مہکے کو نظم کرنے کا حاصل ہے۔ شاعر کا یہ کہنا کہ ہرے پتوں کا موسم ہے تو کیا؟ کہیں پھول نہیں مہکتا [یا نہیں مہک سکتا] لہجے کے اعتبار سے ایک یقین بلکہ چتاونی بن کر سامنے آیا ہے۔ جب کہ اسے کرب کا مظہر ہونا چاہئے تھا۔ اس درد کا شعر میں دور تک کوئی پتہ نہیں۔ ایسی شعری لطافت جذبے کی وابستگی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی' کہ محض قافیہ پیمائی شاعری نہیں۔ آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ کوئی اور کبھی کی گردان غزل کے اولین مصرعے سے شروع ہوئی' اب تک جاری ہے اور اسے مقطع تک جانا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ شاعر ردیف تو دیکھوں کے جبر کا مطیع ہو گیا ہے۔ اس بنا پر کوئی' کہیں' ابھی' کبھی وغیرہ الفاظ' جو حرفِ شرط 'اگر' کے متبادل ہیں' سے نجات حاصل نہیں کر پایا۔ اس جبر اور یکسوئی کی کمی نے فکر کو معمولی' تخیل کو بے پرواز اور جذبے کو واماندہ کر دیا ہے۔ ایسے میں عروضی مہارت' زبان دانی اور روزمرہ کے معاملات غزل کی ہیت میں ڈھل گئے ہیں۔ گذشتہ چار اشعار کی تحلیل آپ نے ملاحظہ کیا' اگلے اشعار کا جائزہ بھی لیتے چلیں :

ابھی ہر شخص لگتا ہے ادھورا   کوئی پورا بشر نکلے تو دیکھوں

پہلے مصرعے میں 'ہر شخص کا ادھورا لگنا' توقع جگا دیتا ہے کہ ابھی کچھ مزید سامنے آنا ہے' جس کو دیکھنے کا انتظار ہے۔ پہلے مصرعے سے ہی پورا بشر دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے۔ دوسرا مصرع اس جذبے کے نکلنے کے طور پر زیرِ لب آتا ہے۔ یہ زیرِ لب کی کیفیت ہی دراصل شاعری کا ایک وصف ہے جو اس شعر میں موجود ہے۔

www.taemeernews.com

اس شعر کے ہر دو مصرعوں کے الفاظ کے دوران صوتی مناسبت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً بھی اور کوئی' ہر اور بشر' ادھورا اور پورا وغیرہ۔ اس صوتی مناسبت نے ایک داخلی خوش آہنگی کو راہ دیا ہے جس کی وجہ سے محسوسات کی سطح پر ایک عمدہ اثر قائم ہوتا ہے۔ فکری اعتبار سے بھی دیکھیں تو خیال جذبے میں ڈھل کر سامنے آیا ہے' اس لئے سننے والوں کو ایک جذباتی تغیر سے دوچار کرتا ہے۔ اس طرح یہ شعر حاصلِ غزل ہوگیا ہے۔ اس شعر میں بھی پچھلے اشعار سے کوئی کی روایت مستعار آئی ہے لیکن یہ شعر میں کھپ گئے ہیں اور تخلیقِ معنی میں معاون ہیں۔ غزل کا چھٹا شعر ہے :

سرِ راہے کسی کو دیکھنا کیا کبھی میرے وہ گھر آئے تو دیکھوں

اس شعر میں بھی کا استعمال کوئی اور کہیں کا ہی متبادل ہے۔ لیکن اس شعر کی لفظیات پر مزید تامل کی ضرورت ہے' کہ قیصر شمیم جیسا شاعر اگر 'سرِ راہے' کا استعمال کرے تو واجب غور و فکر کے بعد ہی کچھ عرض کرنے کی جرأت کرنی چاہئے۔ سرِ راہے کی ترکیب میں دراصل یائے تنکیری کا استعمال ہوا ہے۔ بلاشبہ فارسی زبان میں یائے تنکیری صرف مستعمل نہیں بلکہ یہ حسنِ بیان کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن اردو میں یائے تنکیری کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اردو کے اساتذہ شعرأ سے اس کی مثال لانی مشکل ہے۔ یوں بھی شاعر نے صرف وزن کی خانہ پری کے لئے اس کا سہارا لیا ہے۔ یعنی وزن اور بحر شاعر کے لئے ایک جبر بن گیا ہے۔ سرِ راہے کے استعمال کی وجہ ہرگز ہرگز شاعر کی عدمِ واقفیت نہیں بلکہ ایک نوع کی 'اکتاہٹ' بے توجہی اور سرسری گزر جانے کا عمل ہے۔ اس شعر کا خیال بھی غالب سے ماخوذ ہے۔ وہ بھی بن بلائے معشوق کے یہاں نہیں جاتے۔ سرِ راہ اس سے نہیں ملتے (راہ میں ہم ملیں کہاں)۔ لیکن معشوق کو اپنے گھر آنے اور پھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کرکے بھی شاعر نے عشق کے جذبے (عشق بُر دکشاں کشاں) سے بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ عزتِ نفس عاشق کے سرِ راہ دیکھنے میں مانع ہوسکتی ہے' بلکہ ہونی چاہئے۔ لیکن میرؔ تو معشوق کو دیکھنے کے لئے اس کی دیوار کے سائے تلے بیٹھ رہے تھے۔ معشوق تو گھر آکر اپنا جلوہ دکھانے سے رہا۔ عشق کا یہ انداز تو شاعر کے جذبۂ عشق (شعر گوئی) کو مشکوک کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک معمولی سے شعر کے لئے تین عظیم شاعروں کا حوالہ ہماری غلطی ہو' لیکن اس سے اچھی طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ قیصر شمیم کی شاعری اقبالؔ کی زبان میں عقل کا حیلہ ہے' عشق کا معاملہ نہیں۔ ورنہ وہ غالبؔ کے باندھے ہوئے مضمون پر 'نہ کرتے' مگر اس کی آبرو تو بچالے جاتے۔ غزل کے آخری دو شعر بھی دیکھتے چلیں :

بہت سنبھلی ہوئی رفتار کیوں ہے کہیں اس کا قدم بہکے تو دیکھوں
کہاں میں ہوں کہاں منزل ہے قیصرؔ کوئی بڑھ کر مجھے ٹوکے تو دیکھوں

ان آخری دو شعروں پر کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں' سوائے اس کے کہ 'کہیں' اور 'کوئی' کی گردان اپنے کمال یعنی

www.taemeernews.com

مقطع تک آ پہنچی۔ ممکن ہے کہ شاعری کی سنبھلی ہوئی رفتار پر رشناسی کے قدم بہک گئے ہوں اور شاعری کی منزل پر پہنچنے کے لئے یہ روک ٹوک شاعر کو گراں گزرے۔ لیکن شاعری اگر جادو ہے (اور یقیناً ہے) تو قدر شناسی کے بہکے ہوئے قدموں کو باندھے رکھنا بھی اس کی اہم ذمہ داری ہے۔

لیکن بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعری جادو کب بنتی اور کس طرح بنتی ہے۔ عرض ہے کہ عقلی اور نقلی مضامین خواہ وہ جتنے بلند ہوں شعوری کاوش ہوا کرتے ہیں تخلیقی جانکاہی کا حصہ نہیں۔ عقل کا حیلہ شاعر کا ساتھ دور تک اور دیر تک نہیں دیتا۔ لیکن جب بھی شاعر کسی خیال، فکر یا مضمون میں اس طرح ڈوب جائے کہ وہ جذبہ ایک آنچ بن کر اس کے اندر سلگنے لگے اور یہاں تک کہ وہ آنچ بالآخر لفظوں کا روپ دھارن کر لے تو پھر وہ آواز دل سے نکلی ہوئی آواز ہوگی، پر اثر بھی ہوگی۔ اس آواز میں شاعر کی باطنی شخصیت اور اس کے متعلقات کی شمولیت بھی ہوگی۔ یہی وہ آواز ہے جو شاعری کو اختصاص عطا کرتی ہے اور اگر اختصاص نہ بھی دے تو شاعر کو ایک منفرد لہجہ ضرور دے دیتی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے غالب، مومن اور ذوق ایک ہی عہد اور ایک ہی سرزمین کے شاعر ہیں لیکن تینوں کا اپنا واضح اور الگ رنگ ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاعری ان کے لیے کسی اعزاز کی کلغی نہ تھی، جسے سر پر باندھا اور امتیاز حاصل ہو گیا۔ یہ زبان کی درستگی اور بیان کی صفائی کا معاملہ بھی نہ تھا۔ پھر اسی سرزمین سے جڑے امیر اور داغ بھی تو تھے، جن کی آواز آج بھی منفرد ہے۔ ان سب کی شناخت اپنے لہجے کی بنا پر ہے۔ یہ لہجہ ان کی داخلی شخصیت کا رہین تھا، کہ خارجی عوامل تو کم و بیش ہر ایک کے ایک سے تھے۔ وہی دلی کی گلیاں تھیں، وہی شب و روز تھے۔ لیکن غالب و ذوق اور مومن کی بھی اور امیر و داغ کی بھی آنکھیں الگ تھیں، زاویہ نگاہ الگ تھا، ذہنی و فکری ردعمل الگ تھا۔ ان کا شعور، تحت الشعور اور لاشعور الگ تھا اس لئے ان کی شاعری بھی الگ تھی۔ یہ شاعری ان کی شخصیت کی ترجمان تھی، اپنے علاقے، اپنی سرزمین، اپنے دبستان کی ترجمان تھی۔ امیر و داغ ہی کیوں آج کے کسی ایسے شاعر کو لیجیے جس نے تخلیقی اعتبار حاصل کیا ہے اس کا اپنا لہجہ ضرور ہے۔ قیصر شمیم کی شاعری کے ساتھ بھی اگر ایسا معاملہ ہے تو ان کے لہجے کی انفرادی شناخت کیا ہے؟ کیا ان کی شاعری بنگال کے مزاج کا اظہار ہے؟ کیا ان کی شاعری کا لب و لہجہ ایسا ہے جس کی شناخت محض لہجے کی انفرادیت اور اس کی اثر آفرینی کی بنا پر ہو سکے؟ حق تو یہ ہے کہ صرف قیصر شمیم ہی نہیں بلکہ بنگال کے اکثر (الا ماشاءاللہ) اردو شاعر جو ان کے ہم عصر ہیں نہ تو اپنے خطۂ ارض کے احساسات اور تفکرات کو پیش کر سکے نہ ہی اپنے انفرادی لہجے کی پرورش میں کمال حاصل کر سکے (یہ وصف ان کی بعد کی نسل کے بعض شعراء میں کسی قدر ضرور آیا)۔

تاریخ ادب پر اگر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ صرف قیصر شمیم کا نہیں۔ اکثر شعراء (خواہ

www.taemeernews.com

وہ بنگال کے ہوں یا کسی دیگر ادبی دبستان کے) جنہوں نے اصلاحِ شعر یا اصلاحِ زبان کو مقدم جانا' ان کی ا تخلیقی حیثیت کمزور سی پڑ گئی۔ ایسے شعراٗ اکثر اچھے ناظم ٹھہرے۔ شاعری کی حقیقی روح ان کے کلام منظوم میں نہ ڈھل سکی۔ لفظوں کا اہتمام اور انصرام ان کے یہاں ضرور ہوا' لیکن جذبے کی تقدیس کی فکر ان کے یہاں اہمیت نہ پا سکی۔ قیصر شمیم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ بلکہ ہمیں یہ کہنے کی ا زت دی جائے کہ بعض تاریخی وجوبات کی بنا پر (تفصیل کے لئے دیکھئے بنگال کی ادبی تہذیب) لسانی اعتبار کا حصول بنگال کے شعراٗ کے لاشعور کا حصہ رہا ہے جب کہ تخلیقی اظہار شعور کی سطح پر محض ادنیٰ سا نکتہ۔ تمام تر کاوشیں لسانی مسابقت کے لئے وقف رہیں۔ تخلیقی اظہار اور ادبی معیار کے مسائل یہاں کھل کر موضوع نہ بن سکے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ تمام مسائل کے باوجود زبان کی کمزوریاں بھی ان شاعروں کے یہاں در پیش آتی رہیں کہ اس سے کون شاعر بچ سکا ہے۔ قیصر شمیم کی شاعری بھی اسی ماحول کی پرداختہ ہے۔ زبان کے معاملے میں مسابقت کی شدید خواہش نے اپنی فکر اور جذبے کی پرورش کو ثانوی حیثیت دی ہے۔ قیصر شمیم کے یہاں یہ مسئلہ کچھ سوار رہا' کہ انہوں نے پورے ایک خطے کو زبان سکھانے اور شاعر بنانے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ قیصر شمیم کے یہاں تخلیقی عمل بالکل مفقود ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں کہیں ترکیب سازی کے عمل نے ندرت حاصل کر لی' اور گاہے گاہے فکر کو جذبے کی تپش بھی مل گئی' وہاں ان کے شعری ا زات بھی ابھر کر سامنے آئے۔ تاہم ان کے شاعرانہ ا زات ان کی دُرویش صفتی اور زبان دوستی کی بنا پر کھل کر اپنا جلوہ نہ دکھا سکے۔ ان کا ویژن مخصوص جغرافیائی حدود کے اندر عام لسانی اعتبار کے حصول تک محصور رہا' اور ادب آپ اپنا مقصود نہیں' بلکہ زبان کے معیار کے حصول کا ایک ذریعہ رہ گیا۔ اس لئے تخلیقی جانکاہی ان کا مسئلہ نہ بن سکی۔ اس کیفیت نے تخلیقی جانکاہی کی بجائے سہل نگاری کو ان کے مزاج کا حصہ بنا دیا۔ اس سہل نگاری کی بنا پر گاہے گاہے زباندانی بھی آنکھ مچولی کھیلنے لگی اور وہ تخلیقی اظہار اور لسانی معیار کی کشمکش کے شاعر ہو کر رہ گئے۔

قیصر شمیم کے دو منتخب اشعار

تیرے وحشی کو جنونِ دشت پیمائی نہیں
یوں تو ہے دیوانہ لیکن اب وہ صحرائی نہیں

اب نہیں جاتی کسی کے حسنِ باطن پر نظر
آنکھ والوں پر بھی وہ پہلی سی بینائی نہیں

www.taemeernews.com

کلیم حاذق

ہوڑہ

قیصر شمیم : 'ساعتوں کا سمندر' سے 'سانس کی دھار' تک

میرے نزدیک قیصر شمیم صاحب کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک مدت سے اپنی زنبیلِ سخن پر دیگر مصروفیات کا اتنا سخت پہرہ لگا رکھا ہے کہ اس کے سارے طلسمات ہی پابہ زنجیر ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اس قیدی کی طرح نہیں جو زنداں کی دیواروں سے مانوس ہو کر صدائے زنجیر کی لوریوں سے ہی نیند کی آغوش میں پناہ لینا سیکھ لیتا ہے بلکہ یہ طلسمات ان سرکش قیدیوں کی طرح ہیں جن کی آنکھیں زنداں کی تاریکیوں سے مطابقت نہیں کرتیں بلکہ کھلے آسمان میں آنے اور سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں تاکہ ان کی سحر کاری ان آنکھوں میں بھی سرمے ڈال سکے جنھوں نے نشاط ورنگ کے ذائقے کو نئے معنی پہنائے ہیں۔ تو جناب کبھی کبھی قیصر شمیم صاحب کی گرفت اپنی زنبیل پر کمزور پڑ جاتی ہے اور پھر کچھ نہ کچھ پھوٹ نکلتا ہے' میرا خیال ہے ان کا تازہ ترین مجموعۂ کلام " سانس کی دھار" ان کی زنبیل کی قید سے چھوٹا ہوا طلسمِ سحر خیز ہے جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے جب کہ " ساعتوں کا سمندر" میں نظمیں بھی شامل ہیں۔ چھٹی دہائی میں ان کے گیتوں نے بھی کافی دھوم مچائی تھی۔ فضائے سخن میں جن کی گنگناہٹیں اب بھی سنی جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی بھی بعض طلسمات اس زنبیل میں شعلۂ خاموش بنے بیٹھے ہیں۔

انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی!

ایک ایسا اہم شاعر جو بغیر کسی حوالے سے چھٹی اور ساتویں دہائی میں اپنے مختصر ترین مجموعۂ کلام " ساعتوں کا سمندر" کے ذریعہ اہلِ نظر میں بحث و تجسس کا موضوع بنا رہا اور جو اپنے پہلے مجموعے کی سلور جبلی اپنے دوسرے مجموعے کی ہندی اشاعت سے منائے اور پھر اس کے ایک سال کے بعد مجموعے کی اردو اشاعت سے سلور جبلی تقریب کا اختتام کرے اس وقت یہ فیصلہ کرنا محال ہو جاتا ہے کہ آخر کس کے صبر کا امتحان مقصود ہے؟ ہماری آنکھیں تو ساعتوں کے اس سمندر کا جلال دیکھنے کے لیے بے تاب رہی ہیں جس کی موجوں نے ہمارے جسموں کو نوالہ بنا لیا تھا اور اب اپنے ان جسموں کا حشر دیکھنا چاہتی ہیں کہ ان میں زندگی و توانائی باقی ہے بھی یا نہیں۔ لہٰذا اس

www.taemeernews.com

طویل انتظار کے بعد یہ عرفان و آگہی کم نہیں کہ ان جسموں نے اپنی "سانس کی دھار" سے موجوں کا شکم چاک کر دیا ہے اور شمیم صاحب سمندر کی نئی کہانی لے کر وارد ہو گئے ہیں۔ یہ دو اشعار دیکھیں :

سمندر میں بڑی مچھلی سے بچنا ——— نہ لہروں سے نہ بے لہری سے بچنا

جال پھیلایا گیا تھا جال میں پائی گئی ——— کیا بتائیں زندگی کس حال میں پائی گئی

"ساعتوں کا سمندر" کو اگر ہم مبتدا کہہ سکتے ہیں تو "سانس کی دھار" سے یقیناً خبر کی توقع کی جا سکتی ہے۔ دونوں مجموعے میں بنیادی فرق عمومیت سے تخصیص کی جانب ہے۔ عمومیت اس بیان سے کہ ہم وقت کے شکار رہے ہیں۔ ساعتوں کا سمندر جلال پر تھا کہ ہم شکار ہوئے۔ اگر جلال پر نہ ہوتا تو جسم سلامت رہتے لیکن بعد از شکار کی آگہی یہ ہے کہ لہر، بے لہری، تموج کوئی شئے نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ سمندر کی بڑی مچھلی ہے۔ یہی وہ قطعیت ہے جو عرفان و آگہی کے نئے تجربے سے سرشار کرتی ہے۔ نظر اٹھا کر دیکھیں تو ظاہر ہوگا کہ ہماری زمین پر یہی بڑی مچھلی عہد حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ بن کر سامنے آئی ہے جس سے چھوٹی مچھلیاں خائف ہیں۔ دراصل یہ بڑی مچھلی جبر و استحصال کا نیا استعارہ ہے جو Globalisation کے تصور سے عبارت ہے جس کے حصول کے لیے ثقافت کے جال بچھائے جا رہے ہیں اور اعلیٰ اقدار کو چارے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے جن پر چھوٹی مچھلیاں ٹوٹ پڑتی ہیں :

نرم رکھو گے طبیعت تو سزا پاؤ گے ——— دوب ہو جیسی بھی پامال ہوا کرتی ہے

خلوص رکھتے ہیں میرے مشیر میرے ساتھ ——— مرے خلاف ہی دیتے ہیں مشورے مجھ کو

اس بڑی سی دنیا میں قیصر شمیم صاحب کی ایک اپنی چھوٹی سی دنیا ہے۔ اس کے مسائل اپنے ہیں۔ اپنی نگاہ اور اپنی بصیرت ہے۔ وہ اپنی نسل کو دھند میں گرفتار ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے ساری پناہوں کا بھرم کھل گیا ہے جھلسی ہوئی شاخ، سہمے ہوئے پرندے، خوف کہ رشتوں کے انہدام پر شہر آئندہ کی تعمیر جس میں ایک گھر اور گھر میں قبر کی سی تنہائی کا گمان جہاں صرف آواز پا کا انتظار! یہ تصویریں ذیل کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیں :

ہوں اپنی قبر میں یا اپنے گھر میں ——— کوئی آواز پا ابھرے تو دیکھوں

چھوٹا سا گھر اور بڑی سی تنہائی ——— یہ میری دنیا ہے بابا تیرا کیا

خانہ روشنی جو نسل تھی ——— وہ بھی اپنی دھند میں یکتا ہوئی

ایک پنجرہ اداس تنہائی! ——— اس نے کیا کیا خدا سے مانگا تھا

کھل گیا ساری پناہوں کا بھرم ——— اب کہاں رین بسیرا ہوگا

www.taemeernews.com

یہ وہی لمحات ہیں جہاں انسان کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور سچی قیادت کی احتیاج شدت کے ساتھ سر اٹھاتی ہے۔ کہیں کوئی شئے بکھرتی ہوئی اور اس کے بکھراؤ سے کچھ بھی بنتا ہوا نظر نہ آئے تو ایک Transitional صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہمارا آج کا معاشرہ نبرد آزما ہے' یہ ہمارے عہد کا المیہ ہے کہ اس عبوری دور کی مدت چند سالوں پر نہیں' چند دہائیوں پر بھی نہیں بلکہ کم و بیش ڈیڑھ صدی پر محیط ہے اور نئی صدی کے سمندر نے اپنا دہانہ کھول رکھا ہے۔ اسی عبوری دور کی پیداوار غالب بھی ہیں اور اقبال بھی، فیض بھی ہیں اور میراجی و راشد بھی، ابراہیم ہوش، شہریار، ندا فاضلی، مظفر حنفی اور مظہر امام بھی، اعزاز افضل، علقمہ شبلی اور قیصر شمیم بھی! مختلف میزانوں پر رکھے گئے ان فن کاروں میں ایک قدر مشترک ہے کہ سبھی اپنے اردگرد کی ٹوٹتی پھوٹتی زندگی کے درمیان ماحول کے جبر اور تہذیبی ناشناسی کے شکار اپنی شناخت اور اپنی جڑوں کی تلاش میں مختلف راہوں پر نکل پڑے تاکہ اس انسان کا دکھ درد کم ہو سکے جو ہماری زمین پر تنہا ہو گیا ہے لہٰذا سبھوں نے ہمارے سامنے مختلف دنیاؤں کو پیش کیا' مختلف ابعادوں سے گزارا دیا ہے۔ کیا ہماری نظریں کسی اور انتہا کی متلاشی ہیں؟

ایسے لمحات میں سانس کی دھارا اگر ہمارے نفس کی آواز سے ہم آہنگ ہو سکے اور ہم اپنی ڈیڑھ صدی کے تخلیقی سرمائے کو Decoustrnet کر سکیں جسے نہ میں ردِ تشکیل کہتا ہوں نہ لاتشکیل بلکہ شیرازہ بندی پر محمول کرتا ہوں تو یقیناً اس Dilemma سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکیں گے کہ ہماری ثقافت کی زمین میں خوابیدہ تخمِ معنی ہماری ترجیحات کی منتظر ہیں۔ پھر قیصر شمیم صاحب کی طرح ہمیں شاید یہ کہنے کی ضرورت باقی نہ رہے کہ :

ریت پر بنتے بگڑتے کچھ نقوش لیجیے آپ کی ہوئی

اردو کے کلاسیکی شعرا ہوں یا ہم عصر شاعری کے سربرآوردہ میدان' غزل کی زبان اور اس کے اسلوب کی بابت ان کے یہاں ایک ہی اصول کارفرما نظر آتا ہے کہ غزل رمزیت اور اشاریت کی زبان میں بات کرنا سکھاتی ہے جس کے ذریعہ معمولی سے معمولی تجربہ بھی غزل کے شعر میں ڈھل کر غیر معمولی اور پہلودار بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے شاعر کو نہ صرف اپنی زبان کے نئے ذائقوں اور غزل کے فن پر مکمل دسترس نہ سہی' اتنی دسترس تو ضرور ہونی چاہیے کہ وہ شعر کی آبرو بچا سکے۔ قیصر شمیم صاحب جیسی شخصیت تو ہماری زبان کی آرزو کہلانے کی مستحق ہے۔ زبان کی سطح پر ان کی جیسی خدمات والے اشخاص ہندستان بھر میں انگلیوں پر ہی گنے جا سکیں گے جنھوں نے آزادی کے بعد تقسیم سے متاثر ہونے والے علاقوں میں اسی طرح کی خدمات انجام دیں جیسی خدمات باز آباد کاری کے لیے دی جاسکتی ہے۔ آزادی کے بعد کی صورتِ حال بقول علامہ جمیل مظہری کچھ اس طرح تھی :

" کلکتے کی ادبی و تہذیبی بساط الٹ چکی تھی۔ کلکتہ کی ادبی اور علمی

www.taemeernews.com

زندگی جن سے عبارت تھی وہ ایک ایک کر کے بکھر چکے تھے' کسی کو جناح صاحب نے پاکستان اور کسی کو خدا نے اپنے جوار رحمت میں بلا لیا تھا۔ وحشت و ناطق کی ادبی مسندیں سونی ہو چکی تھیں۔ آغا حشر اور نواب نصیر الدین خیال کے علمی اور فکری ادارے ان کی موت کے ساتھ بند ہو چکے تھے۔ مولانا آزاد کا علمی سرچشمہ بھی دہلی منتقل ہو چکا تھا' شفاء الملک حکیم صادق صاحب کا مطب جو گہوارۂ ادب تھا اجڑ چکا تھا۔ ہند اور عصر جدید کے دفاتر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا شائق عثمانی کے دہلی اور کراچی چلے جانے کے بعد علمی اور ادبی حیثیت سے ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ استاذی وحشت کے تمام ممتاز شاگرد آصف، واصف اور قمر بھی کلکتہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔"

(ماخوذ از دیباچہ" کلکتہ ایک رباب")

حالاں کہ اس اقتباس کا محل یہاں نہیں تھا لیکن کچھ تصویریں جو دھندلی ہوتی جا رہی ہیں انھیں منور کیے بغیر علمی و ادبی شخصیات کی خدمات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یہ صورتِ حال ایسی تھی جیسے کسی ایم۔اے۔ کے فارغ طالب علم کا اردو کا آموختہ پڑھنا، لہٰذا ہمارے اردگرد جو گوشہ نشیں چہرے ہیں ان کے شانوں پر نئے قصرِ اردو کی تعمیر کے لیے اٹھائی گئی صعوبتوں کے نشان باقی ہیں۔۔ قیصر شمیم صاحب نے بھی اپنا کردار بخوبی نبھایا ہے :

ہوا تھی تیز تو فانوس میرے ہاتھوں کا   تمھاری شمع کی لو کو سنبھالتا ہی رہا

ظاہر ہے جس شخص نے اپنی زبان کے لیے صعوبتیں اٹھائیں ہیں' اس پر دسترس رکھنا ہی اس کا حق ہے لہٰذا اس دسترس اور رموزِ شعر سے آشنائی نے ان کی غزلوں کو تہہ داری عطا کی ہے۔ ان کے یہاں ایسے کئی پہلو دار شعر یقیناً مل جائیں گے جن کا بغور مطالعہ ہمیں نئی لذتوں سے روشناس کر سکتا ہے۔ فی الحال ان کی ایک غزل میرے سامنے ہے۔ اس انتخاب میں کسی تخصیص کا دخل نہیں۔ غزل یوں شروع ہوتی ہے۔

ابلتے پانیوں میں ہوں کہاں ابال کی طرح   میں آج بھی ہوں تہہ نشیں گذشتہ سال کی طرح

وزن : مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن بحر : ہزج مقبوض مفرد مثمن

پہلے مصرعے کے متن کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) ابلتے پانیوں میں ہوں' کہاں ابال کی طرح (۲) ابلتے پانیوں میں ہوں کہاں' ابال کی طرح، دوسرا مصرعہ دونوں ہی صورتوں میں مربوط ہے لہٰذا معنی کی بھی چند صورتیں ممکن ہیں۔

۱۔ امرِ اثبات کہ ابلتے پانیوں میں (تو ضرور) ہوں (لیکن) ابال کی طرح کہاں کہنے سے ایک طرح کا تجسس پیدا ہوتا

www.taemeernews.com

ہے کہ کسی ابلتی شے میں کوئی چیز رہے اور ابال کا حصہ نہ بنے تو یہ عجیب و غریب صورت حال ہے۔ دوسرا مصرعہ دلیل ہوتے ہوئے بھی دعویٰ بن جاتا ہے کہ "میں آج بھی گذشتہ سال کی طرح تہہ نشیں ہوں" لہٰذا اس سوال کا پیدا ہونا فطری ہے کہ آخر یہ 'میں' کتنا طاقتور ہے۔ امر واقعہ ہے وہی اشیاء ابال کا حصہ بنتی ہیں جو بلا تفریق ہیئت اپنی کیت کے لحاظ سے کم وزن ہوں۔ ریت کے ذرات یہاں تک کہ لکڑی کے ٹکڑے جو حرارت کے غیر موصل ذرائع ہیں، وہ بھی ابال کا حصہ بن جاتے ہیں لہٰذا یہ 'میں' وزن دار ہونے کے سبب اپنی بے پناہ قوت مزاحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تہہ نشیں رہنے میں کامیاب رہا۔ گویا قوتِ برداشت اور قوتِ مزاحمت کی تکمیل اور مسلسل آزمائش سے سرخروئی کے ساتھ گزرنا ممکن ہے۔

شعر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ابال ایک دائرہ بناتا ہے جو ابال کے مقام سے سطح تک باعمل رہتا ہے۔ اس طرح ایک الگ مستقر قائم ہو جاتا ہے۔ یہاں صورت نفی کی ہے۔ لہٰذا شاعر کا خیال یہ ہے کہ "جو مجھے ابال کے حیطۂ عمل میں تلاش کر رہے ہیں وہ مقام میرا نہیں۔ میرا مقام تو گزرے سال کے مقام کی طرح ہے جو اپنی ہنگامہ آرائیوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی تہہ نشیں ہو جاتا ہے۔ بعینہ میں آج بھی اسی طرح تہہ نشیں ہوں۔ یہاں لفظ آج نے سال گزشتہ کی ہنگامہ خیزیوں کو بھی دھندلا دیا ہے کہ اس کے ساتھ بھی تغیر کا عمل رہا ہے کہ موجود سے غائب کے صیغے میں چلا گیا۔ شعر کا تیسرا پہلو سوالات سے اجاگر ہوتا ہے۔ میں ابلتے پانیوں میں ابال کی طرح کہاں ہوں؟ اگر واقعی پانی ابل رہا ہے اور میں ابلتے پانیوں میں ہوں تو مجھے بھی ابال کی طرح ہونا چاہیے تھا لیکن میں تو گزشتہ سال کی طرح تہہ نشیں ہوں اس کا مطلب 'یہ ابال ہی نہیں' یہ فیض رسانی اور گرم جوشی نہیں ورنہ میں تہہ نشیں کیوں رہتا۔ اس تہہ داری میں ابہام کا عمل دخل تو نظر نہیں آتا! دوسرا شعر :

دلوں میں سب کے چبھ رہی ہے اک سوال کی طرح　　　تری نگاہِ یاس بھی ہے میرے حال کی طرح

بظاہر پہلے مصرعے میں چبھ رہی ہے اور دوسرے مصرعے میں نگاہِ یاس کی موجودگی سے تعقید کا گمان ہوتا ہے لیکن یہی صنعت اس شعر کا حسن ہے جس نے دوسرے مصرعے کے قافیے کو بچا لیا ہے اور لطف بھی دوبالا ہو گیا ہے۔ زبان کا شعر ہے لیکن مضمون روایتی ہے۔ تیسرا شعر :

نہ پوچھ مجھ سے حالِ دل کہ ان دنوں زندگی　　　کسی عروج دیدہ کی شب زوال کی طرح

اس شعر کی نثر آسان ہے۔ " مجھ سے حالِ دل نہ پوچھ کہ ان دنوں زندگی کسی عروج دیدہ کی شب زوال کی طرح ہے" شعر کی نثر کرنے میں کسی فاضل لفظ کا سہارا نہیں لینا پڑا۔ شعر میں کیفیت ہی کیفیت ہے شب زوال کے کرب کا تصور کتنا ہولناک ہوتا ہے۔ اس کا احساس کوئی عروج دیدہ زندگی ہی کر سکتی ہے۔ دوسری طرف " حالِ دل نہ پوچھ" کہہ کر پوری کہانی بیان کر دی ہے اور اس اجتماعی دکھ کو ظاہر کر دیا ہے جو زندگی کا مقدر ہے جس میں فن کار کی

www.taemeernews.com

اپنی زندگی بھی شامل ہے۔ عروج دیدہ کی شب زوال پُرشکوہ ترکیب ہے اور کلاسک کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ چوتھا شعر:

وہ ایک یاد ہے جو ابھی ہے داغِ دل بنی ہوئی — پھسل نہ جائے ذہن سے کسی خیال کی طرح

یاد اور داغ دونوں کا تعلق مٹنے سے قائم کیا جاسکتا ہے' یاد کا پھسلنا بات سمجھ میں آتی ہے لیکن دل کے داغ کا پھسلنا قولِ محال نظر آتا ہے ہر چند شعر میں اس فعل کا تعلق براہِ راست خیال اور یاد سے ہی ہے لیکن رعایت ہے۔ تاہم شعر میں کلیدی نکتہ کہیں اور پوشیدہ ہے۔ یہاں یاد کو داغِ دل کا مرتبہ حاصل نہیں بھی ہوسکتا ہے کہ ...بن ہوئی ہے یعنی اس میں بناوٹ کا عنصر ہے۔ لہٰذا پھسلنے کا احتمال تو پیدا ہو ہی سکتا ہے لیکن ایسی بناوٹی یاد کے پھسلنے کے خیال سے بھی شاعر لرزیدہ ہے۔ اس بات سے اس کے کمالِ فن اور شخصی مزاج دونوں ہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مقطع نے تیسرے شعر کے معنی کو روشن کردیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

نہ پوچھ قیصرِ حزیں عجیب سی وہ چیز ہے — بچھی ہوئی ہے شہر میں جو ایک جال کی طرح

(اے) قیصرِ حزیں نہ پوچھ وہ چیز (کتنی) عجیب سی ہے جو شہر میں ایک جال کی طرح بچھی ہوئی ہے۔

یہ شعر بھی پہلودار اور معنوی لطافت سے لبریز ہے۔ شعر میں تخلص کو اگر لغوی معنی میں شامل رکھا جائے تو قیصر اور جال کی رعایت سے وہ عجیب چیز اور پراسرار بن جاتی ہے کہ بادشاہ کے لیے ہی جال بچھائے جاتے ہیں اور اب وہ عجیب سی چیز مخالف بن کر ابھری ہے یا محافظ اس ادھیڑ بن میں تو بادشاہ کو ہی رہنا ہے۔

شعر کا دوسرا پہلو لفظِ حزیں سے روشن ہوتا ہے جو ایک غم انگیز صورتِ حال سے آشنا کرتا ہے۔ یہاں وہ عجیب سی چیز شہروں میں جال کی طرح بچھی ہوئی بستیوں کی علامت بھی ہوسکتی ہے۔ پوری غزل میں دو طرح کی جھنجھٹ ہے۔ اول افعال سے ندرتِ ادا کا کام لینا اور دوم تذکیر پر تانیث کا احتمال د۔ ، انداز بیان میں روایت کا عنصر زیادہ ہے۔ الفاظ مانوس' فارسی تراکیب سے زیادہ اردو تراکیب کا استعمال علاوہ چند استثنیٰ کے جو الفاظ ہماری زبان میں رچ بس کر اسی کا حصہ بن گئے ہیں۔

قیصر شمیم صاحب نے "سانس کی دھار" میں اپنے تخلیقی سفر کے مختلف پڑاؤ کو غزل کے آئینہ خانہ میں سجا دیا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی وہ غزلیں بھی ہیں جن کا تعلق اس سفر کے ابتدائی مراحل سے ہے اور وہ غزلیں بھی ہیں جو مختلف ادبی رویوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اس میں ان کے تجربات بھی ہیں اور حیات و کائنات کے معاملات بھی جو کسی تکیلی شعاع کی طرح ان کی ذات کے شفاف واسطے سے گزرتے رہتے ہیں اور مختلف رنگ بکھیر جاتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا مطالعہ غم کے حوالے سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک قلندرانہ شان پیدا ہوگئی ہے جو کبھی کبھی استفسار بھی کرتی ہے۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر معصوم شرقی
کلکتہ

قیصر شمیم : ''ساعتوں کا سمندر'' سے آگے

غزل ہر عہد میں مقبول ترین صنف رہی ہے۔ لیکن بیسویں صدی تک آتے آتے اس نے اپنی کینچلی اتار پھینکی اور ۱۹۴۷ء سے پہلے کی غزل سے خاص مختلف نظر آنے لگی۔ وہ مختلف رجحانات اور تحاریک سے گزرتی ہوئی ایک ایسے مقامات پر آگئی جہاں سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی اثرات کے نقوش صاف نظر آنے لگے۔ تقسیم ہند کے بعد غزل کی تخلیقی ارتقاء میں ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال اور جدیدیت کے نئے تجربات نے غزل کے دامن کو وسعت عطا کی اور نئی جہت سے آشنا کیا۔

بنگال کے شعری منظر نامہ میں جدید غزل کے مزاج کی تشکیل کرنے والے ترقی پسند شعرا کی فہرست پر نظر پڑتے ہی قیصر شمیم پر نگاہیں مرکوز ہو جاتی ہیں۔ غزل کو نئی جہت، معنویت اور جدیدیت سے ہمکنار کرنے والے شعرا میں قیصر شمیم کا نام حرفِ معتبر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے روایت سے روشنی حاصل کی ہے لیکن ان کے احساس اور اظہار میں نیا پن ہے۔ ان کے اشعار کے استعاروں، پیکروں اور لہجے پر غور کیجیے تو ان میں آپ کو ندرت اور تازگی ملے گی :

مضموں ہے نئے عہد کا تفسیر نئی ہے — پڑھ غور سے، دیوار پہ تحریر نئی ہے
میری عمر رواں کا حاصل آگ ہے میرے سینے کی — دیکھ! مرے احساس کا دامن ساعت ساعت جلتا ہے
مجھے سکھایا جو ہیرے تراشنے کا ہنر — تو فرضِ سنگ تراشی بھی میرے سر ڈالا
مہر و مہ کی قتل گہہ میں تیرگی کو — اکرام دینا کام ان کا
چلوں زمانے کے ہم راہ کس طرح قیصرؔ — ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر ساتھ

شاعری میں لہجے کی دریافت کا عمل مشکل ترین عمل ہے۔ قیصرؔ شمیم اس عمل کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ آج انھوں نے اپنا لہجہ پالیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لہجے کی انفرادیت انھیں اپنے ہم عصر شعرا میں ایک مخصوص مقام عطا کرتی ہے۔ ان کی مقبولیت کا ضامن ان کے الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کے خاص ترتیب و ترکیب، سادگی،

www.taemeernews.com

زبان کی فصاحت اور تاثیر کا حسین امتزاج ہے۔ ذیل کے اشعار میں یہ سارے تلازمے مختلف اور منفرد ہیں :

جیسا بھی ہے' اس میں نقلی پن تو نہیں ۔۔۔ میرا چہرا ہے کیا
بچتے رہیے گا قیصر سے ۔۔۔ تیزاب تیغ ہے اس کی
ایک سماں ہے دل کے اندر جیسے کہ جلتے جنگل کا ۔۔۔ آنکھیں بند کیے میں دیکھوں کب تک اپنے گھر کا رنگ
ابھی تو کاٹ رہی ہے ہر ایک سانس کی دھار ۔۔۔ اجل جب آئے تو دیکھوں کہ انتہا کیا ہے
کیا کروں احساس کے ہاتھوں بہت مجبور ہوں ۔۔۔ میں بھی چپ ہو جاؤں گا' پتھر بنا تو دے مجھے
دوب ہو جیسی بھی' پامال ہوا کرتی ہے ۔۔۔ نرم رکھو گے طبیعت تو سزا پاؤ گے

نئی عصری حسیت نے قیصر شمیم کے ذہن و شعور کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ انھوں نے آفاقی سیاق و سباق میں غزل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے :

شہر کی ریت نہ سمجھو گے تو پچھتاؤ گے ۔۔۔ اپنے خوابوں کی طرح ٹوٹ کے رہ جاؤ گے
کوئی اتارنے بیٹھے تو ہاتھ جل جائے ۔۔۔ کھنچی ہے اب کے وہ تصویر زہر آنکھوں میں
پھول' شجر' انسان' سبھی کے چہرے ہم نے دیکھ لیے ۔۔۔ سامنے آئیں جو تصویریں سب میں نکلا کچا رنگ
ابھی شخص لگتا ہے ۔۔۔ کوئی پورا بشر نکلے تو دیکھوں
مشرق و مغرب ایک ہی دل کے گوشے تھے ۔۔۔ بوالہوسی میں یہ دنیا تقسیم ہوئی
دائرہ تقسیم ہوئی ہے ۔۔۔ ہم نہ ہوں ایک تو پھر ایک جہاں کیوں کر ہو

مذکورہ بالا اشعار میں احساسِ عصر بھی ہے اور شعورِ ذات بھی۔ شاعر زمانے کے حالات سے باخبر اور ماحول کی حقیقتوں سے آگاہ بھی ہے۔ وہ ان کیفیات کو شدت سے محسوس کرتا ہے جو اس پر گردو پیش کے مشاہدات سے طاری ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ زندگی کی صداقتوں پر نہایت سنجیدگی سے غور کرتا ہے :

یوں جلوں میں کہ نہ شرمندہ رہوں سورج سے ۔۔۔ کچھ اور' مجھے سوختہ جانی دے
کہاں ہے نیند کہ ہم خواب دیکھیں امرت کا ۔۔۔ جو شام گزری ہے' اس کا ہے زہر آنکھوں میں
ہر رُخ سے اک چراغ ہے برسوں سے آج تک ۔۔۔ دل ہے کہ داغ داغ ہے برسوں سے آج تک
سرمایۂ حیات ہمارا بھی تو ہے ۔۔۔ میراث میں یہ کثرتِ آلام کون لے
کیا بتائیں زندگی کس حال میں پائی گئی ۔۔۔ جال پھیلایا گیا تھا' جال میں پائی گئی
اک رہ گذر شعلۂ جوالہ ملی ہے ۔۔۔ جو زیست ملی ہے مجھے قتالہ ملی ہے

www.taemeernews.com

قیصر شمیم نے اپنے گردوپیش کے حالات و واقعات کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ وہ ایک نابغہ شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت کا اہم عنصر ان کی سادگی، خلوص اور صداقت ہے۔ تصنع سے انھیں سخت نفرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صداقت کی جلوہ گری ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کا شعری اظہار سادگی و پرکاری کا سنگم ہے چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

برا کسی کا میں چاہوں یہ میرا شیوہ نہیں — جو چاہیں کر لیں مرے حرف گیر میرے ساتھ
تم پرکھنا تو بتا بھی دینا — میں برا ہوں کہ بھلا ہوں بابا
ہمارے شہر کا مشکل کشا تھا وہ لیکن — بلا سمجھ کے ہمیں سر سے ٹالتا ہی رہا
کوئی ہم خیال قیصرؔ ہو مری طرح تو سیکھے — رہ خاص بھول جانا، رہ عام یاد رکھنا
اپنی آنکھوں میں ذرا ہر ہاتھ کی پہچان رکھ — گھر جلانے والے ہاتھوں کے لیے مشعل نہ بن

قیصر شمیم کی شاعری نئی اردو غزل کے صحت مند پہلوؤں کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی شاعری مقصدیت کی آئینہ دار ہے۔ ان کے اشعار میں تجربات کی سچی عکاسی اور مشاہدات کی ہنرمندانہ بازگشت محسوس ہوتی ہے۔ وہ آداب فکر اور طرز بیان کے تقاضوں سے بہرہ ور ہیں۔ ان کی غزلوں میں موزوں محاکات (Image) اور خوبصورت علامتیں ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں :

نہ لہروں سے نہ بے لہری سے بچنا — سمندر میں بڑی مچھلی سے بچنا
نظر ہر سمت رکھنا تیرنے میں — نئے موسم کے جل کھمی سے بچنا
اترنا ناؤ سے اپنی سنبھل کر — کنارے کی ہر اک جھاڑی سے بچنا
کیا کریں گی پھر مہاجر چیونٹیاں — آگ کی آندھی اگر برپا ہوئی
دھول، دھواں، مرغولے بن کر ناچ رہی ہیں کچھ آنکھیں — ان آنکھوں کا بھید تو سمجھو، کس کو خبر ہے، کل کیا ہو

قیصر شمیم استعاروں کے برتنے میں بڑی سنجیدگی سے کام لیتے ہیں۔ وہ دلکش استعاروں سے اپنی غزلوں کو سنوارتے ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار میں زندگی کے گہرے تجربے ملتے ہیں۔ دیکھیے ان اشعار کی تہہ میں کتنی سچائی، گہرائی اور زندگی کے نشیب و فراز کا کتنا سچا تجربہ ہے :

ساز سے میرے غلط نغموں کی امید نہ کر — آگ ہی آگ ہے دل میں تو دھواں کیوں کر ہو
وہ جو سب کا بہت چہیتا تھا — کرب کی ساعتوں میں تنہا تھا
مرے ساتھ دفن کیوں ہو مرے غم کی وضع داری — مرا ضبط یاد رکھنا، مرا نام یاد رکھنا

www.taemeernews.com

مری صداؤں کی پلکیں بھی بھیگ جاتی ہے — نہ جانے کون مرے دل میں چھپ کے روتا ہے

میرے آنسو آنسو کب ہیں حرف د ... — جو کچھ لب پر آنہیں سکتا' آنکھوں ہی سے نکلتا ہے

سروں کے ازدحام میں ہے فکر انہیں کلاہ کی — یہ سر کٹا تو کیا ہوا' وہ سر کٹا تو کیا ہوا

قیصر شمیم اپنی شاعری کے بارے میں خود کہتے ہیں

''میرے نزدیک شاعری ساعتوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے'

ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کے عمل سے ملتا جلتا عمل ہے لیکن بخت ترحت لطیف۔''

قیصر شمیم نے اپنی نظموں کو اپنی ذہانت اور تخلیقی اپج سے ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔ ان کی نظمیں ایک علاحدہ مضمون کی متقاضی ہیں۔ میں نے اس مضمون میں '' سانس کی دھار'' کو پیشِ نظر رکھ کر ان کی صرف غزلیہ شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ جدید دور کے شعری آہنگ کی تشکیل کرنے والے شعرا میں قیصر شمیم کا نام خاصا اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے تخلیقی عمل کا سلسلہ جاری ہے۔

غــزل

قیصر شمیم

دل کے اندر جو کچھ بھی ہے' لفظوں میں کب ڈھلتا ہے
درد لبوں تک آتے آتے ' اپنی شکل بدلتا ہے

میری عمرِ رواں کا حاصل' آگ ہے میرے سینے کی
دیکھ! مرے احساس کا دامن ساعت ساعت جلتا ہے

یاد سے تیری پوچھ رہا ہے شیدائی تنہائی میں
درد نہیں جب کوئی کھلونا' دل کیوں اس سے بہلتا ہے

جلتے ہوئے دل کی آہیں بھی ٹکرا کے رہ جاتی ہیں
پتھر تو پتھر ہے آخر' جلتا ہے نہ پگھلتا ہے

www.taemeernews.com

عادل حیات

دہلی

قیصر شمیم کی غزلوں میں پیکر تراشی

استاد شعراء کی صف میں جن چند ناموں کا ذکر آتا ہے ان میں قیصر شمیم کا نام بھی اہم ہے۔ انھوں نے نہ صرف شعرائے بنگال کی سرپرستی کی ہے بلکہ ہندو پاک کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ان کے تلامذہ کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی، لیکن انھوں نے اپنی شاعری میں ترقی پسند نظریے کی تشہیر نہیں کی بلکہ کچھ اثر قبول بھی کیا ہے تو اس کے لیے لکشمن ریکھا پہلے ہی کھینچ دی ہے۔ قیصر شمیم نے جدیدیت کا دور بھی دیکھا ہے مگر انھوں نے اس کے رجحان سے بھی انحراف کا رویہ ہی اپنایا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قیصر شمیم کی شاعری کسی بھی بندھے ٹکے نظریے کی پابند نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری کھلی فضا میں آزادانہ سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جس میں ان کی ذات، حیات، معاشرہ اور کائنات کی آہٹ شدت کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔ ''سانس کی دھار'' کے دیباچے میں خود قیصر شمیم رقمطراز ہیں :

> ''مجھے اعتراف ہے کہ میری شاعری نہ میری ذات سے کبھی جدا رہی ہے، نہ میری حیات سے، نہ معاشرے سے، نہ کائنات سے۔ گذشتہ چالیس پینتالیس سال کے دوران... قدم قدم پر میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے، اسے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے۔''

اس اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے مروّجہ اصولوں سے قطع نظر اپنے حواس پر زیادہ بھروسہ کیا ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں میں استادانہ فنکاری کے ساتھ ساتھ پیکریت کے عناصر کی ملی جلی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔

پیکریت تحت الشعور میں بسی ہوئی وہ ذہنی تصویریں ہیں جو نسل درنسل لوگوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں اور جب کبھی ان کا انسلاک زمانہ حال میں کسی نئے خیال یا احساس سے ہوتا ہے تو دونوں آپس میں گڈمڈ ہو کر ایک نئی تصویر کو انسان کے ذہن پر منعکس کرتی ہیں، جیسے ایک حساس شاعر و ادیب لفظوں کا جامہ پہنا کر زندہ وجاوید کر دیتا ہے، جسے ہم لفظی پیکر کہتے ہیں۔ پر وہ ذہن پر بننے والے لفظی پیکر نفسیاتی بھی ہوتے ہیں اور لسانی بھی۔ جب انسان

www.taemeernews.com

کے حواسِ خمسہ متاثر ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کوئی امیج یا عکس ذہن کے پردے پر بنتا ہے تو اسے ہم نفسیاتی پیکر کہتے ہیں۔ چونکہ حواسِ خمسہ کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اس لیے اس کے ذریعے بننے والے پیکر بھی الگ الگ طرح کے ہوتے ہیں۔ یعنی جو پیکر انسان کے جس حسی قوت کے ذریعے ذہن میں ابھرتا ہے، وہ اسی کے نام سے منسوب ہو جاتا ہے اور جب تشبیہات واستعارات، علامات وتلمیحات کے ذریعے کوئی پیکر تشکیل پاتا ہے تو ہم اسے لسانی پیکر کا نام دیتے ہیں۔ اس کی بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر وادیب بعض مخصوص الفاظ یا خیال کو دہرا کر بھی اپنے اشعار میں پیکر تراشی کے جوہر دکھاتا ہے۔ جسے اسی لفظ یا خیال سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پیکر تراشی کی بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں، جن کا احاطہ ایک چھوٹے سے مضمون میں کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ جہاں تک پیکر تراشی کی اہمیت کا سوال ہے تو ہم ازرا پاؤنڈ کے اس نظریے سے استفادہ کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں:

> ''ضخیم ضخیم کتابوں کی تصنیف کے مقابلے میں ساری زندگی صرف ایک پیکر کی تخلیق اہم کام ہے۔''

اس اقتباس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پیکر تراشی کے کرتب دکھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے ریاضت ہی نہیں فن کے تمام تر امور پر دسترس ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شعراء کے یہاں متعدد شعری مجموعوں کے ہوتے ہوئے بھی اشعار میں پیکر تراشی کا عمل دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اردو کی شعری روایت میں غیر شعوری طور پر ہی سہی، قدیم شعراء اور اساتذہ کی غزلوں میں پیکر تراشی کے نمونے مل جاتے ہیں، جن سے ہمیں طمانیت کا احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ ہم ان سے روشنی بھی حاصل کرتے ہیں۔ میر وغالب سے لے کر اب تک کے شعراء کے کلام میں پیکر تراشی کے نمونے کم وبیش دیکھنے کو مل جائیں گے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیکر تراشی ایک ایسی شاعرانہ خوبی ہے جو تمام شعرا وادبا کے یہاں دیکھنے کو ملی ہے۔ چنانچہ قیصر شمیم جو ایک استاد اور نئی زندگی کے رمز شناس شاعر ہیں ان کے یہاں یہ وصف کیسے نہیں ملے گا۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ان کی بیشتر غزلوں میں پیکر تراشی کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کے یہاں بعض غزلیں تو ایسی ہیں جن کے تمام اشعار بصری، سماعی اور حرکی پیکر پر مشتمل ہیں، جو ان کے تجربات ومشاہدات کو اس طرح واشگاف کرتے ہیں کہ ایک صرف ان کے ذہنی ادراک اور انسانی نفسیات کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف قاری کے ذہن پر بننے والی شعری تصویریں نفرت ومحبت اور آپسی تصادم کے طور پر ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

قیصر شمیم کی غزلوں میں بصری، سماعی اور حرکی پیکروں کی بہتات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ کائنات کے رموز واسرار کو صرف اپنی آنکھ ہی سے دیکھنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ سننے اور حرکت کرنے پر بھی یقین

www.taemeernews.com

رکھتے ہیں۔ بصری پیکر کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجیے :

نظر بدل کے ذرا دیکھنا ہے دنیا کو
ہمیں اب اپنی نگاہِ عتاب دے جاؤ

جس کو ملتی نہ تھی فرصت کبھی آئینے سے
وہ نظر رہتی ہے اب شام و سحر مجھ پر بھی

کوئی اتارنے بیٹھے تو ہاتھ جل جائے
کھنچی ہے اب کے وہ تصویر دہر آنکھوں میں

پھول، شجر، انسان، سبھی کے چہرے ہم نے دیکھ لیے
سامنے آئیں جو تصویریں سب میں نکلا کچا رنگ

نغمہ، رنگ، خوشبو، اشکِ شبنم
ڈھونڈھتی ہے کیا صبا منظر بہ منظر

دھندلکے کا سماں بدلے تو دیکھوں
کوئی چہرہ کہیں چمکے تو دیکھوں

نظر کی دھند میں ہیں بھولی بسری تصویریں
پلٹ کے دیکھنے والے، یہ دیکھنا کیا ہے

جس نے دنیا کو خوب دیکھا ہے
اس کی آنکھوں میں قہقہہ ہے

الجھے ہوئے منظر پہ ذرا گہری نظر ڈال
ہے ترچھی لکیروں میں جو تصویر نئی ہے

میری آنکھوں میں جو رہتی تھی کبھی
کون اس قوسِ قزح کو دھو گیا

ان اشعار میں دنیا کو کسی اور زاویے سے دیکھنے کے لیے نگاہِ عتاب کی آرزو کرنا، دن رات ایسی نظروں کے تعاقب میں رہنا جو اپنے آپ میں کھوئی رہتی تھیں، آنکھوں میں بیٹھی تصویر کو اتارنے سے ہاتھوں کے جلنے کا خدشہ پیدا ہونا، پھول شجر اور انسان کے چہرے پر کچے رنگ کا ہونا، صبا کا منظر بہ منظر کسی کو تلاش کرنا، دھندلکے کو چھٹنے کے ساتھ کسی چہرے کے چمکنے کی آرزو کرنا، نظر کی دھند میں بھولی بسری تصویروں کو پلٹ کر دیکھنا، دنیا کو دیکھ کر قہقہے لگانا، روشنی کی چاہ میں دبیز پردوں کو ہٹانا، الجھے ہوئے منظر پر کسی نئی تصویر کا ہونا اور آنکھوں کے قوسِ قزح کو دھو جانا شاعر کے تجربات و مشاہدات کا پتہ ہی نہیں دیتے ہیں بلکہ پیکریت کو بھی خلق کرتے ہیں۔ ان تمام اشعار میں قوتِ بصارت کے عناصر بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جو شاعر کو بصری پیکر خلق کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

قیصر شمیم کی قوتِ بصارت کے ساتھ ساتھ قوتِ سامعت بھی تیز ہے۔ کبھی کبھی وہ دیگر حواس کی بہ نسبت قوتِ سامعہ سے کہیں زیادہ کام لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں سمعی پیکروں کا بھی ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار :

رات کی سونی گلی میں گونج اٹھی تھی کس کی چیخ
میں تھا یا تھے میرے پھیرے، اور تو کوئی نہ تھا

تیری آواز سے جب ٹوٹے مرے گھر کا سکوت
در و دیوار کو بھی سحر بیانی دینا

سنی نہ تم نے تو پھر خطا ہے کیا قیصر
سنانے آیا نہ تھا میں بھی داستاں کوئی

قہقہوں کی برات نکلی تھی
درد کی چیخ کون سنتا تھا

www.taemeernews.com

ہے قیصر بہت ہی شہر میں | روح کی فریاد بھی بیجا ہوئی
نغمہ چھیڑو گے، کبھی آہ بھرو گے قیصر | سر پھرے لمحوں کو کب تک یونہی بہلاؤ گے
آنکھوں میں کسی کی بھی اب نیند نہیں آتی | یہ کون سی لوری ہے، گہوارے لرزتے ہیں
بدلا ہوا لہجہ ہے نہ تقریر نئی ہے | پھر بھی تری ہر بات میں تاثیر نئی ہے
رنگ پر آئی تھی جس روز یہاں بزم نشاط | دوست مستی میں سناتے تھے لطیفے کیا کیا
آج بڑے اونچے لہجے میں بات وہ سب سے کرتا ہے | کل جب اس کا پول کھلے گا، اس کے بول سنے گا کون
اس کی جانب اشارتاً ہی سہی | اپنا روئے سوال رہنے دے

مندرجہ بالا اشعار میں ایک تنہا انسان اور اس کے سائے کے علاوہ کسی اور کے موجود نہ ہونے کے باوجود رات کی سونی گلی میں چیخ کا گونجنا، کسی کی آواز سے گھر کا سکوت ٹوٹنے کے بعد در و دیوار کے سحر بیانی کی دعا مانگنا، کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر یہ کہتے ہوئے واپس چلے آنا کہ میں بھی یہاں اپنی بات سنانے نہیں آیا تھا، قہقہوں کی بارات میں درد کی چیخ کا دب جانا، روح کی فریاد کا شہر کے شور میں دب جانا، سر پھرے لمحوں کو نغمہ چھیڑ کر تو کبھی آہ بھر کر بہلانا، انجان لوری کی آواز سے گہوارے کا لرزنا اور آنکھوں میں نیند کا نہ آنا، بغیر لہجہ بدلے اپنی تقریر میں تاثیر پیدا کرنا، بزم نشاط میں دوستوں کا لطیفہ سنانا، کسی کو اونچی آواز پر یہ کہہ کر انگلی اٹھانا کہ جب اس کا پول کھلے گا تو کون اس کے بول سنے گا اور محبوب کی جانب اشارتاً ہی سہی روئے سوال کا رکھنا شاعر کی قوت محسوسات کو متحرک کر کے سماعی پیکر کی تخلیق کرتے ہیں۔

بصری اور سماعی پیکروں کے ساتھ ہی قیصر شمیم کی غزلوں میں حرکی یا متحرک پیکروں کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چونکہ قیصر شمیم دیکھنے اور سننے کے ساتھ ساتھ حرکت و عمل کرنے پر بھی یقین رکھتے ہیں جس لیے ان کی غزلوں میں حرکی پیکروں کی تشکیل ہوتی ہے۔

میں تمھیں رکاؤں لیکن | رکا میرا کارواں رکا
اے غم دہر میری راہ نہ روک | جانے وہ کب سے انتظار میں ہے
شہر الم سے شہر طرب تک ایک قدم کی دوری ہے | پھر بھی یہ دوری طے نہیں ہوتی ہائے یہ کیا مجبوری ہے
جانے کس کا ساتھ رہے گا جاتے جاتے منزل تک | کتنے ساتھی چھوٹ گئے ہیں اونچی نیچی راہوں میں
اپنے گھوڑے اگر تھک گئے راہ میں | پا پیادہ تعاقب تو مشکل نہیں
بھاگتے ہیں سرابوں کے پیچھے تو کیا | مل ہی جائیں گی ہم کو کہیں ندیاں
پنچھی کیوں آیا یہ دیکھ | کس نے بچھایا جال نہ پوچھ

www.taemeernews.com

آئی ہے گھنے جنگل میں ابھی جو کھیل بھی چاہے کھیلے گرد | کل میرے ساتھ اُڑائے گی پھر صحرا صحرا گرد ہوا
ریت پر نقش کفِ پا نہیں رہنے پاتے | اہلِ صحرا کو کوئی اور نشانی دینا
سوچ کر چلنے دو شطرنج کی چال | ہارا تو فنا ہے اس کی
اترنا ناؤ سے اپنی سنبھل کر | کنارے کی ہر اک جھاڑی سے بچنا
صبح کو گھر سے تو نکلے ہو مگر شام کے بعد | اپنے دروازے پہ پہنچو گے تو گھبراؤ گے

ان اشعار میں راہ میں رکاوٹوں کے باوجود کارواں کا نہ رکنا، غمِ دہر کو یہ کہہ کر راہ روکنے سے باز رکھنا کہ میرا محبوب میرے انتظار میں ہے، شہرِ الم سے شہرِ طرب تک کی دوری کا طے نہ ہونا، اونچی نیچی راہوں میں ساتھیوں کے بچھڑنے پر یہ کہنا کہ منزل تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے کس کا ساتھ رہے گا، اس امید کے ساتھ سرابوں کے پیچھے بھاگنا کہ ندیاں تو مل ہی جائیں گی، جال بچھانے والوں کے متعلق پوچھے بغیر یہ دیکھنا کہ پنچھی کیوں ہجرت کر کے آیا ہے، گرد کو یہ کہنا کہ تم تو ابھی آئی ہو، تھوڑی دیر اس جنگل میں خس کھیل لو، کل میرے ساتھ تمہیں بھی صحرا صحرا بھٹکنا پڑے گا، ریت پر پاؤں کے نشان باقی نہ رہنے پر اہلِ صحرا کو کوئی اور نشانی دینے کی سفارش کرنا، اس خوف کے ساتھ کہ اگر وہ ہارا تو فنا ہو جائے گا یہ کہنا کہ سوچ سمجھ کر اسے شطرنج کی چال چلنے دو، ناؤ سے سنبھل کر اترنے کے بعد کنارے کی جھاڑیوں سے بچ کر چلنے کی ترغیب دینا اور صبح کو گھر سے نکلنے کے بعد شام کے وقت دروازے تک پہنچنے میں گھبرانا حرکی پیکر کی مثالیں ہیں۔ جو متحرک زندگی سے بھرپور رواں دواں ماحول کی پروردہ ہیں، جن سے جڑی ہوئی ہر ایک چیز حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان پیکروں کے ذریعہ قاری کے ذہن پر جو نقوش ابھرتے ہیں وہ بھی متحرک ہوتے ہیں، جو حرکی پیکر کی مثالیں ہیں۔

بصری، سماعی اور حرکی پیکروں کے علاوہ قیصر شمیم کی غزلوں میں شامی، لمسی اور حسی پیکروں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ شامی پیکر کی کچھ مثالیں دیکھیے :

وہ پھول نہیں ہوں تو جسے پھینک دے لے کر | خوشبو کی طرح میں ترے بالوں سے رہوں گا
ایک خوشبو کا بانٹنے والا | گندی بستی کا رہنے والا تھا
ہمارے زخموں کی خوشبو کہیں نہ پھیلے گی | ہماری شب کا مقدر تو چھین لو پہلے

چونکہ خوشبو قوتِ شامہ کو متحرک کرتی ہے۔ اس لیے خوشبو ہی شامی پیکر کے لیے واحد مخرج کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان تینوں اشعار میں خوشبو کلیدی لفظ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ پھول اپنی شاخ سے الگ ہو کر بھی اپنی خوشبو چھوڑ جاتا ہے، اسی طرح شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ میں وہ پھول نہیں ہوں کہ جس کو پھینک دیا جائے، میں تو

www.taemeernews.com

خوشبو کی طرح زلفوں میں بس جاؤں گا۔ دوسرے شعر میں کیچڑ میں کنول کی مثال کے پیش نظر کہا گیا ہے کہ خوشبو کا بانٹنے والا گندی بستی میں رہتا ہے اور تیسرے شعر میں شب کے مقدر کو چھین لینے سے زخموں کی خوشبو کے نہ پھیلنے سے تعبیر دی گئی ہے جو کہ قوت شامہ کو متحرک کر کے شامی پیکروں کی تشکیل کرتے ہیں۔

لمسی پیکر کا تعلق چونکہ قوت لامسہ سے ہوتا ہے اس لیے اس پیکر کے ذریعہ جو ذہنی تصویریں بنتی ہیں انکی بنیاد چھونے یا محسوس کرنے سے ہوتی ہے۔ قیصر شمیم کے یہاں اس طرح کے پیکروں کی مثالیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں:

زخم پر ان کو نمک پاشی کی عادت — اک یہی انعام دینا، کام ان کا

میں کھلونا ہوں تیرے ہاتھوں کا — چاہے ٹوٹ جاؤں گا

ہاتھ اگر ہم کھینچ لیں اپنا — اس کا نتیجہ کیا ہوگا

خوابوں کے خاکے تو بہت ہیں — ان میں رنگ بھرے گا کون

سر کے زخم تو بھر جائیں گے، آپ کی مرہم پٹی سے — لیکن کیا ہوگا اس دل کا، اس میں ہے الگاؤ بہت

نرم نرم انگلیاں ہواؤں کی — کھردرا جسم شاہراہوں کا

جگائے جاتی تھی ہر موج پاؤں چھو چھو کر — ہمیں سرکتی ہوئی ریت پر نہ سونا تھا

ان اشعار میں محبوب کے ذریعے زخم پر نمک پاشی کرنا، ہاتھوں کا کھلونا ہونا، ہاتھ اس لیے نہیں کھینچنا کہ اس کے بعد خوابوں کے متعدد خانوں میں کون رنگ بھرے گا، محبوب کی مرہم پٹی سے سر کا زخم بھر جانا، شاہراہوں کے کھردرے جسم پر ہواؤں کی نرم نرم انگلیوں کا ہونا اور آخری شعر میں شاعر کا یہ کہنا ہمیں سرکتی ہوئی ریت پر اس لیے نہیں سونا چاہیے کہ ہر موج پاؤں چھو چھو کر جگا جاتی ہے، جو کہ لمس یا چھونے سے تعلق رکھتے ہیں اور شاعر کی مدد لمسی پیکروں کو خلق کرنے میں کرتے ہیں۔

ابھی تک جن پیکروں کا ذکر آیا ان سب کا تعلق حواسِ خمسہ سے تھا لیکن یہاں ایک اور پیکر کا ذکر بھی لازمی ہے جس کا تعلق بھی حواسِ خمسہ سے ہے۔ اس کے باوجود بھی اس پیکر کی شناخت الگ سے کی جاسکتی ہے۔ جسے سمجھنے کے لیے ہمیں ان سبھی پیکروں کو دھیان میں رکھنا ہوگا جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، جنھیں ہم دیکھ، سن یا چھو سکتے ہیں لیکن بعض اشیاء غیر مرئی ہوتی ہیں، جنھیں دیکھا سنا یا چھوا نہیں جاسکتا ہے۔ جسے ہم انسان کا معروضی احساس بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر درد، ہوا کی خنکی، نیند وغیرہ۔ اس لیے جب ان معروضی احساسات یا غیر مرئی اشیاء کے ذریعہ کوئی پیکر وجود میں آتا ہے تو ہم اسے حسی پیکر کا نام دیتے ہیں۔ قیصر شمیم نے اپنی غزلوں میں اس صنعت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں:

www.taemeernews.com

جس کو کبھی دیکھا ہی نہیں ہے وہ ہے اپنے دل کے قریب
ہم تو برسوں ساتھ رہے ہیں پھر بھی کتنی دوری ہے

اک ترے درد کی بخشش تھی کہ کچھ یاد نہ تھا
اس طرح اپنی تو آرام ہی کرتے گزری

موسم عجیب رہتا ہے دل کے دیار کا
آتے ہیں لُو کے جھونکے بھی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ

دل کے اندر جو کچھ بھی ہے لفظوں میں کب ڈھلتا ہے
درد لبوں تک آتے آتے اپنی شکل بدلتا ہے

جب کوئی تازہ ہوا دیتی تھی دستک آکر
ذہن میں کھلتے تھے اس وقت دریچے کیا کیا

شام سے صبح تک پگھلتی رات
سلسلہ بے صدا کراہوں کا

دل کی سطح پر سکوں کو کیا ہوا
کیسی ہلچل یک بیک پیدا ہوئی

ان اشعار میں بغیر دیکھے کسی کا دل کے قریب رہنا، درد کی انتہا میں ہوش گنوا بیٹھنے کے بعد یہ کہنا کہ زندگی آرام سے گزر گئی، دل کے دیار میں ٹھنڈی ہوا کے ساتھ لُو کا آنا، دل کے درد کا لبوں تک آتے آتے اپنی شکل بدلنا، تازہ ہوا کے دستک دینے سے ذہن کے دریچوں کا کھلنا، پگھلتی رات میں بے صدا کراہوں کا رہنا اور دل کی سطح پر سکون کی جگہ ہلچل کا پیدا ہونا سب معروضی احساس یا غیر مرئی اشیاء سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنھیں نہ تو دیکھا جاسکتا ہے۔ نہ سنا جاسکتا ہے اور نہ چھوا جاسکتا ہے۔ اس لیے ان کے ذریعہ جو لفظی پیکر بنتے ہیں انھیں ہم حسی پیکر کہتے ہیں۔

ان پیکروں کے علاوہ قیصر شمیم کی غزلوں میں یادداشتی اور مخلوط پیکر بھی ملتے ہیں۔ یادداشتیں ہماری زندگی میں بہت اہم مقام رکھتی ہیں۔ یادیں تحت الشعور کا حصہ ہوتی ہیں اور جب کبھی حال کے کسی واقعے یا حادثے سے یادیں ہم آمیز ہوتی ہیں تو شاعر کے ذہن پر تصویریں بننے لگتی ہیں۔ جنھیں شاعر تخیل کی مدد سے لفظوں میں ڈھال کر پیکر کی تشکیل کرتا ہے ایسے پیکروں کو ہم یادداشتی پیکر کہتے ہیں۔ قیصر شمیم کی غزلوں میں اس نوع کے پیکر کی کچھ مثالیں حاضر ہیں:

یاد سے تری پوچھ رہا ہے شیدائی تنہائی میں
درد نہیں جب کوئی کھلونا، دل کیوں اس سے بہتا ہے

دل میں قیصر کے جو ہے ایک محبت بھری یاد
ہے وہی اے فلک پیر، نہ مٹنے والی

وہ اک نوائے زندگی جو چیخ بن کر کھو گئی
اب اس کی یاد میں کوئی قلم اٹھا تو کیا ہوا

وہ ایک یاد جو ابھی ہے داغ دل بنی ہوئی
پھسل نہ جائے ذہن سے کسی خیال کی طرح

کیا بات ہوئی، کیوں شہر جلا اب اس کے سوا کچھ یاد نہیں
اک فرد سراپا آگ ہوا، پل بھر میں اک فرد ہوا

یہ ہجوم سنگ باراں تجھے یاد تو رہے گا
مرا سر بھی آرہا ہے ترے کام، یاد رکھنا

ہم یہاں ہوں کہ نہ ہوں پھر بھی اے قیصر
یاد آئیں گے محبت بھرے رشتے کیا کیا

درج بالا اشعار میں ایک شیدائی کا یاد سے تنہائی میں محو گفتگو ہونا، دل میں محبت بھری یاد کا ہونا، نوائے زندگی کے چیخ

www.taemeernews.com

بن کر کھو جانے کی یاد میں قلم کا اٹھنا، یاد کا داغ بن کر دل میں رہنا، شہر جلنے کے بعد بھی یہ کہنا کہ اب کچھ یاد نہیں اور شاعر کا یہ کہنا کہ ہم یہاں رہیں یا نہ رہیں اس کے باوجود بھی یہاں کے محبت بھرے رشتے یاد آئیں گے۔ یاد کے دریچے کھول کر ماضی میں جھانکنے کی کوشش ہے، اس طرح ذہن کے پردے پر جو تصاویر بنتی ہیں وہ خوب صورت یادداشتی پیکروں کی تجسیم کرتی ہیں۔ قیصر شمیم نے اپنے اشعار میں ایک ساتھ کئی طرح کے حواس سے کام لیتے ہوئے پیکر تراشی کی ہے۔ یعنی انھوں نے ایک ہی شعر میں ایک سے زیادہ پیکروں کو یکجا کر کے اپنے ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ ایسے پیکروں میں بیک وقت دو یا دو سے زیادہ حواس کو متحرک کرنے کی خصوصیت موجود ہوتی ہے اس لیے ہم انھیں مخلوط پیکر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کچھ مثالیں دیکھیے :

سنتے ہیں کل رات زمیں چیخ اٹھی تھی
دیکھو تو افق پر کوئی تنویر نئی ہے

اے بدلتے منظرو! کچھ تو کہو
پاؤں کے نیچے زمیں تھی کیا ہوئی

بہت سنبھلی ہوئی رفتار کیوں ہے
قدم اس کا کہیں بہکے تو دیکھوں

نغمہ، رنگ، خوشبو، اشکِ شبنم
ڈھونڈھتی ہے کیا صبا منظر بہ منظر

وہی ہے پیاس کا منظر وہی لہو قیصر
ز بھرتی ہے کونے کی لہر آنکھوں میں

تو ہو جدا تو دل سے رہے تیری گفتگو
تیرا بدن جو دور سے جھپکے تو شعر ہو

جب تک سر پر تاج ہے قیصر، کوئی لب نہ ہلائے گا
دیکھیں ظالم ہو جائے معزول، تو منظر کیسا ہو

فرض میرا گردشوں کی گت پر گانا
گردشِ ایام دینا، کام ان کا

سخن شناس ہے کتنا یہ پوچھ لوں قیصر
نظر وہ آئے جو حرف و نوا کے بندوں میں

ان اشعار کو پڑھ کر قاری بیک وقت دو طرح کے حواس کی کارکردگی کو بآسانی محسوس کر لیتا ہے۔ پہلے شعر میں زمین کے چیخ اٹھنے کی خبر سننا اور افق پر نئی تنویر کا دیکھنا ایک ساتھ سماعی اور بصری دو قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دوسرے شعر میں بدلتے ہوئے منظروں سے یہ پوچھنا کہ میرے پاؤں کے نیچے کی زمین کہاں گئی ایک ساتھ بصری، سماعی اور حرکی تینوں حسّوں کو مس کرتی ہے، تیسرے شعر میں سنبھلی ہوئی رفتار کو دیکھ کر یہ آرزو کرنا کہ قدم اگر ڈگمگائے تو دیکھوں شعر میں حرکی اور بصری پیکر کو اجاگر کرتے ہیں۔ چوتھے شعر میں صبا کا منظر بہ منظر، نغمہ، رنگ، خوشبو و اشک، شبنم کو ڈھونڈھنا ایک ساتھ کئی پیکروں کو جنم دیتے ہیں۔ جن میں بصری، حرکی، شامی، حسی اور لمسی حواس متحرک نظر آتے ہیں۔ پانچویں شعر میں پیاس کی شدت کی وجہ کر آنکھوں میں کونے کا منظر پھرنا ایک ساتھ حرکی اور بصری پیکر کے احساس کو ابھارتے ہیں۔ چھٹے شعر میں محبوب کے جدا ہونے پر دل سے گفتگو کرنا اور دور سے

www.taemeernews.com

بدن کے مہکنے پر شعر کا ہونا حس سماعی اور حسِ شامی دونوں کو متحرک کرتے ہیں۔ ساتویں شعر میں سر پر تاج کے ہونے سے لب کا نہ ہلنا اور ظالم کے معزول ہونے سے ایک نئے منظر کا اُبھرنا شعر میں سماعی اور بصری پیکر کو پیدا کرتے ہیں۔ آٹھویں شعر میں گردشوں کے گیت پر گانا دو طرح کی حس، سماعی اور حرکی قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور آخری شعر میں حرفِ نوا کے بندوں میں نظر آنے پر یہ پوچھنا کہ وہ کتنا بڑا سخن شناس ہے شعر میں بصری اور سماعی قوت کو متاثر کرتے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قیصر شمیم نے اپنے اشعار میں متعدد حواس سے بیک وقت کام لے کر خوب صورت مخلوط پیکروں کو جنم دیا ہے، جن کی مثالیں ان کے مجموعۂ کلام میں شروع سے آخر تک دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان پیکروں کے علاوہ انھوں نے تشبیہات واستعارات اور علامات و تلمیحات وغیرہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی پیکر تراشی کے نمونے بساطِ غزل پر دور تک پھیلا دیے ہیں۔ جن سے ان کی لسانی قوت پیکر تراشی کی صورت میں جلوہ گر ہو کر آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔

قیصر شمیم نے بعض مخصوص الفاظ کو متعدد بار لا کر اپنے اشعار میں پیکر تراشی کے نقوش مرتب کیے ہیں۔ ان الفاظ میں خون، لہو، آگ، چیخ، موت، خاک، خواب، رنگ وغیرہ مرکزی حیثیت کے حامل ہیں، جن کے ذریعہ انسانی ذہن پر واضح تصاویر ابھرنے لگتی ہیں اور زندگی کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ کرب ناک پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

آج بھی دل کا خون ہوتا ہے
کتنی آنکھیں ہیں خوں چکا اے دوست

میرا ہی رنگ ہے بہار میں دوست
میرا ہی عکس لالہ زار میں ہے

رحمت درماں کرنے والے آئیں اور تشخیص کریں
دل کی آگ وہی ہے، شعلے سے نس نس میں ہیں

یہ دیا بھی بجھ نہ جائے اب کہیں
یاس نے پھر دل کو گھیرا، کیا کریں

پیاس بجھتی ہی نہیں، دل کے لہو سے جن کی
راہ میں اب بھی چمکتے ہوئے خنجر ہیں وہی

کبھی موت کی خموشی رہی صبح سے طاری
کبھی چیخ اٹھے پرندے سرِ شام ہر گلی میں

ہم خاک وخوں کے قریے کو چاہیں تو چھوڑ دیں
جائیں مگر کہاں ترے شہرِ جفا کے بعد

اس گفتگو سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قیصر شمیم نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہی سہی، اپنی غزلوں میں پیکر تراشی کے جوہر جس انداز میں دکھائے ہیں ان سے ان کی غزلوں میں لفظ و معنی کی ایک نئی سمت واضح ہوئی ہے، جو قاری و سامع کو اپنے ساتھ ایک ایسی وادی میں لے جاتی ہے جہاں ان کے ذہن پر مختلف طرح کی تصویریں منعکس ہونے لگتی ہیں جن کا تعلق خیال اور جذبے کے ساتھ ساتھ لفظ کی زرخیزی سے بھی ہوتا ہے۔ قاری و سامع ان پیکروں میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اسے اپنے ہونے کا بھی احساس نہیں ہوتا اور یہی قیصر شمیم کی پیکر تراشی کا خاص امتیاز ہے۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر شکیل اختر
دہلی

لطیف جذبوں کا شاعر : قیصر شمیم

اردو زبان وادب کے مرکزی علاقوں سے دور مشرق کی جانب آباد تاریخی شہر کلکتہ ہمیشہ سے علم وادب اور معاشرتی وسیاسی تحریکات کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے مکینوں نے بنگلہ زبان وادب کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی جس طرح سرپرستی کی ہے اس سے اہلِ بنگالہ کی علمی وادبی کشادگی کا اظہار ہوتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور نذر الاسلام سے لے کر شرت چندر تک اس سرزمین پر ادب نے کئی کروٹیں لی ہیں۔ ٹیگور کی شاعری پر فارسی ادب کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں تو نذر الاسلام کی شاعری میں عربی الفاظ نظر آتے ہیں جن میں بعض کی صورتیں مسخ ہو گئی ہیں تو بعض جوں کے توں آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بنگلہ زبان نے جس طرح سے اپنے دامن میں بہت سی دوسری زبانوں کو سجا رکھا ہے' کہ اگر انھیں الگ کر دیا جائے تو یہ زبان ایک بحران سے دوچار ہو سکتی ہے۔ اس کے پس منظر میں ہندستان کی تاریخ کے اس باب کا رول بہت اہم ہے جس میں مسلمان ایک فاتح کی حیثیت سے ہندستان آئے۔ جب کوئی فاتح قوم پیش قدمی کرتی ہے تو اپنے ساتھ اپنی زبان' تہذیب اور قدروں کو بھی لاتی ہے اور اس سے مفتوح قوم غیر شعوری طور پر فائدہ اٹھاتی ہے۔ مشہور ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی نے ایک جگہ لکھا ہے "کہ اگر مسلمان ہندستان نہ آتے تو جدید ہندستانی زبانوں میں تغیر کا عمل بہت سست رہتا اور ان کو موجودہ شکل میں آنے کے لیے مزید کئی صدیاں اور لگ جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالی زبان وادب نے بھی دوسری زبانوں سے استفادہ کر کے خود کو وسیع کیا ہے۔ بنگال میں انگریزوں کی آمد اور حصولِ اقتدار کی جدوجہد نے ہندستانی زبانوں کو بھی متاثر کیا۔ کلکتہ سے قبل مرشدآباد میں اردو زبان وادب کا ڈنکا بج چکا تھا۔ انشاء اللہ خان انشاء اور دوسرے شعرا نے اسے ایک مکتبۂ فکر کا درجہ عطا کیا لیکن کلکتہ میں اردو زبان بولنے والوں کی آمد کا سلسلہ واجد علی شاہ کو مٹیا برج میں قیدی بنا کر لائے جانے کے بعد شروع ہوا۔ اس دیار میں مغربی اتر پردیش سے کثیر تعداد میں لوگوں نے تلاشِ معاش کے لیے ہجرت کی اور اسے اپنا وطنِ ثانی بنایا۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد بہار سے تلاشِ معاش میں آنے والوں کی یہاں ایک بڑی تعداد ہے۔ اگر پورے مغربی بنگال میں دیکھا جائے تو جہاں جہاں انگریزی حکومت نے

www.taemeernews.com

جوٹ مل، کپڑا مل یا اس طرح کی دوسری صنعتی یونٹوں کو قائم کیا تھا، جہاں کثیر تعداد میں کم تعلیم یافتہ مسلمانوں کی آبادی رہی ہے۔ اس طرح کی آبادی آج بھی کلکتہ کے نواح میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم ان دنوں ان نواحی علاقوں میں تعلیم کا زور زیادہ ہے اور علم و ادب کی محفلیں بھی خوب جمتی ہیں۔

کلکتہ کے نواح میں ایک علاقہ انکس ہے جہاں مزدور طبقے کی آبادی زیادہ ہے لیکن یہاں مخصوص حلقوں میں علم و ادب سے دلچسپی بھی رہی ہے۔ اسی سرزمین پر ۲ راپریل ۱۹۳۶ء کو اردو زبان و ادب کا ایک تابندہ ستارہ طلوع ہوا جسے ابتدائی دور میں لوگوں نے عمید انکسی کے نام سے پکارا لیکن جلد ہی اس نے پوری ادبی دنیا میں قیصر شمیم کے نام سے اپنی شناخت بنائی اور اعلیٰ تعلیم اور روزگار کے حصول میں شہر کلکتہ کا رخ کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ کرنے کے بعد درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گیا۔

قیصر شمیم نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں مولوی شمس الہدیٰ شمس مظفر پوری، عباس علی خان بیخود اور پرویز شاہدی سے سبقاً سبقاً شاعری کا درس لیا۔ طبیعت شروع سے ہی شاعری کی طرف مائل تھی اور مذکورہ اساتذہ کی سرپرستی میں انھیں جلد ہی ادبی حلقوں کا اعتبار حاصل ہونے لگا اور ادب کا یہ ستارہ آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے اور اپنی شاعری سے اس دیار میں ادب کی شمع روشن کیے ہوئے ہے۔ حالاں کہ کئی ادبی آندھیاں آئیں تو بعض نے ہوا کا ساتھ دیا لیکن یہ ابتدا سے ترقی پسند رہے اور آج بھی ہیں لیکن ان کے یہاں جدید شاعری سے ہم آہنگی کا رجحان بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مستقل ادبی نظریات کا ان کی شاعری پر دور دور تک اثر نظر نہیں بلکہ خود کو انھوں نے شاعری کے لیے وقف کر دیا ہے۔ بقول شخصے ان کے یہاں نو آزمودہ شاعروں کی اتنی اچھی مرمت ہوتی ہے کہ ان کی شاعری لیل و نہار بن جاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ان کے پہلے مجموعے "ساعتوں کے سمندر" کے حوالے سے ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ ترقی پسند حلقوں نے اسے سراہا اور اردو شاعری میں اسے ایک خوش گوار اضافہ قرار دیا۔ اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ یہ ان کی شعری تخلیقات کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ایک طرح کا سپاٹ پن نظر آتا ہے تاہم اس مجموعے میں انسانی زندگی کے رموز کو سمجھنے اور سمجھانے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ اسی مجموعے کے چند اشعار دیکھیے :

ہمارے جسموں کو موجیں نگل گئیں قیصر ۔۔۔ کہ ساعتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

نگل رہی ہے یہاں ریت دم بہ دم ہم کو ۔۔۔ یہ ریگ زار خطر در خطر کہاں کا ہے

کھلے دریچوں سے باہر ہے کون سا موسم ۔۔۔ کہ آگ بھرنے لگی سرد لہر آنکھوں میں

دلوں میں سب کے چبھ رہی ہے اک سوال کی طرح ۔۔۔ تری نگاہِ یاس بھی ہے میرے حال کی طرح

www.taemeernews.com

اس مجموعہ میں غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی ہیں اور بقول مظہر امام انھیں مغربی بنگال کے واحد گیت نگار ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان گیتوں میں بنگال کی سرزمین کی مخصوص خوشبو طبیعت کو بے چین کر دیتی ہے اور اس سے وہی قاری بہتر طور پر محظوظ ہو سکتا ہے جسے دیہی زندگی سے تھوڑی بہت بھی آشنائی ہو۔

اس مجموعے کے بعد "تری دھارا"، "سانس کی دھار" اور "پہاڑ کاٹتے ہوئے" منظرِ عام پر آ چکے۔ ان مجموعوں کے مطالعہ سے شاعر کی ذہنی کیفیت، سماجی کرب اور سماج میں پھیلی بے انصافیوں کے ماتم (جس کا شکار خود شاعر بھی رہا ہے) کا پتہ چلتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان تخلیقات کے بین السطور ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ شاعر نے ذہنی طور پر ترقی پسندی کو اپنی شاعری میں راہ دی ہے لیکن وہ سپاٹ ترقی پسند یا جدیدیت کے قائل نظر نہیں آتے بلکہ شعری روایت کا التزام بھی بخوبی کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں شاعری کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی تحریک کی علم بردار ہو۔ یہ تو ایک نازک اور لطیف احساس کی ترجمان ہے۔ قیصر شمیم نے نہایت لطیف انداز میں اپنی بات اس طرح کہی کہ شعری روایت کی پابندی بھی ہوتی ہے اور بدلتے حالات کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں۔

قیصر شمیم کی نظموں میں ایک اہم نظم "۳۲ ویں پہاڑ کٹنے کے بعد" ہے۔ یہاں شاعر کی آرزوئیں سوال کرتی ہیں لیکن اس کے جواب میں شاعر صرف مسکراتا رہتا ہے۔ نظم کا ایک بند دیکھیں:

لیکن وہ آرزو وہ طرح دار آرزو	بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے بعد بھی
گھبرا کے پوچھتی ہے کیا آگے جاؤ گے	کیا دوسرے پہاڑ پہ تیشہ چلاؤ گے
کب تک یہ پہاڑ سے پنجے لڑاؤ گے	فرہاد کا یہ فرض کہاں تک نبھاؤ گے
ان ناگہاں سوالوں پہ پل بھر رکا ہوں میں	پھر مسکرا کے تیشہ لیے چل پڑا ہوں میں

پوری نظم شاعر کی ذہنی کرب کا آئینہ دار ہے جہاں وہ سماج کی ناانصافیوں سے مسلسل جوجھ رہا ہے مگر ہمت نہیں ہارتا، آرزوئیں کبھی کبھی پست بھی ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ شاعر سے اس طرح کے سوالات کرتی ہیں لیکن شاعر ان سب باتوں کو سنتا اور مسکراتا رہتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اگر بتیسویں پہاڑ کاٹنے کے بعد بھی منزل نہیں ملتی تو وہ اپنی جد و جہد کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھے گا جب تک کہ منزلِ مقصود نہ مل جائے۔ آخری مصرعے پر اگر غور کریں تو ایسا لگتا ہے کہ شاعر ان حالات سے خود کو نبرد آزما پانے کے بعد بھی بلند ہمتی کا مظاہرہ کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی شاعر کی یہ آرزو کہ فرہاد کا یہ فرض کہاں تک نبھاؤ گے ہمارے معاشرے کی ان فرسودہ رسموں اور طبقاتی کشمکش کی طرف توجہ دلاتا ہے جس کا شکار عام آدمی ہے۔

قیصر شمیم بنگال کے ایک کامیاب غزل گو شاعر ہیں جن کے یہاں شعری التزام کی روایت کافی توانا

www.taemeernews.com

نظر آتی ہے۔ الفاظ کے در و بست سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے لفظوں کا صحیح استعمال ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت بن جاتی ہے۔

خاک ہو جانا مگر دوشِ ہوا پر رہنا　　　فرض ہے دشت میں یہ بعدِ سفر مجھ پر
ہے سمندر میں تو رکھ گہرائیوں کا وصف بھی　　　سر پھری موجوں کی صورت سطح کی اچھل نہ بن

مذکورہ شعر میں شاعر نے جس انسانی وصف کی طرف اشارہ کیا ہے بذاتِ خود اس سے متصف نظر آتے ہیں۔ اگر قیصر شمیم کی شاعری اور ان کی عمومی زندگی پر ایک نگاہ ڈالیں تو واقعی ان میں سمندر کی سی گہرائی ہے جہاں سے آپ بہترین گوہر تلاش کر سکتے ہیں۔ وہ خاکساری کا مجسمہ ہیں اور اپنی شاعری میں اس وصف کی تجسیم کی ہے۔ لہجے میں کہیں کرختگی نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری سردیوں میں بادل کے اوٹ سے جھانکتے ہوئے اس سورج کی مانند ہے جس کی کرنیں جسم میں حرارت پیدا کرتی ہیں یا پھر وہ روپہلی صبح جو ایک خوش گوار دن کی بشارت دیتی ہے۔ کہیں کہیں وہ بہت معمولی تلمیح یا کنایے سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ یہ شعر دیکھیے :

موسم تو بدلتے ہیں لیکن کیا گرم ہوا' کیا سرد ہوا　　　اے دوست ہمارے آنگن میں رہتی ہے ہمیشہ زرد ہوا

اب صرف زرد ہوا کی ترکیب نے پورے معاشرے کی عکاسی کر دی ہے اور شاعر بھی اسی معاشرے کا پروردہ ہے لہٰذا یہ زرد ہوا اس کے آنگن تک آتی ہے اور یہ پورے سماج کو کھوکھلا بنا کر رکھ دیتی ہے لیکن اس فرسودہ معاشرے میں رہتے ہوئے بھی ان کی شاعری میں غمِ دنیا کے ساتھ ساتھ غمِ جاناں بھی جھلکتا ہے جہاں حیات و کائنات کے سلسلے میں غور و فکر ہے تو ساعتوں کے سمندر میں ڈوب جانے کا خوف بھی۔

ناپ رہا ہے تو کیوں اونچے عہدوں سے　　　میرا قد چھوٹا ہے بابا تیرا کیا
تم پرکھنا تو بتا بھی دینا　　　میں برا ہوں کہ بھلا ہوں بابا

کبھی کبھی وہ میر کا لہجہ بھی اختیار کرتے ہیں :

رات دن کلیاتِ میر نہ دیکھ　　　وقت کو دیکھ دل کے تیر نہ دیکھ

اس طرح مجموعی طور پر قیصر شمیم بنگال کا وہ توانا اور بیدار ذہن شاعر ہے جس کی ذات نہ صرف سرزمین بنگالہ بلکہ اردو ادب کے لیے ایک گراں مایہ سرمایہ ہے۔ موصوف کی ذات سے آج بھی کلکتہ اور نواحِ کلکتہ کی بستیوں میں ادبی محفلیں سرگرم ہیں اور شاگردوں کا ایک جمِ غفیر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ استاد داغ کے بعد سب سے زیادہ تلامذہ بنانے کا سہرا کہیں تو ان کے سر تو نہیں جاتا اپنی بات خود ان کے ہی شعر پر ختم کرتا ہوں :

بدلا ہوا لہجہ ہے نہ تقریر نئی ہے　　　پھر بھی تری ہر بات میں تاثیر نئی ہے

www.taemeernews.com

محمد شمشیر عالم

قیصر شمیم : عصری حسیت کی کامیاب نمائندگی

رحمت کی التجا تھی خدا سے خطا کے بعد
آنسو نکل پڑے مرے حرفِ دعا کے بعد

ناگاہ" سانس کی دھار" میں استادِ محترم قیصر شمیم کے اس شعر پر نظر پڑی اور مجھے میر کا شعر بے اختیار

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

عرصہ ہوا مالک رام نے اپنے ایک مضمون میں غالب کی ایک مشہور غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے اس شعر کی بجا تعریف کی تھی :

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

استادِ محترم فرماتے ہیں :

آپ کا چھپنا کیا چھپنا ہے دعوت ہے نظارے کی آپ نمایاں اور ہوئے ہیں اچھی یہ مستوری ہے

اقبال کے یہاں خودی کے انکشاف و اظہار اور جذبۂ خودی کی تطہیر کے کیسے کیسے اشعار ملتے ہیں
" سانس کی دھار" کے دو اشعار نے اپنی جانب ذہن کو ملتفت کرلیا :

دوب ہو جیسی بھی پامال ہوا کرتی ہے نرم رکھو گے طبیعت تو سزا پاؤ گے
تو سہی شمع ، مگر دسترسِ غیر میں ہے تجھ سے پُر نور شبِ غم زدگاں کیوں کر ہو

میر نے بہت درد سے کہا تھا :

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

استادِ محترم کا کہنا ہے :

تو بھی ایک جبر ہے اے گردشِ حیات شام و سحر کہاں ہیں مرے اختیار میں

www.taemeernews.com

ساحرلدھیانوی نے کہا تھا :

" رت نے تو بخشی تھی ہمیں ایک ہی دھرتی
ہم نے کہیں بھارت کہیں ایرا

استادِمحترم فرماتے ہیں :

مشرق و مغرب ایک ہی دل کے گوشے ہیں
بوالہوسی میں یہ دنیا تقسیم ہوئی

غالب نے لڑکپن میں مجنوں پہ سنگ اٹھایا تھا کہ انھیں اپنا سر یاد آ گیا۔ اب استادِ محترم کو دیکھیے

یہ ہجومِ سنگ باراں تجھے یاد تو رہے گا
مرا سر بھی آ رہا ہے ترے کام یاد رکھنا

ہر اچھا شاعر اپنے پیش رووں سے استفادہ کرتا ہے'ان کے خیالات نظم کرتا ہے'ان کی روشن کردہ شمعوں سے اپنی شمع روشن کرتا ہے'لیکن وہ اپنی راہ الگ بناتا ہے۔ اس کے یہاں ماضی کی آوازوں کی گونج تو ہوتی ہے لیکن اس کی آواز اپنی انفرادیت کا نقش ہمارے دلوں پر مرتسم کرتی جاتی ہے۔ وہ کہیں سے خیالات مستعار لیتا ہے تو ایک نیا جہانِ معنی آباد کرتا ہے۔ وہ اپنی جنبشِ خامہ سے صفحۂ قرطاس پر اپنی عظمتوں کے نقوش روشن کرتا جاتا ہے اور یہی انفرادیت' یہی شخصی لے' یہی مخصوص انداز اسے حیاتِ دوام عطا کرتے ہیں۔ استادِ محترم نے بھی یہی کیا ہے۔ انھوں نے جہاں کہیں سے بھی فکر کے شرارے لیے ہیں انھیں اپنے منضبط نظامِ فکر کی بھٹی میں سلگا کر اور زیادہ روشن و تابندہ کر دیا ہے :

اکبر حیدری کا بہت اچھا شعر ہے :

نہ دوستوں کی طرح ہیں' نہ دشمنوں کی طرح
یہ کون لوگ صفِ دوستاں میں آنے لگے

استادِ محترم نے اس مضمون کو کتنے رفعت عطا کر دی ہے :

پشت پر "وار کس کا" یہ بتاؤں کس طرح
دوست ہی پیچھے تھے میرے' اور تو کوئی نہ تھا

ابھی نہیں آپ" سانس کی دھار" کا مطالعہ کیجیے۔ کئی بار ایسا ہوگا کہ پڑھتے پڑھتے آپ ٹھٹک جائیے گا۔ سوچیے گا' جس عہد میں شاعر سانس لے رہا ہے وہ آپ کا اپنا دیکھا بھالا عہد ہے۔ آپ نے اسے برتا ہے لیکن ایسی کسک شاید ہی محسوس کی ہے :

اس کے آنگن میں روشنی تھی مگر
گھر کے اندر بڑا اندھیرا تھا

آپ ذرا خیال کیجیے ہنگامِ جہاں دراز ہے' مصائب و آلام کی یورش ہے' بے چہرگی کا سماں ہے' ہر جانب انتشار و افتراق کا عالم ہے' اخلاقی قدریں زوال آمادہ ہیں' انسانیت کراہ رہی ہے' پھول جل رہے ہیں'

www.taemeernews.com

شعلوں کی زد میں نظامِ بہار ہے' کائنات کے ذرے ذرے کے بطن سے الاماں کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ ایسے میں کسی کی خودداری کا پنپنا اور نہ صرف پنپنا بلکہ ارتقا کی اس منزل تک پہنچا جہاں پہنچ کر اسے ربِ قدیر کے سامنے بھی دستِ سوال دراز کرتے ہوئے شرم محسوس ہو کیسی حیرت انگیز اور معجزہ پرور بات ہے۔

کچھ بھی ہو دستِ دعا کاسہ نما ہوتا ہے
ہاتھ اٹھاتا ہوں تو یہ سوچ کے رہ جاتا ہوں

استادِ محترم کا مجموعۂ کلام پڑھیے اور ذرا سی سنجیدگی اور ذرے سے خلوص کے ساتھ پڑھیے تو چند ہی لمحوں کے بعد آپ اپنی روح اور شاعر کے کلام کے درمیان ایک انجانے روحانی ارتباط کی جلوہ گری کا مشاہدہ کرنے لگیں گے۔ آپ کو ایسا لگے گا کہ شاعر آپ کے جسم کی حدوں کو توڑ کر روح میں سما رہا ہے۔ آپ باہر کہیں کچھ نہیں رہے ہیں بلکہ آواز خود آپ کے اندر سے' آپ کے نہاں خانۂ دل سے نکل کر آفاق کو اپنی آغوش میں لیتی جارہی ہے۔ یہی اچھی شاعری کا کمال ہے' یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے آپ شاعر کو انفس و آفاق کی منزلوں سے گزرتے ہوئے دیکھ بھی سکتے ہیں اور نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہم سفر بھی ہو سکتے ہیں۔

جہاں تہاں سے ان کے کچھ اشعار اٹھا کر دیکھیں' ہر جگہ ان کی انفرادیت کی شمع روشن ہے' ہر مقام پر ان کے نقوشِ پا کی جلوہ گری ہے' وہی انسانی عظمت کا احساس ہے' وہی ارفع ترین جذبات ہیں جو سیلِ رواں کی طرح بڑھتے چلے آتے ہیں' وہی طلسم آفرینی ہے وہی افسانہ و افسوں ہے' وہی لازوال حقیقتیں ہیں' وہی شعری صداقتیں ہیں جن سے زندگی کا خمیر اٹھا ہے اور جو ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہیں :

مری صبح یاد رکھنا ' مری شام یاد رکھنا
میں ہوں پر بریدہ طائرِ تہہِ دام یاد رکھنا

کوئے قاتل ' کوئے قاتل ہی تو ہے
شور ہے کیسا بپا ؟ کیا دیکھنا

عصری حسیت سے شاعر کی آگاہی سے قاری کے دل میں جگہ بنانے میں مدد دیتی ہے۔ اس پر لہجے کا بانکپن اس کی انفرادیت وضع کرتا ہے۔ شاعر اپنے زمانے سے جس قدر مربوط رشتہ رکھے گا' اس کی شاعری میں معنوی جہات اتنے ہی زیادہ ارفع اور جستہ ہوں گے۔ اس کے شعروں میں زندگی کی جرأت اتنی ہی شدید اور متاثر کن ہوگی۔ شاعری جس قدر عملی (Practical) ہوتی ہے اسی قدر اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ یہاں استادِ محترم کے چند شعر اور دیکھیے اور سوچیے کہ عصری حسیت کے گہرے سمندر کی کون سی لہر ہے جو یہاں موجزن نہیں :

پہلے تو جتائی جاتی ہے ہمدردی پیاس کے ماروں سے
پھر آنکھ بچا کر پانی میں کچھ زہر ملایا جاتا ہے

گرنے پہ مرے افسوس نہ کر دنیا میں ہمیشہ اے قیصر
جب خود کو اٹھانا ہوتا ہے' بتوں کو گرایا جاتا ہے

www.taemeernews.com

ہیں شب گزیدہ سہی، پر یہ کیوں کہوں تم سے — کہ آؤ آ کے مجھے آفتاب دے جاؤ

اخیر میں اتنا ہی کہوں گا کہ استادِ محترم کے کلام کے مطالعے سے اگر ہمارے جذبات کی تطہیر ہوتی ہے' ہمارے اندر بلند حوصلگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے' ہمیں عظمتِ آدم کا گہرا اور شدید احساس ہوتا ہے' ہمارے جسم و جان میں ایک نوع کی بالیدگی آتی ہے' ہمارے غم زیادہ رفیع ہو جاتے ہیں' ظلمتِ شب میں چراغ روشن کیے جانے کی سی کیفیت جنم لیتی ہے اور زندگی کی خوش سطح متحرک معلوم ہونے لگتی ہے تو ہمیں ایک بار انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ انھیں بھی مطالعۂ کلام کی دعوت دینی چاہیے جو ابھی تک اس وادیِ گل رنگ اور بیاضِ ہزار داستان سے نہیں گزرے :

نام سے اپنے شہنشاہ تھا قیصر لیکن — ہم نے جب دیکھا تو وہ شخص قلندر ہی لگا

ہمیں اس قلندر کو ایک بار ضرور پڑھنا چاہیے کہ یہ قلندر کوئی معمولی قلندر نہیں۔

غـــزل

قیصر شمیم

تا عمر ترے چاہنے والوں میں رہوں گا — مجنوں کی طرح میں بھی مثالوں میں رہوں گا

وہ پھول نہیں ہوں تو جسے پھینک دے لے کر — خوشبو کی طرح میں ترے بالوں میں رہوں گا

تحریر تو ہونے دے مجھے صفحۂ دل پر — میں آیتِ غم ہوں تو حوالوں میں رہوں گا

پینے دے مجھے زہر کہ میں اس کی بدولت — امرت کی طرح سب کے پیالوں میں رہوں گا

بجھ جاؤں گا میں شمع کی مانند کسی دن — تابندہ مگر تیرے خیالوں میں رہوں گا

اک عمر گزاری ہے اندھیروں میں تو کیا ہے — مر جاؤں گا تو میں بھی اجالوں میں رہوں گا

آئے گی اجل بھی تو یقیں ہے مجھے قیصر
الجھا ہوا میں اپنے سوالوں میں رہوں گا

www.taemeernews.com

ڈاکٹر سید احمد شمیم

جمشید پور

قیصر شمیم : زندگی کی ہمک کا شاعر

قیصر شمیم مہانگر کولکاتا میں رہتے ہیں؛ جو ہر دور میں انقلابیوں اور فنکاروں کا شہر رہا ہے۔ زندگی جہاں طوفان بردوش بھی ہے اور دشمنِ عقل و ہوش بھی۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری زندہ لہو کی ہمک سے عبارت ہے جس میں جذبات کی آنچ بھڑکی ہے تو الفاظ پگھلنے اور چیخنے لگے ہیں۔ ان کی ایک اہم نظم ہے "کلکتہ" کے چند ابتدائی مصرعے ملاحظہ ہوں :

ظلم ہوتا ہے کہیں تو
سر کو گھٹنوں میں دبائے
سانس روکے
اپنے ہونٹوں پر کوئی تالا لگائے
بیٹھے رہنے کی تجھے عادت نہیں ہے
اور تیری چیخ...... پھر چاروں طرف دلوں میں یوں اتر جاتی ہے
جیسے یہ صدا سب کی صدا ہو!

قیصر شمیم چاہتے تو یہیں پر نظم کو ختم کر سکتے تھے لیکن انہوں نے کولکاتا کے حوالے سے اپنی ذات کا مطالعہ بھی کیا ہے اور کہا ہے :

میں صدا کو نعرہ بنتے
نعرہ بن کر نغمہ بنتے
نغمہ بن کر روح میں ڈھلتے ہوئے بھی دیکھتا ہوں
اور اکثر سوچتا ہوں
کیا مری آواز بھی اس روح کے نغمے میں شامل ہو گئی ہے

www.taemeernews.com

.....تیرا سرخ چہرہ دیکھتا ہوں

"سرخ چہرہ" کولکاتا کی مشتعل انقلابیت کا استعارہ ہے، جس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔

قیصر شمیم مزاجاً مقصدیت اور تخلیقیت، اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان توازن کی تلاش کے شاعر ہیں۔ جب بھی اس تلاش میں وہ کامیاب ہوئے ہیں تو شاعری کا حسن چمک اُٹھا ہے اور بے توازن ہوئے ہیں تو لڑکھڑا گئے ہیں۔ مگر مقامِ شکر ہے کہ دھم سے گرے نہیں ہیں، ورنہ شاعری میں بارِ گراں اٹھانا آسان نہیں ہے۔ اس میں بڑے بڑوں کے شانے جھول گئے ہیں۔ قیصر شمیم حساس شاعر ہیں۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی ریاکاری، سیاسی ابتری، نفرت، دشمنی اور تعصب کی کالی اندھیوں نے انہیں مضطرب اور بے چین کیا ہے۔ ان کی نظموں میں "کل، آج اور کل"، "بچی کے دو بول"، "سب کو خوشی دے دے"، "ایمان"، "یہ سپنا کب پورا ہوگا" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن سے ان کی دردمندی جھلکتی ہے۔ ان تمام نظموں میں کسی نہ کسی سنجیدہ موضوع کو چھوا گیا ہے، کوئی نہ کوئی سوال اٹھایا گیا ہے۔ یہ سب کی سب مسائل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسے مسائل جن سے جسم و جاں میں چنگاریاں سلگ اٹھتی ہیں اور فکر و احساس کا ہر تار مرتعش ہو جاتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ قیصر شمیم مشاق اور باکمال شاعر ہیں۔ چنانچہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ شاعری صراحت کا نہیں اشارت کا نام ہے مگر کبھی کبھی وہ اسے فراموش بھی کر گئے ہیں اور اشارت صراحت میں بدل گئی ہے۔ شاید اس لیے کہ صراحت انہیں ترقی پسندی سے وراثت میں ملی ہے۔ مثلاً ان کی نظم "کل، آج اور کل" ایک ایسی نظم ہے جس میں Oject کا کہیں بھی نام نہیں لیا گیا ہے۔ پہلا بند خالص شاعری کا نمونہ ہے۔ دھندلا دھندلا اور تہہ دار اس کے چند مصرے ملاحظہ ہوں :

آسمانوں کی فکر تھی تم کو آگ اگلتی زمیں نہ دیکھ سکے
ساعتِ فیصلہ جب آئی تھی ہاتھ اپنی جگہ پہ سمٹے رہے
وقت ٹکرا کے بڑھ گیا آخر اب ہے کالی دوات الٹی ہوئی

اور ہر آنکھ میں اندھیرا ہے!

یہاں تک آتے آتے جذبات کا وفور حد سے سوا ہو گیا ہے اور شاعری خطابت کے بوجھ تلے سسکنے لگی ہے۔

قیصر شمیم کو شخصیات سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ مثلاً انہوں نے مرحوم شمس الزماں، مہاتما گاندھی، کرنل قذافی کی گود لی ہوئی بچی کی ہلاکت، حریت پسند افریقی شاعر بنجامن مولائز، منصور احمد ملک، پرویز شاہدی کی برسی

www.taemeernews.com

(دو نظمیں)، ڈاکٹر ہری کنور رائے، اپنے استاد پروفیسر نیاز احمد کی یاد میں، قاضی نذرالاسلام کی تہنیت میں، نیلسن منڈیلا کی کلکتہ آمد پر، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی یاد میں، مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کو صدارتی ایوارڈ ملنے پر، مظہر امام کی شادی پر، مظہر امام کی کلکتہ سے رخصت ہونے پر نظمیں کہی ہیں اور گیت لکھے ہیں۔ ان میں بعض خاصے شعری حسن کی حامل بھی ہیں۔ ان کے علاوہ دو نظمیں نئے سال کی آمد پر اور تین نظمیں عید کے موقع پر کہی گئی ہیں۔ شاعر موضوع کے انتخاب میں آزاد ہوتا ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں لگانی چاہیے، مگر یہ بھی سچ ہے کہ ایسی نظمیں وقتی ہوتی ہیں۔ ان کی دنیا محدود ہوتی ہے۔ شاعری تو انجانی دنیا کی بازیافت کا نام ہے۔ موضوعاتی نظموں میں پرویز شاہدی کی آٹھویں برسی پر کہی گئی نظم ایک خوبصورت تخلیق ہے۔ اس کا اصل حسن مصرعوں کی ترتیب سے پوشیدہ ہے۔ ایسی ترتیب جسے پرویز شاہدی کے مزاج کی سیمابیت، فعالت اور بے قراری اپنے آپ ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ ترتیب Concrete نظم کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو :

میں چل رہا ہوں

چل رہا ہوں

میں چل رہا ہوں آج بھی

اسی طرف،

جدھر تری نگاہ تھی

شروع سے آخر تک اسی ترتیب کو قائم رکھ کر انہوں نے نظم کی معنویت اور اس کا حسن بڑھا دیا ہے۔

قیصر شمیم کی فنی انفرادیت ان کی مختصر نظموں اور ان کے خوبصورت گیتوں میں کھلتی ہے۔ نظموں میں "سمندر بے کراں ہے"، "یہ سرد شب ہے"، "دعا مانگو"، "سر راہے"، "ناتمامی"، "آدمی اور آئینہ"، "وہ شام"، "شام غم"، "پرازرپائن کی واپسی"، "دعا"، "پھاگن کی ایک نظم"، "کبھی کبھی"، "وہ چاند تو تم نے دیکھا ہوگا" ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر کا اندرون ہم کلامی کرتا نظر آتا ہے اور پگھلے پگھلے الفاظ، دردآگیں لہجہ پڑھنے والوں کے کانوں میں سرگوشی کرتا ہے۔

"یہ سرد شب ہے" میں تقفس خود شاعر کی ذات کا استعارہ ہے۔ "سر راہے"، "وہ شام"، اور "شام غم" میں اس درد کا ارتعاش ملتا ہے جس سے انسان کا اپنا "میں" عبارت ہے اور جو نہ ہو تو آدمی، آدمی نہ رہے۔ "سمندر بے کراں ہے" میں Abstract کو خوبصورتی سے Concrete کیا گیا ہے اور "پرازرپائن کی واپسی" میں یونانی دیومالا کو نئی معنویت دی گئی ہے۔

www.taemeernews.com

"سراب" دس مصرعوں کی مختصر نظم ہے۔ کسی بچھڑے ہوئے کی اچانک ملاقات کی خوشی اور پھر بچھڑ جانے کا اندیشہ اس کا حقیقی حسن ہے۔ شاعر جانتا ہے یہ ملاقات بھی اندھیرے میں چمک اٹھنے والی ایک چنگاری سے زیادہ کچھ نہیں ہے مگر ہم کلامی کا اشتیاق اور اس کی ناتمامی نے درد کی لذت بڑھادی ہے۔

بعد مدت کے ملاقات ہوئی ہے تم سے — آؤ کچھ دیر کہیں بیٹھ کے ہم بات کریں
کیا خبر پھر کسی منزل میں ملیں یا نہ ملیں — کیا خبر دوسرے دن زیست کہاں لے جائے
کیا خبر کون سا غم اور ہمیں دے جائے — کیا خبر وقت بھلا دے سب کو
دل کے نقشے سے مٹا دے سب کچھ — اور پھر ہم جو ملیں بھی تو نہ پہچان سکیں
آؤ کچھ دیر کہیں بیٹھ کے ہم بات کریں — بعد مدت کے ملاقات ہوئی ہے تم سے

ان مصرعوں کو گہرائی سے انگیز کیا جائے تو معلوم یہ ہوگا کہ بعد مدت ملاقات کا ہونا اہم نہیں ہے اہم یہ ہے اور ناقابل تردید ہے کہ وقت کی جبریت کسی کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے کہ کوئی نہیں جانتا ہے......

"آرتی" میں بھی درد کا شدید احساس پوشیدہ ہے مگر حوصلہ مندی یہ ہے کہ زندگی کی دیوی کا پجاری آرتی اتارتا رہتا ہے۔

"ناتمامی" بھی مختصر نظم ہے۔ یہ ناتمامی فنکار اور فن دونوں ہی کی ناتمامی کا مرثیہ ہے مگر اس ناتمامی میں وہ توانائی ہے جو فنکار کو زندہ اور متحرک بنائے رکھتی ہے :

آڑی ترچھی لکیریں
روز بنایا کرتا ہوں
اپنے آنسو اپنے دل کے خوں سے
ان میں
رنگ آمیزی کرتا ہوں
لیکن وہ تصویر کبھی بنتی ہی نہیں
جو کچھ مجھ سے بول سکے
مجھ کو پورا کھول سکے

فنکار خاص طور پر شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے کبھی کہہ نہیں پاتا۔ الفاظ میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ احساس کو مکمل طور پر ادا کرسکیں۔ لفظوں کے ذریعے شاعر صرف ایک حصہ بیان کرتا ہے تین حصے اندر ہی اندر دھواں

www.taemeernews.com

ا ہو جاتے ہیں۔

بالکل ایسا ہی خیال '' آدمی اور آئینہ'' میں چمکتا ہے۔ یہ صرف ڈھائی مصرعوں کی مختصر ترین نظم ہے مگر دو ہے۔ لیکن اس میں آدمی کو صرف آدمی اور آئینہ کو صرف آئینہ مان لیا جائے تو پھر شاید چنگی بھر نظم ہاتھ آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آدمی فنکار ہے، شاعر ہے، صوفی ہے۔

تلاشِ ذات کا جویا ہے اور آئینہ اور اپنے چاروں دشا پھیلی ہوئی کائنات بھی ہے اور شاعر کا دل بھی۔ یہی نہیں اس میں معانی کا ارتسام یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی اور آئینہ عاشق و معشوق بھی ہو سکتے ہیں، حقیقی بھی اور مجازی بھی اس نظم کی کلید میر کے یہاں تلاش کرنی چاہیے۔

حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا　　　منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا

نظم ملاحظہ ہو :

دونوں اپنے آپ سے پوچھیں\
کیا دیکھا ہے؟\
دونوں گونگے بن جائیں گے

میرا خیال ہے اور شاید غلط نہیں ہے کہ قیصر شمیم کے یہاں شہر کلکتہ اور ان کی ذات کے درمیان کبھی سنجوگ اور کبھی کشاکش کا منظر نامہ ابھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں انقلاب کی تڑپ بھی ہے اور دھیان کا سکون بھی۔

قیصر شمیم کے گیت ہماری شاعری کا خوبصورت سرمایہ ہیں۔ اردو والوں نے اس البیلی صنف میں پتہ نہیں کیوں وہ دلچسپی نہیں لی جس کا تقاضا یہ صنف کرتی ہے۔ در حقیقت غزل ہی کی طرح گیت بھی خوف اور درد کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ وہ گیت بھی جن میں بظاہر خوشیوں کی جھنکار ہوتی ہے، اپنے اندر کرب کی ایک دھیمی آنچ رکھتے ہیں۔ گیت ہمارا تہذیبی ورثہ بھی ہے اور ہماری مٹی کی عطا بھی۔ قیصر شمیم نے یقیناً بہت خوبصورت گیت لکھے ہیں۔ ان میں درد بھی ہے اور جادو بھی۔ درد میں ڈوبی ہوئی اس آواز کو اپنے اندرون میں محسوس کرنا بہت دشوار نہیں ہے کیوں کہ ان کی لسانیات وہی ہے جس سے ہندوستانی تہذیب کی آئینہ بندی ہوئی ہے۔

یہاں چند گیتوں کا ذکر مجھے ضروری محسوس ہوتا ہے ورنہ میری قرأت ادھوری رہ جائے گی اور شاعر کے ساتھ انصاف بھی نہیں ہوگا۔ میں نے پچھلی سطروں میں عرض کیا ہے کہ گیت بھی غزل ہی کی طرح درد کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں خواہ اوپری سطح میں ان پر سرخوشی اور سرشادی اور سرمستی کی جگ مگ دھوپ چاندنی ہی کیوں نہ

www.taemeernews.com

اٹھکھیلیاں کر رہی ہوں۔ قیصر کے گیت میں بھی ان کے کیفیات کے رنگ ابھرتے ڈوبتے دکھائی دیتے ہیں۔

سپنے ٹوٹا ہی کرتے ہیں
دیپک بجھتے ہی رہتے ہیں
آشاؤں کے بجھتے دیپک کیسے کوئی جلائے
کب تک نیر بہائے کوئی، کب تک نیر بہائے
نیر بہانے سے کیا ہوگا
من کی آگ کہاں بجھتی ہے
آنکھوں کا پانی تو من میں اور بھی آگ لگائے
کب تک نیر بہائے کوئی، کب تک نیر بہائے

اور ایک دوسرے گیت میں بنوری کا استعارہ خوبصورت ہے اور گیت کی فضا بندی اور پیکر نگاری کا حسن کا بھی دیدنی ہے۔

میں اک ٹوٹا ہوا ستارہ مجھ میں جوت کہاں
میری اور نہ دیکھ بنوری، میری اور نہ دیکھ
اور بھی تارے چمک رہے ہیں
نیلے نبھ کے آنگن میں
رات اندھیری ہے تو کیا ہے
جگنو بھی ہیں اس بن میں
ان سے لے لے جوت بنوری، ان سے لے لے جوت
میری دیکھ
میری اور نہ دیکھ بنوری، میری اور نہ دیکھ

گیت ہی کے حوالے سے شاعر نے اپنی کائنات میں آرزو اور شکستِ آرزو کے کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے کو بھی اپنی نرم آواز اور مدھم لہجے میں پیش کیا ہے۔ مگر لو لو جھلتی ناتمام آرزوؤں کی زیریں لہروں میں امید کی کرنوں کو زندہ رکھا ہے۔ یہیں قیصر شمیم کی اشتراکیت اور عصری ہوش مندی کا پتہ چلتا ہے۔

www.taemeernews.com

کیا جانے کیسی چھایا کا بستی پھیرا ہے

گھر گھر رات اتر آئی ہے' گھر گھر آج اندھیرا ہے

آؤ دیپ جلائیں سکھی ری' آؤ دیپ جلائیں

آؤ دیپ جلائیں

جانے کب اوشا کا رتھ پھر جیون پتھ پر آئے

جانے کب جیون پھر اپنی جوبن مدرا چھلکائے

جانے کب آشائیں پھر سے گھر گھر جوت جگائیں

آؤ دیپ جلائیں

جب تک رات نہیں کٹ جاتی دیپ جلاتے جائیں گے

جانے کب پردیس سے بالم اس نگری میں آئیں گے

وہ آئیں یا آئے سویرا، جگ جگ نین بچھائیں

آؤ دیپ جلائیں

مندرجہ بالا مصرعوں میں رات بستی، اندھیرا، دیپ، سکھی اوشا رتھ، جوبن، مدرا، جوت، پردیسی، نگری صرف شبد نہیں ہیں ان میں گہری معنویت بھی ہے۔...... معنویت اور رمزیت جس سے غزل اور گیت کا رنگ نکھرتا اور روپ انوپ ہوتا ہے قیصر شمیم نے خوبصورت، بچل اور کول غزلیں بھی کہی ہیں جن پر گفتگو پھر کسی دوسری نشست میں ہوگی۔ اگر وقت نے توفیق اور حوصلہ دیا۔ میری نگاہ میں قیصر شمیم زندہ بہکتے لہو کے شاعر ہیں۔

قیصر شمیم کے دو اشعار

میری آنکھوں میں جو رہتی تھی کبھی

کون اس قوسِ قزح کو دھو گیا

دل کی دھرتی کتنی بنجر ہوگئی

بانجھ پن کا زہر کوئی بو گیا

www.taemeernews.com

عشرت ظفر

کان پور

قیصر شمیم کی نظموں میں تیشہ گری

عمیق و بے کراں سمندر کا لمس قدم سے پایاب ہو جاتا ہے۔ سر بلند کوہساروں کے قلوب سے جوئے آب کا پھوٹ نکلنا، درشت اور بے رنگ چٹانوں کے پردوں سے خدوخال کا طلوع ہونا قیصر شمیم کی شاعری کا خاصہ ہے۔ میں ان کا کلام جس میں غزل و نظم کے علاوہ دیگر کئی اصناف سخن بھی ہیں موقر جرائد میں پڑھتا رہا ہوں لیکن برادرم فراغ روہوی نے (جو ان کے تلامذہ میں سے ہیں) مجھے ان کی نظموں کا مجموعہ "پہاڑ کاٹتے ہوئے" بھجوایا تھا جس کے مطالعہ سے مجھ پر ان کے تیشۂ فکر کی صلابت منکشف ہوئی۔

قیصر شمیم مغربی بنگال جیسی زرخیز اور فنون لطیفہ کی دولت سے مالا مال سرزمین کے معروف و کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے تلامذہ کی تعداد خاصی ہے۔ ظاہر ہے کہ زبان و فن پر عبور ہی نو واردان شہرِ ادب کو ان کے قریب لاتا ہے اور تشنگانِ علم سیرابی سے ہم کنار بھی ہوتے ہیں۔ میں قیصر شمیم سے کبھی ملا نہیں ہوں لیکن ان کی شاعری میں ان کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں کو سمجھ پایا ہوں۔ الفاظ و خطوط کے آئینۂ دل آرا میں جو کرب بھی انعکاس پذیر ہوتا جو ان کی روح کی گہرائیوں میں پل رہا ہے۔ کلکتہ جیسے کثیر آبادی والے شہر میں ان کی بود و باش زندگی کے متنوع مناظر تک آنکھوں کی رسائی، غریبی، امیری، کرب و نشاط، ظاہر ہے کہ ایک حساس شاعر کہاں تک خاموش رہ سکتا ہے۔

قیصر شمیم نے اس زمانے میں شعر گوئی کا آغاز کیا جب ترقی پسندوں کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی، اس سے متاثر بھی ہوئے لیکن اس شاہراہ پر زیادہ چل نہیں سکے کیوں کہ زندگی ان کے فن سے جو تقاضے رکھتی تھی اسے نعروں سے پورا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب کے دیباچے بعنوان "دائرے" میں لکھا بھی ہے :

> "مجھے یاد ہے کہ کالج کے دنوں ہی میں مَیں کلکتے کی انجمن ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی کے قریب آ گیا تھا اور دونوں کے جلسوں میں شرکت کرتا تھا۔ ان جلسوں کے علاوہ ترقی پسند ادب کے مطالعے نے ادب، زندگی اور سماج کے رشتوں اور ان رشتوں کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ذہن میں وقتاً فوقتاً ابھرنے

www.taemeernews.com

والے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کے لیے ایک نئی راہ دکھائی تھی لیکن اس زمانے میں بھی میں کسی نظریے کے دیوتا کو خوش کرنے کے لیے ادب کے حسن اور اظہار کی آزادی کو بھینٹ چڑھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس ادب میں مقصدیت وادبیت کے درمیان نیز اجتماعیت وانفرادیت کے درمیان معتدل تناسب وتوازن کا خیال رکھنا مجھے زیادہ پسند تھا۔ اپنے اسی ذہنی رویے کے ساتھ میں نے ہمیشہ ادب کے نئے نئے رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور ان میں ادب وزندگی کے لیے مجھے جو کچھ قابل قبول نظر آیا ہے اس کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔''

میں محسوس کرتا ہوں کہ قیصر شمیم جیسے جیسے شاہراہ فن پر سفر کرتے گئے، نئی نئی درخشاں اور منور مشعلوں نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا، ان کی روشنی کو زاد سفر کے طور پر ساتھ لے کر وہ کوہساروں کے جہان بسیط میں وارد ہوئے اور پھر ایک ایسے کام میں منہمک ہوئے کہ نہ انھیں نجات ملی اور نہ انھوں نے حصول نجات کی سعی کی۔ سبب شاید یہ تھا کہ کبھی ضرب تیشہ سے جوئے آب برآمد ہوئی اور کبھی جہان خدوخال نظر آیا۔ یہ مناظر اس قدر دلچسپ تھے کہ وہ نکلے تو کوہ کنی کے ارادے سے تھے لیکن آذری کے فن میں بھی طاق ہو گئے۔

''پہاڑ کاٹتے ہوئے'' ایک سو ساٹھ صفحات کی کتاب ہے۔ اس میں کم و بیش ۸۳ نظمیں اور گیت ہیں۔ ان میں ایسی نظمیں بھی ہیں جو عقیدت، محبت اور فن سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں مثلاً مہاتما گاندھی، بنجامن مولائز، نیلسن منڈیلا، نذرالاسلام، پرویز شاہدی، پریم چند، عبدالرزاق ملیح آبادی، یا پھر شمس الزماں، قمر اعجاز کنڈوی جیسی شخصیات کے لیے شاعر نے جس وقت جیسا تاثر محسوس کیا ہے اسے سپرد قلم کیا ہے اور اس تیشے سے طرح طرح کے دریا فکر کی چٹانوں سے نکالے ہیں۔

کتاب کے شروع میں ثنا، سجدہ، حرا سے پوچھو جیسی نظمیں ہیں یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ سے عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے لیکن اس لہجے میں بھی روح کا کرب نمایاں ہے اور اس طرح درخشاں ہے گویا برگ گل پر قطرۂ شبنم۔ اس کتاب میں بھی جن نظموں نے متاثر کیا وہ ہیں، ۲ سواں پہاڑ کٹنے کے بعد، کل آج کل، سنگ ناتراشیدہ، زیر دیوار، سمندر بے کراں ہے، قیصر شمیم کے یہاں تاریخی واقعات کو تمثیلی طور پر پیش کیا گیا ہے اس طرح کہ وہ اپنے عہد کا استعارہ بن گئے ہیں۔ ان واقعات پر قدامت کی دبیز گرد نہیں ہے بلکہ شفاف پردوں سے عصری کرب رنگ فشانی میں مصروف ہے۔

قیصر شمیم کے یہاں ماضی کا ذکر ہے مگر گزرے ہوئے لمحات کا نوحہ نہیں ہے، وہ ایک بلند مقام پر

www.taemeernews.com

کھڑے ضرور ہیں مگر لہجے میں خطابت نہیں بلکہ انداز رت آمیز ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے خواب دیکھنے میں ایک عمر بسر کی ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ صرف ذات کے پیچاک الجھے ہوں۔ ان کے اسلوب و بیان میں اجتماعیت ہے لیکن کسی رجحان کی نہیں بلکہ تخلیقی وفور کی پابند ہے۔ خود کلامی ہے مگر واحد متکلم کی ضمیر کے ساتھ ایسا نہیں کہ قافلۂ رنگ و نور کے گزرنے کے بارے میں انھوں نے سنا ہو بلکہ وہ قافلۂ رنگ و نور کے گزرنے کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ قافلۂ نو بہار اسی دشت میں ٹھہرے گا جہاں نسلِ آدم بود و باش پذیر ہے۔ اسی لیے وہ نسیم کو مشورہ دیتے ہیں کہ جرسِ غنچہ کی صدا پر اپنے سفر کو جاری رکھے۔ ان کی نظم "نئے کوہ قاف کی کھوج میں" میں بھی یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی ابھر کر سامنے آئی ہے۔

قیصر شمیم کے ہاں لفظیات کے انتخاب میں بے حد وسیع النظری ہے۔ اردو ہندی الفاظ کا خلاقانہ استعمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اساطیری کرداروں کا بہت واضح بیان ہے اور کہنہ خد و خال کی یہ چمک دمک ماضی کی بازیافت کے عمل کو مکمل کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

"مہ و سال کتنے گزر گئے

کئی راستے، کئی پیچ و خم / کفِ پا سے لے کے خراجِ خوں
ہوئے خوش تو اور سنور گئے / مگر آگہی ان سے نہ خوش ہوئی
نہ ٹھہر سکی نہ چمک سکی / مہ و سال دوشِ ہوا پہ تھے
وہ ستم ستم کئی راستے، وہ الم الم کئی پیچ و خم
تھے اپنے ساتھ گزر گئے / ہمیں دے گئے
نئی ساعتوں کے دیار میں / نئی رہ گذر، نئے پیچ و خم
نئے منظروں کی نمائشوں میں گھرے ہوئے نئے بام و در
نئی کلفتیں، نئی حسرتیں، اسی ہاؤ ہو کے مقام پر
اسی ہاؤ ہو کے مقام پر / نئے حوصلوں کا ہے امتحاں
نئی منزلوں کے جو خواب ہیں
نئے کوہ قاف کی کھوج میں، کہیں گم نہ ہوں کبھی گم نہ ہوں
ابھی مرحلے کئی اور ہیں / ابھی مسئلے کئی اور ہیں

(نئے کوہ قاف کی کھوج میں)

www.taemeernews.com

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
بھاگل پور

قیصر شمیم کی نظمیہ شاعری میں تخلیقی آگہی

انسان جس ماحول میں جی رہا ہے وہ فطرت سے متعلق ہے۔ فطرت کا حسن مجرد شکل میں، کثرت میں وحدت اور مختلف اور متضاد اجزا کی ہم آہنگی ہے۔ ظاہری شکل میں یہ ہیئت کا جوہر ہے اور جامد صورت میں شکل کے تناسب پر منحصر ہے۔ لیکن زندہ اور متحرک شے میں حسن محض شکل کا تناسب نہیں ہے جو ہیئت کا احساس پیدا کر سکے اور نہ وہ اپنے سوا کسی دوسری چیز کا تابع ہے۔ یہ ایک ناخوش گوار شے میں بھی ہوسکتا ہے۔ یہ تلازمے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی احساسِ جمال، تلازمے یا رابطے کے ٹوٹنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ مختلف افراد اور اقوام کے لیے مختلف نہیں ہوتا جیسا کہ عام خیال ہے۔ اور نہ اچھے تندرست یا مفید کے تصورات سے مربوط ہے۔ احساسِ جمال وجدانی ہے اور حسن وہی ہے جو مفاد سے غیر متعلق ہوکر اور اس کے برخلاف ہوکر بھی انبساط پیدا کرتا ہے۔

فطرت میں فراست، انسانی فراست سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ منصوبہ اور تکمیل ایک ہی لمحے میں انجام پذیر ہوجاتے ہیں، خیال اور پیداوار ایک ہوجاتے ہیں یا ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ مگر کوئی معکوس عمل نہیں ہوتا لہٰذا کوئی اخلاقی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

جب ہم قیصر شمیم پر نظر مرکوز کرتے ہیں تو ان کے یہاں فکر آزادی اور انتخاب دونوں پاتے ہیں۔ اس لیے بھی کہ وہ کائناتِ فطری کے امام ہیں۔ فطرت کی چیزوں میں آئینے کی طرح تمام ممکن اجزا، منازل اور ذہنی طریق کار (جو شعور کے بعد کی کڑیاں ہیں) اور شعوری عمل کے مکمل ہونے تک بھی سلسلے ان کے یہاں ملتے ہیں۔ اور ان کا دماغ ذہن کی ان تمام فکری کرنوں کا مرکز نظر آتا ہے جو فطرت اور معاشرے کی تصویروں میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں۔

ہر ایک فن پارے میں خارجی کا داخلی کے ساتھ میل ہوتا ہے۔ شعور کا شعور پر اس طرح مستولی ہوتا ہے کہ اسی میں جھلک اٹھتا ہے اور ان دونوں کو جو ملا لیتا ہے وہی جوہر قابل کہلانے کا مستحق ہے اور اسی سبب سے اسے ان دونوں میں شریک ہونا چاہیے لہٰذا جوہر قبل خود ایک غیر شعوری عمل سے گزرتا ہے۔ ایسا اس لیے

www.taemeernews.com

ہوتا ہے کہ اگر اس نے محض دردناک نقالی شروع کی تو وہ صرف نقابیں تخلیق کرے گا کوئی زندہ سانس لیتے پیکر تخلیق نہ کر سکے گا جو آزادی اور قانون کو ہم آہنگ کر سکے۔

لیکن شاعر کا ذریعۂ اظہار الفاظ ہیں، خواہ وہ عام ہوں یا انوکھے یا تشبیہی ہوں یا زبان کی ان مختلف تبدیلیوں اور جدتوں سے آراستہ ہوں جن کے استعمال کا شاعر کو حق ہے۔ فارم بنتا اور بگڑتا رہتا ہے لیکن ہر زبان، اپنے قوانین اور اپنی پابندیاں بھی نافذ کرتی رہتی ہے، اپنے طور پر آزادی کی اجازت بھی دیتی ہے اور بول چال کے اپنے لہجے اور آواز کے سانچے کو پیش کرتی ہے، زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں ترکیب نحوی، وسعت، تلفظ، لہجہ اور ایسی چیزیں ہیں جنھیں شاعر کے لیے قبول کرنا ضروری ہے۔

قیصر شمیم مختلف النوع خیالات کے اظہار میں احساس و جذبات کے ارفع مدارج پیدا کر کے زبان اور ساخت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔

قیصر شمیم کا تجربہ ہفت رنگ ہے لیکن مختلف واردات اور مختلف موضوعات کے اظہار کا ذریعہ انھوں نے نظم کو بنایا ہے، جس میں کیفیت اپنی ساخت خود لے کر آتی ہے۔

قیصر شمیم کی نظموں میں روابط اور رشتوں کی نوعیت سے سوچ کا نظام بدلتا ہے اور اظہار کے نئے نئے پیمانے اور سانچے سامنے آتے ہیں جو پابند بھی ہیں اور آزاد بھی ہیں۔

پابند نظم میں تجربہ کرتے وقت قیصر شمیم کی زبان کی ہیئت، ساخت، فطرت، بساط، امتیازی خصوصیات اور لطافت، رنگینی، دل آویزی اور اثر آفرینی کا لحاظ رکھتے ہیں، نازک ترین واردات و کیفیات کی موثر تصویر کشی کرتے ہیں، بحر میں موثر زحافات کے امکانات بروئے کار لاتے ہیں اور تواتر و تسلسل کے ساتھ آہنگ کے بہاؤ کا خیال رکھتے ہیں

ہاتھوں پہ میرے برف کی بارش ہوئی مگر
یہ ہاتھ ہی رکے نہ مرا تیشہ ہی رکا
بتیسویں پہاڑ کی چوٹی بھی کٹ چکی
لیکن وہ آرزو، وہ طرح دار آرزو
جس کو کھلی فضا کا تجسم پسند ہے
آزاد پنچھیوں کا ترنم پسند ہے
جس نے مری حیات کا نقشہ بدل دیا

www.taemeernews.com

جس سے مری رگوں میں لہو آگ بن گیا
جس نے دی میرے ہاتھوں کو تیشے کی زندگی
پتھر جو کاٹ ڈالے وہ شیشے کی زندگی

(۳۲واں پہاڑ کٹنے کے بعد)

ایک اور اقتباس دیکھیے :

ایک صدیوں پرانے معبد کو
کر کے تبدیل ایک ملبے میں
آج ہیں خوش بہت وہ بازی گر
جن کا مذہب فریب کاری ہے
ساتھ جن کے ہے ایک ایسی فوج
جس کی آنکھوں میں روشنی کی جگہ
خواب ہے ایک جھوٹی جنت کا!
کون سمجھائے ایسے اندھوں کو؟
ایک معبد جو سنگ و خشت کا تھا
کر کے مسمار اس کو خوش کیوں ہو
اصل معبد ہر ایک دل میں ہے

(کل اور آج)

اپنے دور میں، اپنے معاشرے میں، ایک خاص معاشی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی فضا میں قیصر شمیم کا ذہن تشکیل پاتا ہے۔ ان کے مشاہدات و تجربات، جذبات و خیالات، نظریۂ حیات اور ذہنی پرداخت ان کی نظموں میں، ماحول اور گرد و پیش کے حالات پر مبنی ہوتے ہیں

کھردرے ہاتھ کیوں ہیں بے حرکت
روئے سنگیں ہے تیرا کیوں خاموش
بول کچھ بول، ورنہ کوئی یہاں
خاموشی کو سمجھ نہیں سکتا

www.taemeernews.com

جنبشِ لب ہی کام آتی ہے
دل کی دھڑکن کوئی نہیں سنتا
بول اے سنگِ ناتراشیدہ
تیری خاموش دھڑکنوں کی طرح
روم یونان کے صنم کتنے
تیرے پہلو میں کسمساتے ہیں
حسن ہیں دفن تیرے سینے میں
ایلورا کا یا اجنتا کا
یا کوئی روپ اور کلا کی بہار
تیرے پہلو میں سو رہی ہے ابھی
بول اے سنگِ ناتراشیدہ
تیرے ہونٹوں کو رسماتا ہے
روئے سنگیں نکھارنے کے لیے
تو کو اب بلاتا ہے
(سنگِ ناتراشیدہ)

مندرجہ ذیل اقتباس میں درد کی لہر محسوس کی جا سکتی ہے

جب میں آنکھیں بند کروں گا
تم خود میری آنکھیں بن کر
دنیا کا چہرہ دیکھو گے
بھید ہر اک منظر کا تم بھی
اپنی نظروں سے کھولو گے
میرے لب تو بند رہیں گے
لیکن جب بھی وقت آئے گا
میری طرح تم بھی بولو گے

www.taemeernews.com

اپنوں سے بیگانوں سے
دل پر جب جب زخم لگیں گے
میری طرح تم ان زخموں پر
ہنس لو گے یا پھر رو لو گے!
(کیا تم کوئی پرچھائیں تھے؟)

قیصر شمیم فراق، تیاگ اور داخلی کرب کی بھی کہانی سناتے ہیں جس میں درد و گداز اور تخیل کی کارفرمائی ہے۔ خلش، وسوسہ اور غم و یاس کی کیفیت ہے، لیکن اظہار میں تہذیب اور متانت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ دلی جذبات کو سیدھے سادے اسلوب میں زیادہ موثر بنا کر پیش کرتے ہیں:

اوشا کی مسکانیں میری آنکھوں سے رہتی ہیں دور
سندھیا اپنے دیپ جلائے کترا کر بڑھ جاتی ہے
رات ہے کیسی' دن کیسا ہے' کچھ معلوم نہیں ہوتا
اس پنجرے میں ہر شے اپنی رنگت کھو کر آتی ہے
چاند کی ٹھنڈی کرنیں میرے پاس نہیں آتیں
پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آتے ہوئے گھبراتی ہے
اپنے پنجرے میں رہتا ہوں میں کیسے یہ مت پوچھ
آتی جاتی سانس بھی اپنی ناگن کو شرماتی ہے
(میرا کمرہ)

زندگی کے مختلف مظاہر، واقعات اور تصورات کو عقلی کسوٹی پر پرکھنے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے

جب کبھی میرے تپتے جسم کے ساتھ
کوئی جھونکا ہوا کا لپٹا ہے
جب کبھی میری جلتی آنکھوں کو
سایۂ زلف یاد ہے
جب کبھی میرے خشک ہونٹوں پر
اپنی ہی آنکھ سے چھلکتے ہوئے

www.taemeernews.com

اشک کا کوئی قطرہ پہنچا ہے
میرے دل کو ہوا ہے یہ گماں
کسی ویران سے جزیرے میں
کوئی آسیب رکھ گیا ہے مجھے!
(کبھی کبھی)

قیصر شمیم کی نظمیہ شاعری کا وافر سرمایہ آزاد نظم میں ہے :

آزاد نظم کو انگریزی میں Free Verse کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح فرانسیسی سے انگریزی میں آئی۔ انگریزی میں معروف شاعرہ Amy Lowell نے آزاد نظم پر بھرپور توجہ دی اور اس کے لیے بعض ضوابط متعین کیے۔ اس نے تجربے کے بعد محسوس کیا کہ آزاد نظم کا عضوی آہنگ عروض کے اصولوں پر نہیں بلکہ بولنے والی آواز کے آہنگ پر قائم ہوتا ہے۔ اس نے عروضی پیمائش کو نظر انداز کرتے ہوئے Accents کے درمیانی وقت کی اکائی کو تنظیمی اصول قرار دیا۔ اسی اصول پر عمل کرنے والے رچرڈ، آلڈنگٹن، ایف ایس فلنٹ اور گاؤلڈ فلیچر وغیرہ ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک قافیہ اور بحر آزاد نظم کے لیے ضروری نہیں ہیں کیوں کہ یہ صرف شعر کے سانچے مہیا کرتے ہیں جب کہ جذبہ کا آزادانہ اظہار اپنی ہیئت خود پیدا کرتا ہے۔ ڈی ایچ لارنس اور والٹ وٹمن کا بھی یہی نظریہ تھا۔ البتہ ایذرا پاؤنڈ کا نظریہ آزاد نظم کے سلسلے میں ذرا مختلف تھا۔ اس نے مقداری عروض (Quantitative Measure) کا استعمال کیا اور موسیقی میں آوازوں کی ترتیب کے اصول کو رہنما بنایا۔ اس نے Stress کو جزو قرار دیا اور آہنگ کا تعین کیا۔ وہ ایلیٹ کے اس خیال سے متفق نہیں تھا کہ بحر کا تعین Accents سے ہو۔ ایلیٹ کا کہنا تھا کہ شاعر یا تو کوئی سیدھی سادی بحر مثلاً Iambic Pentameter منتخب کرلے اور ضرورت کے مطابق اس سے انحراف کرتا جائے۔ یا پھر ایسے مصرعے لکھے جو کسی بحر کے قریب پہنچتے ہوں۔

جہاں تک اردو میں آزاد نظم کا تعلق ہے اردو اور انگریزی کے نظریہ عروض میں فرق ہے۔ انگریزی میں آزاد نظم نے ارکان کی ترتیب کے قدیم اصولوں کو خیر باد کہہ کر آواز کے زیر و بم کے اصول کو اپنایا۔ اس زیر و بم کو بھی جذبہ کے داخلی دباؤ کا تابع رکھا اور لہجہ کی تاکیدوں کے فطری اور نحوی ترتیب کو بدل کر داخلی آہنگ کے دباؤ اور حرکت کے تحت نیا آہنگ تخلیق کیا اور مصرعوں کی لمبائی اور اختصار میں فرق رکھا۔ مگر اردو میں لہجہ کی تاکیدوں کا کوئی نظام نہیں ہے۔ آواز کے وقفوں اور شدت کا بھی وہ انداز نہیں جو انگریزی زبان کی خصوصیت ہے۔ اسی لیے اردو میں آزاد نظم بحر سے آزاد تو ہوگئی مگر وزن سے آزاد نہیں ہوسکی۔ آزاد نظم کے قدیم اور جدید علم برداروں نے کسی نہ کسی

www.taemeernews.com

بحر کے مخصوص وزن کے ارکان کی مختلف ترتیب سے آزاد نظم کی تشکیل کی ہے۔ البتہ ارکان کی ترتیب کو بنیادی خیال یا جذبہ کا تابع رکھنے کی کوشش ضرور ہوئی ہے اور ارکان کو جذبے کے بہاؤ اور بہاؤ کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی کوشش بھی کی گئی ہے جس سے آزاد نظم کے مصرعوں میں خیال کے مطابق ارکان کی تعداد مختلف نظر آتی ہے۔ ارکان کی تعداد اور ترتیب جذبہ و خیال کی لہروں کے جس قدر تابع ہوتی ہے اسی قدر نظم میں ہیئت کی تکمیل نظر آتی ہے۔

قیصر شمیم نے ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظم میں جو تجربے کیے ہیں ان کی افادیت اور اہمیت مسلّم ہے لیکن ان کے موضوعات بھی کم اہم نہیں ہیں

درد نہ گورا، درد نہ کالا
درد نہ ہندو، درد نہ مسلم
درد جہاں ہو جس دل میں ہو
درد ہی اس کا نام
دل میں رہنا، دل کو ستانا، جگ میں اس کا کام
درد ہی اس کا نام

آنسو پورب، آنسو پچھم
آنسو اتر، آنسو دکھن
دیش دشا کا بھید نہ مانے
آنسو کوئی دھرم نہ جانے
آنسو چاروں دھام
دکھ سکھ کا کچھ حال سنانا جگ میں اس کا کام
آنسو چاروں دھام

ہونٹوں پر مسکان کھلے تو
روپ نہ دیکھے، رنگ نہ دیکھے
نام نہ پوچھے، ذات نہ پوچھے

www.taemeernews.com

کوئی نر ہو یا ناری ہو
عمر بڑی ہو یا چھوٹی ہو
سب کے لیے اس کی شوبھا ہے
صبح رہے یا شام
سب کے من میں جوت جگانا جگ میں اس کا کام
صبح رہے یا شام
سب کے لیے ہیں جگ میں تینوں......درد، آنسو، مسکان
کاش یہی اک بات سمجھ لیں آج کے ہم انسان!

(درد، آنسو، مسکان)

درد، آنسو اور مسکان کی برق سے ہیروشیما جلا تھا اور ناگاساکی روئی کا گالا بنا تھا۔ نفرت کی بھٹی میں جلنے اور شب خون مارنے کی کہانی اس تین لفظ میں پیوست ہے کیوں کہ تہذیب ماضی میں پوشیدہ ہے تو دوسری طرف حریت پسند افریقی شاعر بنجامن مولائز کو پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے۔ یہ ستم ظریفی اور وقت کی کروٹ نہیں تو اور کیا ہے :

شکاریوں کے درمیاں
گھری ہوئی ہے نیل گائے
لہولہان ہے بدن
شکاریوں کے دانت بھی لہو کی طرح سرخ ہیں!
مگر عجب ہے نیل گائے
کہ اس کی آنکھ میں نہ کوئی خوف ہے نہ بے بسی
ہے آج اس کے سامنے اسی کے ایک بچھڑے کا جوان تن پڑا ہوا
شکاریوں کی رسموں کی داستاں بنا ہوا!
اسی جوان بچھڑے کے لبوں کی آخری صدا
فضا میں آج گونجتی ہے دور تک :
شکاریو،
نجات نیل گائے کی قریب ہے

www.taemeernews.com

قریب ہے نجات نیل گائے کی

شکاریو،

یہ دیکھ لو کہ نیل گائے کے تمام ٹکڑوں میں

ہے جوش انتقام کا

انھیں اب اپنی گولیوں سے روکنے کی کوششیں فضول ہیں!

(نیل گائے)

آج کا منظر نامہ خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ آج کا معاشرہ لہولہان ہے۔ ایسے میں قیصر شمیم امید یں جگاتے ہیں اور اپنے حساس دل اور ذہن کے ساتھ ہر پل کرب کی زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے اپنی محبوبہ کے لب کو غزل کا مصرعہ نہیں کہتے۔ عارض کو گلاب، چشم میگوں کو مے کدہ اور سراپا کو تاج محل نہیں کہتے ہیں بلکہ ان کے پیش نگاہ یہ سب کچھ ہے :

آج تو ہم سب دیکھ رہے ہیں

پھولوں میں تیزاب کی بو ہے

پتوں میں گندھک کی مہک ہے

ڈالی ڈالی آگ بھری ہے

جیبوں پر ہیں خون کے دھبے

آنکھوں میں ہے زہر کا پانی

سب کی نظریں بجھی ہوئی ہیں

لمبی ہے یہ دکھ کی کہانی

(یہ سپنا کب پورا ہوگا)

آج حالات پل پل یوں کروٹ بدلتے ہیں اور زیست کی لکیریں اتنی ٹیڑھی ترچھی ہوگئی ہیں کہ مدت کے بعد ملاقات ہونے پر قیصر شمیم یوں اظہار خیال کر پاتے ہیں

بعد مدت کے ملاقات ہوئی ہے تم سے

آؤ کچھ دیر کہیں بیٹھ کے ہم بات کریں

کیا خبر پھر کسی منزل میں ملیں یا نہ ملیں

www.taemeernews.com

کیا خبر دوسرے دن زیست کہاں لے جائے

کیا خبر کون سے غم اور ہمیں دے جائے

کیا خبر وقت بھلا دے سب کو

دل کے نقشے سے مٹا دے سب کچھ

اور پھر ہم جو ملیں بھی تو نہ پہچان سکیں

(سرِ راہے)

بے یقینی کی اس فضا میں حیاتِ نو کی شمع جلانے کے لیے قیصر شمیم جہاں تہاں بھٹک رہے ہیں۔ وہ مفاہمت بھی کرنا چاہتے ہیں لیکن ہر پل انھیں محسوس ہوتا ہے کہ :

آڑی ترچھی کتنی لکیریں

روز بنایا کرتا ہوں

اپنے آنسو، اپنے دکھ کے خون سے

ان میں

رنگ آمیزی کرتا ہوں

لیکن وہ تصویر کبھی بنتی ہی نہیں

جو کچھ مجھ سے بول سکے

مجھ کو پورا کھول سکے

(ناتمامی)

لیکن اس سے زیادہ کرب ناک وہ حالات ہیں، وہ کرچیاں ہیں جن کے درمیان صعوبتیں ہیں اور صرف سوالیہ نشان ہیں

اس کے تپتے جیون کی اب پیاس بجھا سکتا ہے کون؟ جانے کب سے بھٹک رہا ہے راہ دکھا سکتا ہے کون؟

کیوں کہ :

اس کے تپتے جیون میں شاید کوئی برسات نہیں

(سندیسہ)

قیصر شمیم کی نظموں میں بے پناہ خلش ہے۔ ایک مسلسل تلاش ہے۔ ایک پیہم جستجو ہے۔ آرزوؤں کا

www.taemeernews.com

سوز ہے اور تمناؤں کا گداز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر نظموں میں وہ ماضی کے واقعات پر بھی صراحتاً اور اشارتاً روشنی ڈالتے ہیں اور حال کو بھی بے پناہ انداز میں اجاگر کرتے ہیں :

فضا ہے زہر آلودہ
میں سانسیں لوں تو کیسے لوں
میں اندر اور باہر سے
بہر صورت پریشاں ہوں
کہ جینے کی تمنا میں
یہاں ہر روز مرتا ہوں!
سنا ہے شہر چمپی میں
سیہ کاری کی شب جب بڑھ گئی حد سے
تو بجز کا کوہ چمپی کا
صفایا ہو گیا پھر کالے کرتوتوں کی دنیا کا

(دعا مانگو)

قیصر شمیم کی نظمیں اجتماعی کشمکش کا عکس پیش کرتی ہیں، پرانی اور نئی روشنی کی نئی صورتوں کی جنگیں ان میں نظر آتی ہیں اور حال کے بے حد اہم بنیادی مسئلے اور اہم پہلوؤں کی سرگرمی دکھائی دیتی ہے۔ الجھے دور کی بے سکونی کو پیش کرنے میں انھوں نے جس دل سوزی اور جگر کاری سے کام لیا ہے یہ ان کے فن کا کمال ہے۔ ہر نظم میں ایک کہانی کہتے ہوئے قیصر شمیم سوچ تہہ نشیں کی صورت پل پل تہذیبی پیش رفت میں شعور اور لاشعور سے کام لیتے ہیں۔ وہ مینا کاری کے قائل نہیں بلکہ ان کا بنیادی آہنگ رجز کا ہے جس میں خود اعتمادی ان کی اپنی بے پایاں تخلیقی اور پیداواری صلاحیتوں کی آگہی سے پھوٹتی ہے۔

قیصر شمیم کی نظموں میں ان کے اپنے تجربے ہیں، مشاہدے ہیں، گرد و پیش کے دائرے ہیں اور جذبوں کی تہذیب ہے۔!

www.taemeernews.com

ڈاکٹر مولا بخش اسیر
دلی

جیون پتھ پر قیصر شمیم کی نظمیہ لکیریں

"رُکا ہتے ہوئے"، "ساعتوں کا سمندر"، "سانس کی دھار" جیسے شعری مجموعوں کے خالق قیصر شمیم کی پیدائش ۱۹۳۶ء میں ہوئی یعنی اس وقت جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی گئی جس کے ذریعہ نظم آزاد اردو کی شعری روایت کا حصہ بنی اور بعد میں جدیدیت نے ترقی پسندی سے بغاوت کے لیے بھی اس مخصوص ہیئت کو اپنایا تھا۔ قیصر شمیم کی آنکھوں نے ادب کی تین تحریکوں کو دیکھا ہے لیکن ان پر ان میں سے کسی بھی تحریک کا براہ راست اثر دکھائی نہیں دیتا لیکن ترقی پسند تحریک کا خاموش اور غیر محسوس اثر ان کی نظموں پر ضرور ہے۔ جدیدیت کے ذریعے پیش کردہ تنہائی کے ایجنڈے پر تو قیصر شمیم نے اپنی نظم "تنہائی" میں کچھ ایسے خیالات پیش کیے ہیں کہ تنہائی کا فرسودہ تصور بے نقاب ہو کر رہ گیا ہے۔ تنہائی کی گرد میں اس سے زیادہ خوبصورت نظم ابھی تک میری نگاہ سے نہیں گزری۔ نظم ملاحظہ فرمائیں :

رشک آتا ہے مجھے ان دوستوں پر
بھیڑ میں رہتے ہوئے جو بھیڑ کا حصہ کبھی بنتے نہیں ہیں
اور اپنے جذبۂ بیگانگی کو
خوبصورت نام "تنہائی" کا دے کر
اک طلسماتی فضا میں
اس طرح اب جی رہے ہیں
جیسے یکتائی کا درجہ
ان کی تنہائی نے ان کو دے دیا ہو
کیا غضب کی بیانا ہے
جس نے ان کی حسیت کو خود پرستی کے نئے معنی سکھا کر

www.taemeernews.com

بھیڑ میں بھی ایک اونچی سطح پر رکھا ہے ان کو

''تنہائی'' سے ص ۴۴-۴۵

قیصر شمیم اس نظم میں اپنا منفرد تجربہ بیان کرتے ہیں :

میں رہوں یا اپنے آنگن کے کسی گوشے میں بیٹھوں

بھیڑ بھی چھوڑ کر جاتی نہیں ہے

شہر کوچے گاڑیوں کی ریل پیل

دفتر و بازار سانسیں تیز تیز

بھیڑ جڑ رہتی ہے باہر صبح و شام

میرے گھر میں بھی وہ آکر گھیر لیتی ہے مجھے

ایسے عالم میں اگر چاہوں کہ پل بھر کے لیے

تنہا رہوں میں

تو یہی احساس ہوتا ہے کہ شاید

دوسرے پل ہی نہ بن جاؤں وہ چیز

اپنی جڑ سے جو اکھڑ کر رہ گیا ہے!

یعنی قیصر شمیم کو یہ احساس ہے کہ انفرادیت پسندی ہماری تہذیبی پہچان نہیں بلکہ ہندستانی تہذیب کی جڑیں اجتماعیت پسندی میں پیوست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متن کو پڑھتے ہوئے یکسانیت کا احساس نہیں ہوتا۔ قیصر شمیم ایک کہنہ مشق اور نئی نسل کے کئی قابل ذکر شاعروں کے استاد ہیں اس لیے ان کی شاعری میں کہیں کہیں شعریت کا فقدان تو ہے مگر استاد شعرا کا رنگ ضرور ہے۔

''پہاڑ کاٹتے ہوئے'' مجموعے کے بیک کارڈ پر آئندہ کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''لفظ بولتے ہیں'' کا ذکر ہے۔ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیصر شمیم معنی پر لفظ کو ترجیح دیتے ہیں یعنی وہ Logocenterism یعنی لفظ مرکزیت کے قائل ہیں۔ مشرقی شعریات کے بیشتر اسکالر اسی نظریے کو مانتے ہیں لیکن سنسکرت اور فارسی و عربی کے بہت سے ادیبوں نے اس نظریے کی رد بھی پیش کی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ لفظ نہیں بولتے وہ نظام بولتا ہے جس نے لفظوں کے معنی متعین کیے ہیں۔ لفظ ایک ہیئت ہے جیسے نظم یا غزل اور ہیئتیں تب ہی کارگر ہوتی ہیں یا خود کار ہوتی ہیں جب شاعر اسے موضوع اور اسلوب سے آشنا کرتا ہے۔ کئی دفعہ شاعر کے برتاؤ سے ہی بنائی زبان اور

www.taemeernews.com

ہیئتیں جو مرا کر ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔ ہیئت یا لفظ صدیوں کا اجتماعی حافظہ ہے۔ روایت ہے اور ادب کے متون اس روایت کے اعتبار سے ہی معنی دیتے ہیں۔ شعرا عہد اور ما قبل عہد کے شعرا اور ان کی شعری روایت سے متاثر ہوتے رہے ہیں مثلاً قیصر شمیم نے اپنی نظم ''سجدہ'' میں یہ انکشاف کیا ہے کہ

سلیقہ میرؔ کی مانند
ناکامی سے اپنی کام لینے کا
سکھایا ہے

میر کا مصرعہ '' تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا '' کو اپنی نظم میں دوبارہ خلق کرنا دراصل فنکار کو آئیڈیل بنانا ہے۔ قیصر جانتے ہیں کہ ہندستان کی ان گذشتہ صدیوں میں لفظ سلیقہ پر میر کا ہی جیسے قبضہ ہو گیا ہے۔ لفظ سلیقہ میں سلیقے کے معنی اسی لفظ کی ہیئت حرف وصوت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس سماجی سیاق اور معاہدے کا زائیدہ ہے جس پر میرؔ نے کچھ زیادہ ہی اثر ڈالا ہے۔

میر کے مصرعے کو چھوٹے چھوٹے نحوی واحدوں میں توڑ کر اسے نظم کی مصرعہ جاتی تنظیم میں ڈھالنا یعنی متن سے متن بنانا ایک ادبی سچائی ہے یعنی بین متنی فضا کا پایا جانا ادب کا مقدر ہے۔ شاعر اپنے ما قبل متون کے ریشوں سے اپنے متن کو اجتماعی حافظے کا نشان بناتے ہیں اور اس کے معنوی سیاق کو تقابل کے ذریعے اور زیادہ معنی خیز بناتے ہیں۔ پرویز شاہدی کی ایک غزل کا شعر ہے :

کتنے اصنام نا تراشیدہ   پتھروں میں ہی کسمساتے ہیں

قیصر شمیم کی نظم '' سنگ ناتراشیدہ '' میں پرویز شاہدی کے مذکورہ بالا مصرعہ اول ہی میں تھوڑی نئی تحریف کی گئی ہے۔ اس مصرعہ کو قیصر شمیم نے اپنی نظم کا نہ صرف عنوان بنایا ہے بلکہ اس سے ایک شعر کو جو ایک عمومی تجربہ ہے معروض بنا کر اس سے مکالمے کی صورت میں نظم کی شکل عطا کر دی ہے لیکن جو نظم بنی ہے اس کی خوبصورتی اس کے پلاسٹک پن یعنی Plasticity میں ہے۔ نظم کی یہ شکل پتھر کی طرح سخت نہیں موم کی طرح ملائم ہے۔ نظم دیکھیں :

ہائے اے سنگ ناتراشیدہ
کوئی آرزو نہ مل سکا تجھ کو
بول کچھ بول ' ورنہ کوئی یہاں
خاموشی کو سمجھ نہیں سکتا
بول اے سنگ ناتراشیدہ

www.taemeernews.com

تیری خاموش دھڑکنوں کی طرح
روم یونان کے صنم کتنے
تیرے پہلو میں کسمساتے ہیں
بول اے سنگ ناتراشیدہ
تیرے ہونٹوں کو رسمسانا ہے
روئے سنگیں نکھارنے کے لیے
کو اب بلانا ہے
تیری خاموش دھڑکنوں کو ابھی
گنگنانا ہے گیت گانا ہے
تجھ میں خوابیدہ فن کی دیوی کو
مسکرانا ہے مسکرانا ہے
بول اے سنگ ناتراشیدہ
جلوہ گر ہو گا حسنِ نادیدہ

اس نظم میں پانچ مرتبہ فن کار براہ راست سنگ ناتراشیدہ کو مخاطب کرتا ہے جس سے غزل کا فلسفیانہ تصور" اسنام ناتراشیدہ" اس نظم میں شخصی ہو کر ایک کردار بن جاتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک نظم ہے جیسا کہ ایک شعری کو قیصر شمیم نے مزید معنوی سیاق وسباق سے ماقبل متن سے مکالمے کی صورت کے ذریعے جوڑا ہے۔ یعنی یہ نظم پرویز شاہدی کے شعر کی تخلیقی قرأت کا استعارہ ہے۔ شعر کے موجودہ معنی کو نظم نے ناموجود معنی سے جوڑا ہے یعنی نظم کا مرکزی تھیم دراصل سماج کے دبے کچلے لوگوں میں قوت اظہار پیدا کرتا ہے۔ آزر نو، روم و یونان کے صنم، خوابیدہ فن کی دیوی جیسے تلازماتی کردار پرویز شاہدی کے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

جیون پتھ پر پانی بنائی ڈگر پر یا ہزاروں لکیروں کے درمیان اپنی لکیر کھینچنا، جو پہچانی جاسکے، بہت مشکل ہے۔ پرویز شاہدی کے شعر کو نظم بنانا آسان نہ تھا قیصر شمیم نے یہ کر دکھایا۔ نظم " جیون پتھ پر" کا "میں" شعری وجود اپنے راستوں سے واقف ہے مثلاً:

اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے
گھور اندھیرے جیون پتھ پر

www.taemeernews.com

ننھی منی آشاؤں کے

جلتے بجھتے دیپ لیے میں

جانے کب سے بھٹک رہا ہوں

(ص:۱۴۷" پہاڑ کاٹتے ہوئے")

یہ بھٹکاؤ نئی معنوی کائنات یا معنی کے نئے جہاں کی تلاش کے لیے ضروری ہے اور معنی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ضد ہو اونچے کو سمجھنے کے لیے نیچے اور نیچے کو سمجھنے کے لیے اونچے کا ہونا ضروری ہے اور انسان کا وجود انھیں چیزوں سے نکھرتا ہے لیکن ٹیڑھے کے ساتھ سیدھے نہ ہو کر میڑھے کا ذکر کیوں؟ معنی کے لیے ضد لازمی تھا لیکن "ٹیڑھے میڑھے" تو دراصل تابع مہمل مرکبات میں شمار کیے جائیں گے" ٹیڑھے میڑھے" دراصل نشان نہیں ظلم وجبر کا استعارہ ہے جب کہ اونچے اور نیچے کو ہم "نشان" "Code" قرار دے سکتے ہیں۔ اس نظم کا شعری وجود منزل کا متلاشی ہے اور اس کے لیے نشان کا عرفان ضروری ہے۔ اس لیے دنیا کے ہر دردمند انسان حق اور ناحق، سچ اور جھوٹ کے درمیان ایک لکیر کھینچتے ہوئے فطرت اور انسان کے تحفظ اور بقا کا سامان کرتے رہے ہیں۔ متن کو کسی بھی شاعر کا ہو اپنے اندر روایت کی کوئی نہ کوئی چنگاری ضرور رکھتا ہے اس لیے ایک لالچی صارف کی طرح اس کا مطالعہ ہرگز مستحسن نہیں ہو سکتا۔ اپنے مجموعۂ کلام" سانس کی دھار" میں قیصر شمیم اپنے قارئین سے اپنی دردمند نثر کے وسیلے سے جب یہ لکھتے ہیں کہ :

> "میرا خیال ہے کہ آواز چھوٹی ہو یا بڑی، فوراً پہچان لی جانے والی ہو یا دوسری آوازوں کے بھیڑ میں گم ہو جانے والی، اسے بہر حال ایک بار سن لینا چاہیے۔ ادب کی دنیا میں جانی پہچانی آوازیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش رہنا اور دوسری آوازوں کی طرف سے کان بند رکھنا مناسب ہوتا ہے نہ مفید۔"

قیصر شمیم منفرد، غیر منفرد دونوں طرح کی آوازوں کو سننے کی ترغیب کیوں دے رہے ہیں؟ شاید اس لیے کہ "اصلی"، "منفرد" وغیرہ کا تصور ایک سیاسی تصور ہے۔ کائنات رشتوں کا ایک جال ہے اس لیے تنہا کسی شئے کی تفہیم مشکل ہے۔ کوانٹم فزکس نے ایٹم کے آزادانہ مطالعے کو رد کر دیا ہے کسی ایٹم کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک ہم اسے ایٹموں کے تناظر میں نہ سمجھیں۔ کسی متن کو متون کے تقابل کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے یعنی کسی متن کی قرین قیاس تعبیر اس صنف کے دوسرے متون کے پس منظر میں زیادہ بہتر طور پر ہوگی۔ قیصر شمیم جب شاعری یا شعر کی تعریف، کچھ اس طرح کرتے ہیں :

www.taemeernews.com

جب گم رہیں خیال کی اندھی گلی میں ہم   دل دفعتاً جو سینے میں دھڑکے تو شعر ہو

مذکورہ بالا شعر میں خیال کو اندھی گلی کہا گیا ہے اس استعارے سے دو مفاہیم برآمد کیے جا سکتے ہیں۔ اول خیالوں کا ہجوم دوئم یہ کہ کوئی خیال اچھوتا نہیں یعنی خیالوں کی بھیڑ میں اچھوتا خیال تلاش کرنا سوئی کو گھاس میں تلاشنے کے برابر ہے۔ البتہ ہر پیش پا افتادہ خیال دل کی دھڑکن یعنی موجودہ تاریخی محور پر نیا لگتا ہے اور یہ نیا پرانا لگنا دراصل قاری کی اپنی نفسی ضرورت کا بھی زائیدہ ہوتا ہے دھڑکنیں ہر دل کا مقدر ہیں لیکن ہر کس و ناکس کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار، صدا، حرکت مختلف ہو سکتی ہے اور مماثل بھی یعنی فن کار ایک ہی شے سے مختلف طرح سے متاثر ہو سکتے ہیں اور ایک طرح سے بھی متاثر ہو سکتے ہیں اس لیے توارد، تحریف اور تضمیں، الحاق جیسے اصطلاحیں رائج ہوئی ہیں لیکن دل کا دھڑکنا یعنی فن پارے میں واقفیت یا تجربے کی عمومیت، خلوص اور صداقت ہوگی تبھی کوئی شعر شعر ہوگا۔ قیصر شمیم بھی کبھی توارد و تحریف کے قریب جاتے ہیں اور اس ادبی سچائی کا اقرار کرتے ہیں کچھ اس طرح :

میں جانتا ہوں کے ان کا مزاج کیا ہے مگر   کبھی کبھی نظر آتے ہیں میؔر میرے ساتھ

مذکورہ بالا مباحث سے اندازہ ہوا کہ قیصر شمیم فن میں اصلی، طبع زاد، منفرد قسم کی اصطلاح کو ایک سیاسی قول تصور کرتے ہیں اس لیے بین المتنیت کے ابتدائی نقوش ان کے فن پارے کی ساخت بنتے ہیں اور ان کا متن یہ باور کراتا ہے کہ کسی متن کو دیگر متن کے تقابل یا اس کی شعریات کے حوالے سے ہی سمجھا چاہیے نیز قیصر شمیم ہی نہیں ہر اس غزل کے شاعر کی غزلوں کو سمجھا ضروری ہے جو نظمیں بھی لکھتا ہے تا کہ یہ پتہ چل سکے غزل کے ذریعے اس نے شاعری کی جیسی بھی تعریف وضع کی ہے اس کو اسی شاعر کی نظموں نے بدلا ہے۔ کوئی نیا اصول Rhetoric پیدا کیا ہے یا نہیں؟ میری قرأت کی رو سے قیصر شمیم کی غزل اور نظم کا متن منفرد ہے اور غزل اور نظم کی زبان میں خفیف سا فرق بھی ہے۔ نظم غزل کے شعر کی توسیع ہے۔

ہمارے یہاں ناول اور نظم کو مغرب کا مال سمجھا جاتا ہے جب کہ نظیر نے جو نظمیں لکھیں کم و بیش انھیں تکنیکوں اور ہیئتوں کا استعمال اقبال کے زمانے تک ہوتا رہا۔ کلیم کے تصور نظم کا سب سے زیادہ اطلاق نظیر پر ہی ہوا جو مغرب سے مستعار تنقیدی ماڈل تھا کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ نظم "ہم" جدید شاعری یا نظم کی تحریک سے پہلے بھی لکھ رہے تھے اور یہ مشرق کا ہی مال تھا۔ چھوٹی مختصر ترین نظم رباعی تھی۔ قطعہ تھا۔ طویل نظم مثنوی، مرثیہ تھی۔ لیکن کیا کیجیے چوں کہ صاحب بہادر کے ہم غلام تھے اس لیے انھوں نے جو فرما دیا مستند ہو گیا۔ ہمارے یہاں دوہا، مکنک، کنڈلیاں، ماہیے، ساون کا گیت، کہہ مکرنیاں اور نہ جانے کتنی ہی ایسی نظمیہ صورتیں تھیں جس میں ہم صدیوں سے اظہار کرتے آئے تھے۔ بعد میں Stanza Form کا نعرہ بلند ہوا جو مشرق میں پہلے سے ہی

www.taemeernews.com

مسمط کی صورت میں موجود تھا۔ جس وقت کلیم الدین احمد نظم کا راگ الاپ رہے تھے مغرب میں نظم کی اس وقت تک واضح تعریف متعین نہ تھی۔ افسانے اور ڈرامے کا سارا اصول نظم پر تھوپا جا رہا تھا۔ آپ قیصر شمیم صاحب کے یہاں ہی مغرب کی "The Poem" دیکھیے خالص ما قبل مشرقی شعری ہیئتوں کی گہری چھاپ اس پر دکھائی دے گی۔ ''ساعتوں کا سمندر'' میں شامل پہلی نظم غزل کی ہیئت ہے۔ بیسویں صدی کا ایک شاعر مشرقی شعریات سے ہی متاثر ہے۔ پھر یہ مغرب کی نظم کیسے ہے؟ تاش کے پتے دوغزلہ معلوم ہوتا ہے۔ ''ایک صبح'' میں سنسکرت نثری شاعری کی جھلک موجود ہے۔ پھر یہ کیسے اور کیوں کر کہا جائے کہ نظم مغرب کی دین ہے۔ قیصر شمیم نے وافر مقدار میں گیت بھی لکھے ہیں لیکن گیت کے یہ بول نظم کا حسن رکھتے ہیں۔ قیصر شمیم کے یہاں عقیدہ اور تاریخ بہتر انداز میں نظم ہوئی ہے۔ دراصل اقبال کے یہاں یہ وصف اپنی انتہا پر ہے تاہم قیصر شمیم کے یہاں دینی جمالیات کا فن کارانہ اظہار ہوا ہے اس سلسلے میں ان کی نظمیں '' ثنا، سجدہ، حرا سے پوچھو، عید، آرتی، چروا ہے، دعا، خدمتِ خلق، خدا سے منور تیرا نام'' دیکھی جا سکتی ہیں۔ '' پہاڑ کاٹتے ہوئے'' کی پہلی نظم '' ثنا'' بلیغ قصیدہ معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

جہت جہت ، طبق طبق
اُفق اُفق شفق شفق
صدا صدا ورق
نمو نمو رمق رمق
قلم قلم سبق سبق
بس ایک نام ، نامِ حق

اس پوری نظم میں صرف اور صرف غیر مجرد اسما، جس سے ثنا میں آسمانی لہجہ بلکہ پُر شکوہ انداز پیدا ہوا ہے۔

قیصر شمیم جس زمانے میں شاعری کر رہے تھے اس زمانے میں نظم کا عنوان ہی شاعری میں رس گھول دیتا تھا لیکن آج عنوان نظم کی محض شناخت ہے۔ وہ دائرہ ہے جس میں رہ کر تخلیق کار اپنی تخلیق پیش کرتا ہے اور قاری اسے پڑھتا ہے لیکن آج کے عنوانات کو قاری سے پہلے خود نظم ہی زد کر دیتی ہے۔ آیئے قیصر شمیم کی کچھ نظموں کے عنوانات پر ایک نگاہ ڈالیں۔ آئینۂ آب، تاش کے پتے، ایک صبح، ملن، خلیج، انفیکشن، تہذیب کا زندانی، آج کا انسان، اسپ تازی شدہ مجروح، گمشدگی، بے وجودی [ماخوذ از'' ساعتوں کا سمندر''] نئے کوہ قاف کی کھوج میں، زہر دیاں، یقینا، مجھے چھوڑ دو، تمہاری یاد آتی ہے، دردِ آشنا مسکان، مجھے دکھ ہے، تنہائی، ایک پرانا بازی گر، جنی کے

www.taemeernews.com

بول، نیل گائے، یکسانیت، پر انا رستہ نئی تاریخ، سنگ ناتراشیدہ، ایمان، بھاگن کی ایک نظم، کیا تم پر چھائیں تھے، شامِ غم وغیرہ باقر مہدی اپنی خاص طرح کی نظموں کے لیے بہت یاد کیے جاتے ہیں۔ یہاں فقط انھیں کے کچھ عنوانات پر آپ غور کریں تو شاعری یعنی نظم کی شاعری میں عنوانات کی اہمیت کا اندازہ آپ کو ہو جائے گا۔ باقر مہدی کے عنوانات ہیں'' بھوک، ایک لمبی گونج، حرف میں چنگاری، قطرہ قطرہ تیزاب، ویت نام فاشیزم۔ ان عنوانات میں ہی بلند آہنگی، نعرہ اور نری جذباتیت موجود ہے۔ اس کے مقابلے قیصر شمیم کے عنوانات کا لہجہ دھیما ہے۔ استفسار کا اثر لیے ہوئے ہے جو شاعری کا اہم وصف ہے۔ رومان اور حقیقت کی آنکھ مچولی ہے لیکن ایسی بہت کم نظمیں ہیں جس میں نظم کی قرأت کے بعد عنوان رد ہو کر ایک نئے استعاراتی افق میں گم ہو جائے تاہم قیصر شمیم کے عنوانات قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول ضرور کرتے ہیں اور بعض نظموں مثلاً یقیناً' مجھے دکھ ہے' میرا کمرہ' وہ چاند تو تم نے دیکھا ہے' زیر دیوار' نیا سال' پرانا رستہ نئی تاریخ'' نظم کے وہ عنوانات ہیں جو مختلف استعاراتی ورمزیاتی جہتوں کے ذریعہ نظم کی ساخت میں تحلیل ہو کر نئے عنوانات کا اشاریہ بن جاتے ہیں جیسے مسجد قرطبہ میں مسجد عشق اور مردِ مومن اور فلسفۂ زمان میں تحلیل ہو کر امر ہو جاتی ہے۔

بنیادی طور پر قیصر شمیم مختصر اور مختصر ترین نظموں کے فن کار ہیں جسے پڑھتے ہوئے سانسیں نہیں ٹوٹتیں ایک اور ایک ہی نوع کا آہنگ قائم رہتا ہے۔ حقائق یا واقعات اخیر میں محض احساس بن کر قاری کے ذہن میں رچ بس جاتے ہیں مثلاً ان کی نظم آرتی، سراب، نیا سال، آدمی اور آئینہ پڑھیں تو آپ کو احساس ہوگا کہ ایک کیفیت ہے جو نظم میں ڈھل گئی ہے۔ آپ پڑھ کر خاموش ہو جائیں گے کچھ کہنا مشکل ہو جائے گا۔ یہاں معنی تلاش کرنا فضول کام معلوم ہوگا یا ایسا عمل کہ جیسے آپ نے کسی گہری نیند میں سوئے ہوئے بچے کو جگا کر رلا دیا ہو۔ آدمی اور آئینہ کچھ اس قسم کی نظم ہے' سنیے :

دونوں اپنے آپ سے پوچھیں
کیا دیکھا ہے
دونوں گونگے بن جائیں گے!

اس چھوٹی سی نظم میں افعال کی کثرت استعمال سے معنی یا کیفیت کی بجائے تجربات اس نظم کا موڈ بنتے ہیں۔ ان تین مصرعوں یا نحوی واحدوں میں کیا کچھ نہیں ہے۔ دو شعری کردار ہیں (دونوں) استفہام ہے (کیا دیکھا ہے؟) اور نظم میں ارتقا کا احساس بھی ہوتا ہے یعنی دونوں اگر خود سے اپنے مشاہدے کے بارے میں استفسار کریں جو کچھ بھی انھوں نے دیکھا ہے تو دونوں اسے بیان کرنے سے عاری ہو جائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ

www.taemeernews.com

داستانوی فضا میں ہم آ گئے ہیں جہاں مڑ کے دیکھا نہ کہ پتھر ہو جائے۔ تحیر کا سماں ہے۔ آخر کیا دیکھا ہے کہ جسے وہ بیان کریں تو گونگے ہو جائیں گے یا جسے وہ بیان کرنا نہیں چاہتے اور وہ جان بوجھ کر گونگے بن جاتے ہیں۔ کیا کسی قاتل کو دیکھا ہے؟ کسی کی حق تلفی کی ہے؟ کسی جن کو دیکھا ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو یہ نظم آج کے ہر اس انسان پر طمانچہ رسید کرتی ہے جو جان بوجھ کر حقائق پر پردہ ڈال کر مسائل سے زندگی کی سچائیوں سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل قیصر شمیم کی نظموں میں انسان کے اندر چھپے انسان کو جگانے کی خوبصورت سعی ملتی ہے۔ یہ نظم ثلاثی کا تاثر رکھتی ہے جو خالص مشرقی ہیئت ہے۔

آپ اختر الایمان کو پڑھیے کہ کس طرح سے وہ ایمائی واشاراتی یا استعاراتی انداز اختیار کیے بغیر نظم لکھتے ہیں اور اسے قائم کر دیتے ہیں۔ وہ اکا دکا مقامات پر ہی تشبیہ سے کام لیتے نظر آتے ہیں لیکن قیصر شمیم نے اپنے نظریہ متن کی تشکیل میں تشبیہ کی ذیلی ساختوں یعنی مرکب تشبیہوں کی ساختوں کا فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ یہ ان کے اسلوب کی اہم خصوصیت ہے۔ "ساعتوں کا سمندر" میں شامل نظم "ایک صبح" ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں تشبیہ نے نظم کو اشوک کا ایک ہرا بھرا درخت بنا دیا ہے۔ نظم کے دو حصے ہیں اور دونوں حصوں میں تشبیہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

پرو اور گھنیرے بادل
جیسے موٹی راکھ کی چادر
نیل گگن سے اس دھرتی تک
ادھ میلا سا اُجلا پن ہے
جیسے کسی گوری عورت کے
گورے مکھ پر
گہری اداسی کی چھایا ہو

دوسرے بند یا حصے میں شاعر کا مشاہدہ کچھ یوں ظاہر ہوا ہے:

اونچے اونچے پیڑ پہ تٹ پر/ صف باندھے خاموش کھڑے ہیں/
جیسے دنیا بھر کی چنتا/ ان کے سر پر آ پڑی ہے

اس نظم میں لفظ طرف لکھنے کی بجائے "لار" لکھنا "رخ" کی جگہ "مکھ" لکھنا شاعر کے اسلوبی انتخاب کو ظاہر کرتا ہے لیکن ان لفظوں سے جو ٹھیٹھ دیسی انداز نمودار ہوا ہے وہ نظم کو واقعیت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ اس نظم میں آپ

www.taemeernews.com

ابتدا، ارتقا اور انتہا جو ڈرامے کا اصول رہا ہے ڈھونڈ ہی نہیں سکتے۔ یہاں تو ایک طویل سوچ ہے جو طویل ہو گئی ہے یا آہ ہے جو پھیل گئی ہے اور نظم کا معروض بن گئی ہے۔

تشبیہ کی ان طویل ساختوں کا استعمال ان کی نظم "ملن" میں بھی ہوا ہے۔ نظم کا آغاز ایک چھوٹے سے ادھورے جملے یعنی عدم تکمیل کے احساس سے ہوا ہے اس لیے نظم آگے کی لائنوں/مصرعوں میں تشبیہ کی ساختوں کے متواتر استعمال سے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کی کشمکشوں کا خوبصورت اظہار ہوا ہے۔ نظم کے ہر مصرعے کا آخری لفظ فعل کی اصلی حالت مثلاً ملنا، ہلنا، کھلنا، نکلے، پگھلے، جگائے، کھلنا وغیرہ ہے لیکن اس کے ساتھ فعل کی گردانی شکلیں بھی ہیں جو تمنائی ہیں۔ اصلی حالت آفاقی احساس کو جگاتے ہیں اور تمنائی افعال صورت حال کو بدلنے کی تمنا کرتے ہیں۔ دیکھیے تم سے ملنا یعنی "تم" جذباتی ہے۔ معشوق سے ملنا کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

تم سے ملنا

جیسے کسی بے پات شجر پر پات کا ہلنا

جیسے کسی پت جھڑ کی رت میں پھول کا کھلنا

جیسے کسی ٹوٹی وینا سے سر میں ڈھل کر نغمہ نکلے

جیسے پن کی دیوی نکلے پاپ کے گھر سے

نظم کا اختتام مایوسی ہے یعنی "تم" سے ملنا ـــــ جیسے کسی پت جھڑ کی رُت میں پھول کا کھلنا۔

یہ ملن جیسے فعل کی اصلی حالتوں کے ذریعے ناممکن بنا کر پیش کیا جاتا ہے معمولی نہیں ہے۔ یہ دراصل آ- اور پرماتما' خدا اور بندے کے علاوہ امیر اور غریب کا ملن ہے بلکہ اجتماع ضدین ہے جو ممکن نہیں ہے۔

ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "پہاڑ کاٹتے ہوئے" میں "تمہاری یاد آتی ہے، ہمارے اپنے لہو کا حصہ، عید، وہ چاند تو تم نے دیکھا ہے" وغیرہ میں بھی تشبیہ اہم ساخت بن کر ابھرتی ہے۔ دراصل قیصر شمیم کے یہاں نظم کا کوئی خیال ٹھہر جاتا ہے اور پھر نظم کی "بافت" میں ایک شے دوسری شے پر منطبق کچھ اس طرح سے تواتر کے ساتھ ہونے لگتی ہے کہ وہاں مماثلتوں کا رقص شروع ہو جاتا ہے اور نظم ایک تکراری وجود (Repeatative) یا مظہر بن جاتی ہے مثلاً نظم "عید" دیکھیے۔ ابتدا تا انتہا نظم تشبیہ کا چراغ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تو عید کو اتنے تشبیہی پیکروں میں ڈھالا جاتا ہے کہ مشاہدے میں مبالغہ در آتا ہے۔

قیصر شمیم کے تنقیدی ذہن تک رسائی کے لیے آیئے ان کی معرکۃ الآرا نظم جو میری نگاہ میں معرکۃ الآرا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح حالی کی نظم مناجات بیوہ، اقبال کی نظم مسجد قرطبہ، فیض کی نظم تنہائی، مجاز کی نظم آوارہ،

www.taemeernews.com

مخدوم کی نظم چارہ گر، ساحر کی نظم تاج محل، جاں نثار اختر کی نظم ہندوستان، میراجی کی نظم جاتری، راشد کی نظم حسن کوزہ گر، عمیق حنفی کی نظم صلصلۃ الجرس، اختر الایمان کی نظم ایک لڑکا، سردار جعفری کی نظم نئی دنیا کو سلام، عنبر بہرائچی کی نظم دوب، صلاح الدین پرویز کی نظم ژاژ اور نیگیٹو، مظہر امام کی نظم اکھڑتے خیموں کا شہر، جینت پرمار کی نظم منو، چندر بھان خیال کی نظم ہاں وے مسلمان تھے، پیغام آفاقی کی نظم درندہ' لیکن مسجد قرطبہ کی فنی عظمت اپنی جگہ مسلم۔ میرا خیال ہے کہ ہر بڑے نظم نگار کے یہاں ایک ایسی نظم ہوتی ہے جو اس کے نظریہ متن کی وحدت قرار دی جاسکتی ہے۔ مسجد قرطبہ میں اقبال کی پوری شاعری اور اس کے محاسن نیز فلسفیانہ احساس موجود ہے۔ آوارہ میں مجاز اپنی تمام تر رومانی اور انقلابی آواز کے ساتھ موجود ہیں۔ قیصر شمیم کو آپ بڑا یا اہم جو بھی سمجھتے ہیں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ " مجھے دکھ ہے " میں موجود ہیں۔

نظم کا عنوان پہلی نظر میں بیان ہے۔ انتہائی ساجی اظہار ہے اور غور کیجیے تو فلسفیانہ لیکن حافظے پر اور زور دیں تو عنوان اجتماعی حافظے کو بیدار کرنے والا بھی ہے۔ قاری کا ذہن لفظ " دکھ " پر جیسے ہی مرتکز ہوتا ہے گوتم بدھ اپنے فلسفے یعنی بودھی روایت کے ساتھ نظم کے Texture میں شامل ہو جاتے ہیں۔ گوتم کے نزدیک ہم سب جانتے ہیں کہ دکھ کے تین کارن ہیں۔ مہاتما بدھ نے انیس سال کی عمر میں گھر چھوڑ دیا تھا جن کا ماننا تھا کہ جنم لینا دکھ ہے۔ بڑھاپا دکھ ہے۔ مرنا دکھ ہے۔ افسوس کرنا، رونا، درد، فکر، غصہ میں آنا سب دکھ ہی دکھ ہے۔ یعنی اس دھرتی پر دکھ کا ہی اقتدار ہے۔ بدھ نے دکھ کے انت کے کئی راستے بھی بتائے تھے جو ہمیں معلوم ہیں۔ یہاں اس نظم کا راوی " میں " میں واحد متکلم یعنی شعری کردار یہ اعلان کرتا ہے کہ مجھے " دکھ " ہے۔ وہ دکھ ہے جس نے بدھ کو گھر چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ یعنی نظم کا متکلم (Speaker) حد درجہ گمبھیر، کچھ راہب، جوگی یا صوفی منش بزرگ معلوم ہوتا ہے۔

متکلم کا عنوان اور نظم جو کچھ بھی کہتی ہے اسے الگ الگ شے سمجھتے ہوئے عنوان کو یہاں Texture میں تلاش کرنا فضول ہے۔ یہ بذات خود نظم ہی ہے جسے کئی زاویے سے پڑھیے نئے معنی برآمد ہوں گے۔ آیئے نظم کی ابتدا کیسے ہوئی ہے اس پر ایک نگاہ ڈالیں :

مجھے دکھ ہے\
کہ جو آنکھیں مجھے بخشی گئی ہیں\
۔ یہاں ان کا کوئی مصرف نہیں ہے\
لیے پھرتا ہوں ان آنکھوں کو برسوں سے ہتھیلے میں

www.taemeernews.com

یہ ہے صورت حال کہ آنکھ اپنی فطرت سے کوسوں دور ہے اس لیے اس کا ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کتنا شدید طنز ہے یہ مصرعہ کہ لیے پھرتا ہوں میں ان کو جنھیں ہم آنکھیں کہتے ہیں" "تھیلے میں" نظم ایک تمنا ایک خواب کی صورت میں آگے بڑھتی ہے کچھ اس طرح :

افق کی سمت سے ایسا کوئی سورج نکل آئے / جسے بھولے ہوئے
اپنے کسی سپنے کی سچائی سمجھ بیٹھوں / وہ منظر اپنے اپنے قید خانوں سے نکل آئیں /
جواب تک سامنے آنے والوں سے یوں معذور ہیں جیسے / مزاجاً سخت جیلر قیدیوں کو
ملنے والوں سے نہ ملنے دیں / انھیں "پیرول" پر بھی چھوڑنے کی جب گزارش ہو / تو
ان کی عرضیوں کو ویسٹ پیپر بکس میں ڈال کر خوش ہو ____

تمنا، آرزو، خواب اب احتجاج، ترغیب اور تحریک بن کر نظم کو اچانک گمبھیر فضا سے نکال کر حرکت و عمل بلکہ ہنگامی فضا میں لے آتے ہیں کچھ اس طرح :

وہ منظر اپنی جیل کی دیوار توڑ کر
بھاگ نکلیں
سامنے آئیں
مگر جب سامنے آئیں تو اپنے ساتھ وہ چہرے بھی لائیں
جن کے بچ ہونے پہ دل کو ا۔ ر آئے
ابھی تو تتلیاں، مدھ مکھیاں، بھنورے
سبھی بیزار ہیں میری طرح
جانے انھیں کب تک یوں ہی بیزار رہنا ہے
کہ اب تک کاغذی پھولوں کا موسم ختم ہونے پر نہیں آیا!

دت احتجاج کی اس فضا کے بعد یعنی اگر تمنا پوری ہو جائے، خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے تو پھر نظم کا راوی نظم کو ایک سمت موڑ دینے پر راضی ہو جاتا ہے یا ایک ایسا سرا خلق کرتا ہے جسے قاری دل تھام کر نظم کو از سر نو کہنا شروع کر دیتا ہے کچھ اس طرح سے نظم سے باہر نکل آتے ہیں قاری :

"اگر موسم بدل جائے
کہیں رنگوں کی بارش ہو

www.taemeernews.com

کہیں کلیاں چٹک کر رُت بدلنے کی گواہی دیں
ہوا کے ساتھ کوئی نکہت جاں بخش آ کر
ہر سیہ خانے کے دروازے پہ دستک دے
تو پھر میں اپنے تھیلے سے نکالوں اپنی آنکھیں
اور اس بدلی ہوئی رُت کے حوالے سے میں ان کا جائزہ لے لوں

لیکن نظم پھر شروع ہو جاتی ہے :

ابھی تک تو مجھے دکھ ہے
کہ جو آنکھیں مجھے بخشی گئی ہیں
یہاں ان کا کوئی مصرف نہیں ہے

یہاں معلوم ہوتا ہے جیسے سوچ کے جتنے بھی اسالیب نظم میں پائے جاتے ہیں ایک خواب کی طرح ہیں۔ جیسے خواب میں اڑتے اڑتے اچانک آنکھ کھل گئی ہو اور اڑنے والا فٹ پاتھ پر سویا ہوا ہو جس کے بغل میں ایک کتا بھی بیٹھا سستا رہا ہو۔

یہ نظم گوتم بدھ کی جملہ روحانی منازل کے پس منظر کو اپنے متن کے قالب میں کھینچ لاتی ہے۔ دکھ کے بعد معلوم ہوتا ہے گوتم دکھوں سے مکت کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں اور لوگوں کو تمام موہ مایا کی الجھنوں سے نکالنا چاہ رہے ہیں جیسا کہ اس نظم کے اس حصے میں جہاں تب احتجاجی لے اختیار کرتے ہوئے منظروں کو تیاگ جانے کے لیے حقائق سے سامنا کرنے لیے اکساتا ہے لیکن گوتم کی بیزاری ختم کہاں ہوئی تھی۔ دکھ تو آج بھی اس دھرتی پر راج کر رہا ہے۔

آیئے نظم کے خود کو تقویت پہنچانے والے لسانیاتی نظام یعنی (Self Subsistance Linguistic System) پر ایک نگاہ ڈالیں نیز نظم کی Anatomy یا Morphology یعنی بافت کو محسوس کریں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نظم میں جملے کی تکرار کے ساتھ ساتھ مصرعے میں تبادلی اثر کے ذریعے خیال کو مزید کنکریٹ شکل یا صنعت یعنی Keynal میں "اب تک تو" کی توسیع ہو جاتی ہے۔ کہ "جو آنکھیں مجھے بخشی گئی ہیں" کو شروع اور اخیر میں " یہاں ان کا کوئی مصرف نہیں ہے" کو بھی شروع اور اخیر میں ایک بیان کی صورت میں تکرار کے عمل سے گزار نا دراصل قاری کو حقائق سے دوچار کرانا ہے تاکہ تبدیلی کے لیے ان کو تیار کیا جاسکے۔ اسی طرح نظم کے شروع میں آنکھوں کو جو بے کار ہیں انھیں تھیلے میں رکھا ہوا دکھانا پھر اخیر میں انھیں تھیلے

www.taemeernews.com

سے نکالنے کی صورت میں تبدیلی اور ارتقا کی فضا خلق کرتا ہے۔ نظم کے شروع کا حصہ اخیر کے حصے پر منطبق ہوجاتا ہے جو حقیقتِ حال کے ٹھہر جانے پر دال ہے۔ اس لیے خواب یا تمثیلی صورت میں سورج کو بطور آرکی ٹائپ، موسم کو بطور اسطور اور آنکھ کو بطور اسرارِ تخلیق کے استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ایسے موسم کی طرف نظم کے اخیر حصے میں اشارہ کیا گیا ہے جسے بہار کا موسم کہتے ہیں یعنی موسم بدل جائے' کلیاں چٹکنے لگیں اور رنگوں کی بارش ہونے لگے تو یہ موسم بہار کے سوا کیا ہے۔ بہار کا Mythos کامیاب عشق سے عبارت کیا گیا ہے۔ سماج کی طرف سے رکاوٹیں آتی ہیں لیکن انجام کار اس پر قابو پالیا جاتا ہے اور بالآخر سماج میں نیا ارتباط پیدا ہوتا ہے ایسے وقت میں جب سماج میں استحکام پیدا ہوجائے تو تھیلے سے آنکھیں باہر نکالی جاسکتی ہیں۔

آپ نظم کے مصرعوں پر ایک بار اور غور کریں۔ پوری نظم میں سب سے زیادہ مرکب افعال کی ساختیں استعمال ہوتی ہیں۔ اس سے اختصار کے ساتھ روانی نیز زورِ بیان میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ مصرعہ جات میں مستعمل افعال اپنا Agent یعنی فاعل ضرور رکھتے ہیں۔ اس سے عامل کا کردار ہی نہیں بلکہ ایک یقینی محسوس، کنکریٹ اور مضبوط عامل کا کردار ابھرتا ہے۔ توسیعی پیکروں کا استعمال اس نظم کا اہم اسلوبی وصف ہے۔ یعنی ایسے پیکروں کا استعمال زیادہ ہوا ہے جو کسی بھی منظر، صورت حال یا واقعے یا کردار کی توسیع کرسکیں۔ مثلاً آپ نظم پڑھیں تو سورج کے نکلنے کے بعد منظر کو بھی قید خانے سے نکالا جاسکتا ہے پھر منظروں کو جیل کی دیوار توڑنے کی ترغیب، اتنا ہی نہیں اپنے ساتھ ان چہروں کو بھی ساتھ لانے کی ترغیب دی جاتی ہے جن کے سچ ہونے کا یقین ہو۔ مجھے دکھ صرف فردِ واحد کا دکھ نہیں فطرت مثلاً'' تتلی، مدھ مکھی، بھنورا کا بھی دکھ ہے۔ اس طرح نظم کا ہر حصہ غزل کے شعر کی ایک تہہ دار ترکیب بن جاتا ہے۔

اپنی اس نظم کا مرکز انگیخت (Sence of datum) آنکھ کو تھیلے میں رکھنا اور پھر اسے تھیلے سے نکال کر ماتھے پر جڑتا ہے یا سر ماتھے سے لگاتا ہے۔ بظاہر ایسا محاورتاً ہی کہا گیا ہے لیکن نظم کی بنت یا خودکلامی والے بیانیے میں یہ ایک اساطیری التباس (Illusion) پیدا کرتا ہے اور تحیر کا جمال خلق کرتا ہے۔ شہریار کی نظموں کا محاکمہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے موجودہ شاعری میں'' تحیر'' کے فقدان کی بات کی ہے۔ ان کا منشا اسی قسم کا تحیر ہے جو قیصر شمیم نے اس نظم میں پیدا کیا ہے۔ (شعر و حکمت، جلد اول، دورِ سوم کتاب پانچ اشاعت 2003ء ص 297)

آنکھیں نہ ہوں تو حیرت بھی نہ ہو۔ دکھ کا سب سے بڑا کارن آنکھ ہی ہے پتہ نہیں گوتم نے کیا کارن دریافت کیا تھا۔ نظم میں تو یہی کارن ایک اہم کردار بنتا ہے۔ یہ جو سورج کے نکلنے کی تمنا کی گئی ہے آنکھ کا ہی دوسرا

www.taemeernews.com

روپ ہے۔ جس منظر کی بات کی گئی ہے آنکھ ہی میں اسے خلق کرتا ہے کہ حسن اپنا رمیں نہیں آنکھ میں ہوتا ہے۔ جس بہار کی تمنا کی گئی ہے اس کا مشاہدہ یا مزہ آنکھوں سے ہی لیا جاتا ہے۔ دکھ کا کارن آنکھیں ہی ہیں مگر آنکھیں اپنی فطرت کھو چکی ہیں۔ اپنی شناخت گنوا چکی ہیں اس لیے تکراری صورت میں مجھے دکھ ہے اور پھر یہ کہا گیا ہے کہ ابھی تک تو مجھے دکھ ہے اور اس کی حد نہیں ہے اس لیے آنکھوں کو اس کی فطرت سے قریب کرنا بہت ضروری ہے تاکہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کریں ورنہ تھیلے میں ہی ٹھیک کریں۔

نظم کا ہر حصہ ترکیب اور علامت کی شکل میں ایک شعر یعنی غزل کا شعر بن جاتا ہے جس میں قافیے کا رول اس نظم کے کلیدی الفاظ، آنکھیں، تھیلے، سورج، جیل، دیوار، موسم، سیہ خانے، رنگ وغیرہ ادا کرتے ہیں اور ردیف کا رول نظم میں موجود بدھ روایت نیز نظم کے یکساں لسانی پیٹرن رکھنے والے شروع اور اخیر کے بند یا حصے ادا کرتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہونے والی نظم ہے۔

قیصر شمیم نے اپنی نظموں میں اساطیری التباسات کے ذریعے اجتماعی حافظے کو شدت سے بیدار کیا ہے۔ "32 واں پہاڑ کاٹنے کے بعد" کے مطالعہ سے ذہن میں فرہاد فوراً آتا ہے لیکن اس نظم کی اشاریت کو اس وقت نقصان پہنچتا ہے جب نظم نگار قاری کے حافظے پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے اس نظم کی 23 ویں لائن یعنی "فرہاد کا یہ فرض کہاں تک نبھاؤ گے" میں فرہاد کا نام لے لیتا ہے۔ ان کی اور بھی کچھ نظمیں ایسی ہیں جس میں شعریت کا فقدان ہے مثلاً "ایمان" "سوالیہ نشان؟ ایمان کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ" اپنے وطن کو ماں کا درجہ دیتے ہیں ہم لوگ / پھر کیوں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر آمادہ ہیں۔" یہ مصرعے محض Content رکھتے ہیں۔ Sementic Content یعنی معنیاتی موضوع نہیں رکھتے۔ یعنی جہاں جہاں انھوں نے ہنگامی یا موضوعاتی قسم کی شاعری کی ہے جس کا کوئی Recieving End نہیں ہے نظم ابالی کھچڑی بن گئی ہے مثلاً "عید مناؤ، یہ سپنا کب پورا ہوگا، نیلسن منڈیلا کے نام" نیلسن منڈیلا پر ادھر کے کئی نظم نگار شعرا مثلاً عنبر بہرائچی، جینت پرمار، سلیم انصاری نے خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔

قیصر شمیم نے "مجھے دکھ ہے" کو ایک شاہکار نظم بنا دیا ہے۔ ان کی نظم "سمندر بے کراں ہے" جس میں سالک سلوک، بندہ، خدا، آتما، پرماتما، وحدت الوجودی، ویدانت کے نجات کے علاوہ فنافی اللہ جیسے مسائل کو خوبصورت نظم کرتے ہوئے ایک پرانے مضمون اتحاد کی برکت کو نظم کی بافت میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ موجودہ دور کی علیحدگی پسند تحریکوں کے منہ پر طمانچہ معلوم ہوتا ہے۔ "زیرِ دیوار" پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں یا جوج ماجوج تازہ ہو جاتے ہیں اور برلن کی دیوار آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

www.taemeernews.com

قیصر شمیم کے نظمیہ متن کی اہم خصوصیت شخصی مرثیوں کی تجدید نو بھی ہے۔ "پہاڑ کاٹتے ہوئے" یعنی اس مجموعے میں انھوں نے تقریباً 17 ایسی نظمیں کہی ہیں جس کا فارم شخصی مرثیے کا ہے لیکن حقیقتاً یہ خوبصورت نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں شاہکار نظم "یقیناً" ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں بھرتی کی نظمیں یا روایتی انداز کے شخصی مرثیے ہی بننے کا شرف حاصل ہے۔ مثلاً "میں آرہا ہوں" "موز وغیرہ۔ لیکن نظم "یقیناً" یقیناً ایک بلیغ نظم ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر حضرت یونس کی یاد آتی ہے۔ اس قصے کا سارا ماجرا ذہن میں آجاتا ہے جس میں ایک بھونی ہوئی مچھلی رکابی سے اڑ جاتی ہے۔ دراصل شمس الزماں ایک صحافی اور شاعر تو اچھے تھے ہی ایک دردمند انسان بھی تھے۔ انھیں کی وفات پر یہ نظم کہی گئی ہے۔ یہاں ٹھہر کر اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ بھاکا کی شاعری، ہندی چھندوں اور روپوں کا وافر مقدار میں فن کارانہ استعمال بھی قیصر شمیم کے اسلوب نظم کی اہم خصوصیت ہے۔ اس ضمن میں اردو کے نامور شاعر اور منفرد نظم نگار مظہر امام کی شادی اور ان کی جدائی پر لکھی گئی نظم " آگھات" مذکورہ اسلوب کی بلیغ مثال ہے۔ بہرکیف آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے لیے کلکتے سے مظہر امام کی رخصت پر " آگھات" نظم کا یہ بند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ یہ نظم بظاہر ترکیب بند کی ہیئت میں ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اس میں ہندی کویتا کے ملنک کا انداز بھی اپنایا گیا ہے۔ نظم میں اسی دکھ کو بانٹنے کے لیے کچھ فلسفیانہ اور کچھ زندگی کی سچائیوں سے متعلق معلومات یا انکشافات کیے گئے ہیں جسے جدائی کا کرب کہتے ہیں۔ پہلے جدائی کو جیون کا اصول بتانا پھر اپنے آپ کو مجبور بتاتے بتانا کہ ملن اور جدائی انسان کے ہاتھ میں نہیں۔ بند ملاحظہ فرمائیں اور بھاشا کے اسلوب کے سحر کا اندازہ کریں۔

یہ جیون کیسا جیون ہے، ہم سب ہیں مجبور
پاس سدا رہنا چاہیں تو ہو جاتے ہیں دور
بیری سمے کے ہاتھوں میں ہیں اپنے یہ دن رات
اپنے یہ دن رات بنوی اپنے یہ دن رات
پل دو پل کا ساتھ ہو چاہے جیون بھر کا ساتھ

اس نظم میں پورب پور پورسا گیا ہے۔ آج "بنوی" نشان بن چکا ہے۔ مظہر امام کے بہانے یہ نظم زندگی کی بہت ساری تلخ سچائیوں کا ترجمان بنتی ہے۔

بہر حال شمس الزماں کی وفات پر لکھی گئی نظم ملاحظہ کریں :

یقیناً تم وہ مچھلی تھے
جو پانی سے نکل کر، آپ ہی

بھوکی ڈشوں کا پیٹ بھرنے کے لیے بیتاب رہتی تھی
کہ شاید عہد ماضی کی وہی بھونی ہوئی مچھلی تھے تم
جو ایک دن آفت کے مارے ایک راجا کی رکابی سے
اچھل کر جا گری تھی پھر سمندر میں
وہی تھے تم
تمھیں اپنے سمندر میں سکوں ملتا نہ تھا کچھ بھی
تمھیں تھا اس کا پچھتاوا کہ تم نے
ایک بھوکے بے سہارے کو دیا تھا ایک بڑا دھوکا!
یگوں کے بعد تم شاید اسی دن کی تلافی کے لیے خود ہی
نکل آئے تھے پھر اپنے سمندر سے
تمھیں ہر روز وہی بھوکی ڈشیں چٹ کرتی رہتی ہیں
تمھیں چٹ کر کے کانٹے پھینک دیتی تھیں
انھیں کانٹوں سے تم پھر جنم لیتے تھے
کسی کے ہاتھ لگتے تھے' کسی کا پیٹ بھرتے تھے
مگر اس بار
تم چھوٹے ہو جب جنموں کے چکر سے تو یہ احساس ہوتا ہے
کہ اب پھر جنم لے کر
تم کو آنا ہے' نہ آؤ گے
مگر اس شہر میں سب کو تمھاری یاد آئے گی

("پہاڑ کاٹتے ہوئے" یقیناً ص ۳۳-۳۴)

"مجھے دکھ ہے" ۳۰ مصرعوں میں بنی نظم ہے اور "یقیناً" ۲۷ مصرعوں پر بنی نظم ہے۔ یہاں نظم کو مولف کے تحت لکھا ہی نہیں گیا ہے۔ اس میں حصے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ پہلے اسے مچھلی یعنی اپنے ممدوح کو مچھلی ہونے کا یقین دلایا۔ یہ نظم بنگال ہی میں کہی جاسکتی ہے یعنی آدمی آج ایک شے بن گیا ہے یعنی صارف کے استعمال کی ایک شے۔ مچھلی کہہ کر آج کے انسانی وجود کو Consumption کا ایک سامان بنادیا گیا ہے لیکن اشیا میں

www.taemeernews.com

کتنی ہمدردی یادو ںسروں کی دلجوئی کا خیال ہوتا ہے اس کا اندازہ اسی راجہ کی رکابی سے مچھلی کا اچھلنا، کانوں کا پھر مچھلی میں تبدیل ہو جانا۔ کائنات میں نت نئے روز اضافے یا تخلیق کے عمل کے جاری رہنے کی طرف اشارہ ہے لیکن بیان میں جادوئی حقیقت نگاری نے جان ڈال دی ہے۔ اوپر سے خالص ہندوستانی فلسفے نے یعنی تناسخ کے فلسفے نے نظم میں ایسا رمز پیدا کر دیا ہے کہ شمس الرماں ایک تہذیبی یا ثقافتی مولول یا اس کے واحدوں میں ڈھل جاتے ہیں اور نظم تہذیب انسانی اور انسان کے ایثار و ہمدردی کی علامت بن جاتی ہے۔

تمھاری، تمھیں، تم، تمھارے، تمھاری ضمائر سے نظم میں انتہائی جذباتی فضا خلق ہوتی ہے اور شمس الرماں سے نظم کے متکلم سے جذباتی لگاؤ اور بے تکلفی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس نظم کو سن کر غزل کا کوئی شعر جو گنجینۂ معنی کا طلسم ہو کا احساس ہوتا ہے لیکن غزل کی زبان کو نہ صرف اس نظم میں بلکہ ممکنہ طور پر ہر نظم میں قیصر شمیم نے نظم کے قالب میں براہ راست برتنے سے احتراز کیا ہے۔ مغرب و مغرس زبان سے گریز کیا ہے۔ ہندی الفاظ اور ہند اسلامی اساطیر و فلسفے سے کام لیا ہے لیکن یوٹو پیائی مستقبل سے جو ترقی پسند شعریات کا خاصہ رہا ہے اجتناب کیا ہے لیکن ترقی پسند شعریات کی صحت مند قدروں کو خوب اپنایا ہے۔ ان کی نظمیں آج کے سماج میں پائی جانے کثافتوں کے خلاف اپنا احتجاج درج کراتی ہیں۔ بلاشبہ قیصر شمیم نظم کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کا شمار اردو کے اہم نظم نگاروں میں ہونا چاہیے :

لفظ کی سطح سے گہری ہیں بہت سی باتیں
ہم بھی کچھ عرض کریں' کوئی سخن فہم تو ہو

(ساعتوں کا سمندر، ص ۲۴)

قیصر شمیم کے دو اشعار

آؤ یارو' پل بھر بیٹھو' کس کو خبر ہے' کل کیا ہو
کچھ تو دل کی باتیں کر لو' کس کو خبر ہے' کل کیا ہو

اپنا کنواں ہے' اپنا پانی' پھر کیوں پیاس ہو قسمت میں
اپنے حق سے ہاتھ نہ کھینچو' کس کو خبر ہے' کل کیا ہو

www.taemeernews.com

شبیر احمد
کلکتہ

قیصر شمیم اور ان کا اشترا کی شعور

اشترا کیت کوئی نیا تصور حیات نہیں ۔ ہر عہد میں انسان مساوات کو اصولی طور پر اپناتا رہا ہے۔ دنیا کے تمام اہم مذاہب نے اس کی تبلیغ کی ہے کہ تمام انسان ایک ہی خدا کے بندے ہیں اور اس نسبت سے سب برابر ہیں۔ مگر یہ عام رائے ہے کہ اشترا کیت کو ایک سیاسی نقطۂ نظر کی طرح باقاعدہ طور پر سب سے پہلے افلاطون نے پیش کیا۔ اس کا ماننا تھا کہ ریاست کو مستحکم کرنے کی راہ میں نجی جائداد بہت بڑی رکاوٹ ہے، اس لئے حکمراں طبقے کو وہ نجی جائداد کے حق سے محروم رکھنے کی پیروی کرتا تھا۔ چونکہ افلاطون اشترا کیت کو صرف اوپری طبقے کے لوگوں تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا اور عام شہریوں کو اس سے مستثنیٰ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اکثر لوگ افلاطون کے اشترا کی نظریے کو آدھی اشترا کیت کا نام دیتے ہیں۔ خود کو عوامی زندگی سے جوڑے رکھنے والے اور عام انسان کے دکھ درد کو اپنی ذات میں محسوس کرنے والے قیصر شمیم بھی افلاطون کے اشترا کی نظریہ کو ایک مکمل نظریۂ حیات نہیں مانتے ہیں۔

جدید دور میں اشترا کیت کو ایک جامع تصور کا نظام سمجھا جاتا ہے جو اپنے اندر مارکسزم، فیبین ازم، انارکزم، جمہوریت، سنڈیکل ازم، گلڈ ازم اور گاندھی ازم جیسے مختلف النواع نظریات کو سموئے ہوئے ہے۔ قیصر شمیم نے ان تمام نظریوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا، اسکے مثبت و منفی پہلوؤں پر غور و فکر کیا اور ہر نظریے کی عملی تصویر کا بغور مشاہدہ کیا۔ ان کی تحریریں خواہ نثری ہوں یا شعری، ان کی زندگی چاہے طالب علمی کی ہو یا درس و تدریس کی، یا پھر سیاسی و سماجی، ہر جگہ ان کے نظریے کی ایک گہری چھاپ ملتی ہے۔ قیصر شمیم ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم رکن رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا منشور سماجی اور مارکسی ادب سے مستعار ہے۔ یہ تحریک ادب کو سماجی طور پر نفع بخش بنانا چاہتی ہے۔ ادب کا رشتہ عوام سے جوڑ کر سماج میں ایک سیاسی شعور پیدا کرنے کی سعی بلیغ کرتی ہے۔ وہ شعور جو مساوات کا علم بردار ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ تحریک پسندوں کی یہ کوشش کبھی کبھی پروپگنڈہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس سے ادب کی جمالیاتی کیفیات مجروح ہو جاتی ہیں۔ اگر چہ قیصر شمیم ایسے گوشے کے متلاشی رہے ہیں، جو

www.taemeernews.com

انسان کوانسانیت کادرس دے، اس میں حسنِ ظن پیدا کرے، ماحول کی صحیح عکاسی کرے اور جس میں مزدوروں اور افلاس کے ماروں کی بے مائیگی اور استحصال کا ذکر بھی ملے، انھیں سماج میں ایک باوقار زندگی دلانے کی تائید کرے۔ لیکن اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ادب میں صرف مقصدیت کے ہی قائل رہے ہیں، اور 'ادب برائے ادب' کو انھوں نے یکسر نظرانداز کر ڈالا۔ لہٰذا اپنی کتاب "پیاز کاٹتے ہوئے" کے "دائرے" (پیش لفظ) میں وہ خود فرماتے ہیں :

> "کسی نظریے کے دیوتا کو خوش کرنے کے لئے ادب کے حسن اور اظہار کی آزادی کو بھینٹ چڑھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس، ادب میں مقصدیت و ادبیت کے درمیان، نیز اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان معقول تناسب و توازن کا خیال رکھنا مجھے زیادہ پسند تھا۔
>
> اپنے اسی ذہنی رویے کے ساتھ میں نے ہمیشہ ادب کے نئے نئے رجحانات کا جائزہ لیا ہے۔ اور ان میں ادب و زندگی کے لئے مجھے جو کچھ قابلِ قبول نظر آیا ہے، اس کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔"

اس ضمن میں ان کے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں :

ایک پودا جو اگا ہے اسے پانی دینا
اپنے آنگن کو نئی رُت کی کہانی دے
جو منظر بھی دل کو لبھائے، بھر لو اس کو آنکھوں میں
کیا جانے کل کی بارش تک اُڑ جائے کس کس کا رنگ
میری اپنی خواہشوں نے آج تک
نت نئے سانچے میں ڈھالا ہے مجھے

قیصر شمیم کے اشتراکی شعور کو سمجھنے سے پہلے ان کی ذات سے متعلق چند گوشوں پر روشنی ڈالنی بھی ضروری ہے۔ ان کی پیدائش ۲ر اپریل ۱۹۳۶ میں مغربی بنگال کے ضلع ہگلی کے ایک قصبہ انگس میں ہوئی، جو مزدور طبقوں کے لوگوں پر مشتمل ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ ان کے والد محترم عبدالرحیم خان کا تعلق بھی اسی مزدور طبقے سے تھا۔ انگس کے اس علاقے میں بنگلہ بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لئے بچپن ہی میں انھیں بنگلہ زبان سے خاصی واقفیت ہوگئی تھی۔ انگریزی سیکھنے کی لگن بھی قیصر شمیم کو بچپن سے تھی۔ اور نوعمری ہی میں انھوں نے اس زبان پر ایسی قدرت حاصل کر لی تھی کہ اسکول اور کالج میں ان کے اساتذہ کو بھی ان کی انگریزی کی اس اہلیت پر حیرت و تعجب ہوا کرتا تھا۔ سینٹرل کلکتہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) میں انھوں نے انگریزی آنرز میں داخلہ لیا۔ جس سے انگریزی زبان و ادب پر ان کی دست گیری میں مزید اضافہ ہوا۔ مگر کاتبِ تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ گھریلو حالات

www.taemeernews.com

کچھ ایسے بگڑے کہ ان کا تعلیمی سلسلہ کچھ عرصے کے لئے رک گیا۔ الغرض انگریزی زبان وادب سے بے پناہ لگاؤ کا یہ نتیجہ تھا کہ قیصر شمیم نے مختلف سیاسی، سماجی اور ادبی نظریوں کا براہِ راست انگریزی میں مطالعہ کیا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ ترقی پسند تحریک سے جڑ گئے تھے۔ حساس ذہن، فہم وفراست کی غیر معمولی صلاحیت اور مطالعے کے شوق کے سبب وہ اشتراکی ادب کے ہر گوشے اور ہر پہلو سے روشناس ہوتے گئے۔ چنانچہ جیسا کے پہلے کہا گیا کہ ان کے اشتراکی شعور کا جائزہ لینے کے لئے اشتراکیت کے مختلف مکتبۂ فکر سے متعلق بنیادی واقفیت کا ہونا لازمی ہے۔

1516 میں ٹومس مور کی شہرہ آفاق کتاب Utopia شائع ہوئی۔ مور نے اپنی اس تصنیف میں ایک ایسے تصوراتی جزیرے کی تصویر کشی کی ہے، جہاں انفرادی مفادات سماجی مفادات کے تابع ہوتے ہیں جہاں کے انسان مل جل کر کام کرتے ہیں۔ سبھوں کی تعلیم اور مذہب میں یکسانیت ہے۔ اس جزیرے کی تمام زمین تمام شہریوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ مور کی یہ کتاب اشارہ وکنایہ میں اس وقت کے انگریزی سماج کے زمیندارانہ نظام پر ایک طنزیہ حملہ تھا۔ Utopia کی پیروی میں بہت ساری تصانیف سامنے آئیں، جن میں مشہور فرانسیسی مفکر Voltair کی Candide تا مور انگریزی ناول نگار Samuel Butler کی Erewhon اور معروف انگریزی شاعر William Morris کی A Dream of John Ball قابلِ ذکر ہیں۔ اپنے طالب علمی کے زمانے ہی میں قیصر شمیم نے ان تمام تصانیف کی جب صفحہ خوانی کی، تو ان کے اندر چھپے ہوئے ایک حساس انسان نے اشتراکیت کے اثرات کو اپنے اندر جذب ہوتا محسوس کیا۔

لیکن اشتراکیت کے نظریے میں باقاعدگی 1789 کے فرانسیسی انقلاب کی مرہونِ منت ہے، جس میں Liberty، Equality اور Fraternity کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اور ۱۸ ویں صدی کے آغاز میں انگلینڈ اور فرانس کی سرزمین سے مختلف اشتراکی مکاتبِ فکر کا سیاسی وسماجی اُفق پر ظہور ہونے لگا تھا۔ ان میں فرانس کے St Simon اور Fourier، اور انگلینڈ کے Robert Owen سب سے زیادہ مشہور اور معروف تھے۔ انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت نہیں کی، بلکہ سرمایہ داروں کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر غریبوں اور مزدوروں کو انسانیت کی نگاہ سے دیکھنے کی تلقین کی۔ لیکن اپنی اس مہم میں انھیں بجز افسردگی کے کچھ ہاتھ نہ آیا، کیونکہ اس نظریے کو عملی جامہ پہنانا آسان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے علمبردارانِ اشتراکیت اس نظریے کو خیالی اشتراکیت یا Utopian Socialism کے نام سے موسوم کرنے لگے۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ ان کی یہ ناکامی جدید اشتراکیت کے پیروں کے لئے ایک سبق بنی۔ اس سبق کو کارل مارکس اور فریڈریک انگلز نے بھی خوب پڑھا، اور "نئے کوہ قاف کی کھوج میں" لگ گئے :

www.taemeernews.com

وہ ستم ستم کئی راستے، وہ الم الم کئی پیچ وخم

لیے اپنے ساتھ گزر گئے

ہمیں دے گئے

نئی ساعتوں کے دیار میں

نئی رہ گذر، نئے پیچ وخم

نئے منظروں کی نمائشوں میں گھرے ہوئے نئے بام ودر

نئی کلفتیں، نئی حسرتیں اسی ہاؤ ہو کے مقام پر

اسی ہاؤ ہو کے مقام پر

نئے حوصلوں کا ہے امتحاں

نئی منزلوں کے جو خواب ہیں

نئے کوہ قاف کی کھوج میں کہیں گم نہ ہوں، کبھی گم نہ ہوں

ابھی مرحلے کئی اور ہیں

ابھی مسئلے کئی اور ہیں (نئے کوہ قاف کی کھوج میں)

مارکس نے مادّی اور سماجی ارتقاء کے اصول دریافت کیے، اور یہ بتایا کہ "ماضی اور حال کی پوری انسانی تاریخ، طبقاتی کشمکش کی تاریخ رہی ہے۔" موجودہ صنعتی دور میں بھی کسی نہ کسی صورت میں یہ کشمکش بورژوا اور پرولتاریہ کے درمیان جاری ہے۔ مارکس کو سرمایہ دارانہ نظام میں انقلاب کا وہ بیج صاف دکھائی دیتا ہے جو اس طبقاتی کشمکش کا خاتمہ کر ڈالے گا۔ اس کے بعد صرف ایک ہی طبقہ باقی رہ جائے گا۔ اور وہ پرولتاری طبقہ ہوگا۔ پھر نہ کوئی استحصال کرنے والا ہوگا، اور نہ ہی کوئی استحصال کا شکار۔ ہر کوئی کہے گا:

زندگی کھل کے مسکرائے گی

میرے اجڑے ہوئے گلستاں میں

ہنستی گاتی بہار آئے گی

(تجھ سے مل کر......)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مارکس نے انارکزم کی طرح ریاست کے خاتمے کی بات نہیں کی، بلکہ پرولتاری آمریت کو ایک مجبوری دور بتایا، جو سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی طبقاتی طرزِ شعور کے آخری آثار تک مٹا ڈالیگا۔

www.taemeernews.com

قیصر شمیم نے مارکس اور اینگلز کے ان نظریوں کا اپنی نو عمری ہی میں مطالعہ کیا اور ان سے گہرے اثرات بھی قبول کئے۔ ان کی پیدائش چونکہ جوٹ مل کے مزدوروں کی ایک بستی میں ہوئی تھی۔ بعد میں وہ ضلع ہوڑا کی ایک پسماندہ بستی شیب پور منتقل ہوئے۔ یہ علاقہ بھی صنعتی مزدوروں پر مشتمل تھا، اس لئے غریب مزدوروں کی ناگفتہ بہ زندگی کی مکمل تصویر ہر وقت انکی آنکھوں کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ یورپ کے صنعتی محنت کشوں کے جن حالات کو دیکھ کر مارکس کا دل تڑپ اٹھا تھا، بنگلی کے انکس اور ہوڑہ کے جی ٹی روڈ کے قریب اس بستی میں مزدوروں کی زندگی بھی استحصال کے شکار ان یوروپی محنت کشوں سے چنداں بہتر نہ تھی۔ یہاں بھی مٹی کے تنگ بوسیدہ گھروں میں زندگیاں سسک رہی تھیں جن کے نقوش واضح طور قیصر شمیم کی شاعری میں ملتے ہیں:

اس لمبی چوڑی دنیا میں میرا یہ چھوٹا سا کمرہ
جیسے باغ کے اک کونے میں مٹی کا اک پنجرہ ہے
کاٹ رہا ہوں اپنے دن میں اس پنجرے میں گھٹ گھٹ کر
یہ جیون کیسا جیون ہے، یہ جینا کیا جینا ہے۔

(نظم : میرا کمرہ)

اروں میں بھی ان نصیب کے ماروں کے گھروں سے خوشیاں لوٹ جایا کرتی تھیں۔ جب ان کے گھروں کے چولہے سرد، ہانڈیاں خالی اور بچے بھوک سے بلکتے ہوں تو پھر بھلا ان کے لئے عید کی خوشی کیسی؟ عید کا دن ان پر اور بھاری پڑنے لگتا تھا ان کے اس حال زار کا غم کبھی کبھی طنزیہ لہجہ اختیار کر لیا کرتا تھا:

چولہا ٹھنڈا،
ہانڈی خالی، پیٹ بھی خالی ہے تو کیا؟
تن پر لٹکا یا بدحالی ہے تو کیا؟
بدحالی سے رسوائی کیا؟ عید مناؤ،
عید مناؤ! (نظم : عید مناؤ)

زندگی ان دنوں کیا ہے قیصر جھیلنے والا سمجھتا ہوگا

جب کہ پاس ہی جی ٹی روڈ کی دوسری جانب استحصال کرنے والے جوٹ مل کے مالکوں اور افسروں کی پر تعیش زندگی تھی۔ وہ ان غریب مزدوروں کا خون چوسا کرتے تھے اور قیصر شمیم کو ان شکاریوں کے دانتوں میں

www.taemeernews.com

گے ان بے بس مزدوروں کا خون صاف دکھائی دیتا تھا :

شکاریوں کے درمیاں / گھری ہوئی ہے نیل گائے

لہولہان ہے بدن / شکاریوں کے دانت بھی لہو کی طرح سُرخ ہیں!

(نظم : نیل گائے)

اس غریب لاچار طبقے کو اپنے پیروں تلے روندنا ان اونچے طبقے والوں کے لئے باعثِ فخر فعل تھا۔ اپنی ایک نظم، ''قلم کا سپاہی'' میں منشی پریم چند کے حوالے سے اس غیر انسانی حرکت کی جانب کچھ یوں اشارہ فرماتے ہیں :

گاؤں گاؤں کی گلی گلی میں
تم نے دیکھے

کچلے ہوئے انسان
کچلے ہوئے انسانوں کے گھر
فاقے دیکھے
فاقوں کے آنگن میں دیکھا
لُٹا ہوا کھلیان
لُٹے ہوئے کھلیان کے پیچھے
چند کڑی مونچھوں والوں کی شان
تم نے دیکھا
صدیوں پرانی ایک چکی میں پسنے والا
بھوکا ہندو
تم نے کانپتے دل سے دیکھا،
بھوکے ہندوستان کے سر پہ
بنے ہوئے تھے گہرے گہرے
بوٹ کے چند نشان

www.taemeernews.com

قیصر شمیم نے روس اور چین کی عملی اشتراکیت کی تاریخ کا جب جائزہ لیا تو حیرت میں پڑ گئے کیونکہ یہاں مارکس کے بنیادی نظریے میں بہت ساری ترمیمات کی گئی تھیں۔ مارکس نے واضح طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ اشتراکیت کا نفاذ سب سے پہلے اس ملک میں ہونا چاہیے جو صنعتی اعتبار سے کافی ترقی یافتہ ہو۔ چونکہ برطانیہ اس وقت صنعتی لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا اس لئے مارکس کے مطابق اشتراکیت کے نفاذ کے لئے برطانیہ سب سے زیادہ مناسب اور موزوں ملک تھا۔ دوسرے لفظوں میں صنعتی ترقی کے بعد ہی اشتراکی دور کی شروعات ہونی چاہئے تھی۔ اس پر روس میں بالشویکوں اور مینشویکوں کے درمیان اختلافات بھی رونما ہوئے۔ الغرض مارکس کے ان اصولوں میں ترامیم حالات کے مدِ نظر شاید ضروری ہوں، لیکن آگے چل کر انہی ترامیم نے اشتراکی نظریے میں اختلافات کو جنم دینا شروع کیا۔ لینن نے 'پرولتاریہ کی آمریت' کی بجائے 'پرو ریہ پر آمریت' کے نظریہ کو ترجیح دی۔ اس کے لئے اس نے پارٹی سسٹم کے طریقۂ کار کو اپنایا۔ جب کہ اسٹالین نے انقلاب کے لئے ملک کے داخلی طاقت کی بجائے خارجی قوت کے تعاون پر سارا زور صرف کیا۔ ماؤزے تنگ نے بھی چین کے حالات کے مطابق اشتراکی نظریے کی از سرِ نو تشریح و تشکیل کی۔ روس نے مغربی ممالک کی مثال سامنے رکھ کر " خوش حالی کا ماڈل" اپنایا تھا، جب کہ چین اور ویت نام نے اپنے سماجی، سیاسی اور جغرافیائی حالات کے مدنظر " کفایت شعاری کے ماڈل" کو ترجیح دی، جو تیسری دنیا کے ایشیائی ممالک کے لئے زیادہ موزوں اور سازگار تھا۔ اس طرح مارکس کے بنیادی اشتراکی نظریے میں وقت اور حالات کے پیشِ نظر ترمیمات اور توسیعات کی گئیں۔ نیز اس نظامِ فکر کو اس طرح روبہ کار لایا گیا کہ ناقدین اسے کلیت پسندی (Totalitarianism) کے نام سے موسوم کرنے لگے، جو بلاشبہ ایک غیر جمہوری نظام ہے۔ قیصر شمیم ان ناقدین کی رائے سے اتفاق رکھتے نظر آتے ہیں۔ اسی لئے وہ جمہوری اشتراکیت کے نظریے کے ظہور کا خیر مقدم کرتے ہیں :

نئے حوصلوں کا ہے امتحان
نئی منزلوں کے جو خواب ہیں
نئے کوہِ قاف کی کھوج میں کہیں گم نہ ہوں، کبھی گم نہ ہوں
ابھی مرحلے کئی اور ہیں / ابھی مسئلے کئی اور ہیں

(نئے کوہِ قاف کی کھوج میں)

اس نظریے کی رو سے اشتراکیت انقلابی نہیں بلکہ ایک ارتقائی فلسفہ ہے، جو تدریجیت (Gradualism) کے اصول پر قائم ہے۔ جمہوری اشتراکیت، ریاست کو سماجی استحصال کا آلہ نہیں مانتی، بلکہ اسے ایک ایسی مشنری

www.taemeernews.com

سمجھتی ہے جو سماج میں سیاسی اور معاشی قوت کی از سرِ نو منصفانہ تقسیم کرنے میں ایک موثر کردار ادا کرسکتی ہے۔ لہٰذا امریکہ کی جمہوری اشتراکی تحریک کے رہنما نارمن ٹوس اشتراکیت کے اس مقصد کی جانب کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہیں :

> "What socialists want now is not nationalisation, but socialisation,in which owners and consumers, rather than the state,directly participate in the ownership and management of a public owned industry."

قیصر شمیم کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کبھی لکیر کے فقیر نہیں بنتے۔ وہ اپنے دل و دماغ کے دروازے سدا کھلے رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ نئے نئے نظریوں کا مطالعہ کیا اور اگر ان نظریوں میں زندگی اور سماج کا کوئی نیا رجحان دیکھا تو نہایت خندہ پیشانی سے اس رجحان کا خیر مقدم کیا، اور اسے اپنی شاعری میں جگہ دی:

بدلا ہوا لہجہ ہے نہ تقریر نئی ہے — پھر بھی تری ہر بات میں تاثیر نئی ہے

پُرکھوں سے ملا تھا جو روایات کا ترکہ — ہاتھوں میں مرے آج وہ جاگیر نئی ہے

اشتراکیت کا ایک نظریہ فیبین ازم بھی ہے۔ فیبین سوسائٹی کا قیام 1884 میں ہوا تھا۔ John Stuart Mill, Annie Besant اور George Bernard Shaw اس کے سرگرم رکن تھے۔ مارکس کے انقلابی نظریہ کے برعکس فیبین ازم اشتراکیت کی تشکیل رائے عامہ کے ذریعہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے وہ پروپگنڈا اور پبلک سیٹی کو ایک مشنری کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ یہ صرف مزدور طبقوں ہی کی نہیں بلکہ سرمایہ دار طبقوں کی بھی فلاح و بہبود چاہتی ہے۔ قیصر شمیم فیبین ازم کو صحیح معنی میں اشتراکی تحریک نہیں مانتے۔ ان کے مطابق فیبین ازم سرمایہ دارانہ نظام کے لئے ایک حفاظتی ڈھال ہے جس کا استعمال مزدور طبقے کی انقلابی تحریک کو روکنے کے لئے کیا گیا۔ لہٰذا وہ خود ہی فرماتے ہیں :

کیا سمجھتا ہے تو واعظ، ہم جیسے نا سمجھوں کو

ہم کب غیروں کی سنتے ہیں، ہم کب اپنے بس میں ہیں۔

ہم نشیں، اب ہماری فکر نہ کر

ہم کو آشفتہ حال رہنے دے

آج میرے تپیدہ چانوں پر

اپنی زلفیں نہ ڈال، رہنے دے

www.taemeernews.com

اشتراکی نظام کے قیام کے لئے جمہوری اشتراکیت کی طرح گلڈ سسٹم کا بھی ایک نظریہ ہے، جو اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لئے پُرامن دستوری اور بتدریج تبدیلی چاہتا تھا۔ یعنی یہ نظریۂ اشتراکیت سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے معاشی طاقت مزدوروں کے ہاتھوں میں بتدریج منتقل کرنے میں یقین رکھتا تھا۔ گلڈ اشتراکی نظریہ نے اپنے مقصد کی حصولیابی کے لئے صرف قانونی اور پارلیمانی طریقوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایک اور انقلابی اشتراکی نظریۂ سنڈی کل ازم (Syndicalism) کی طرح براہ راست ایکشن لینے کی ضرورت کو بھی جائز قرار دیا اور ریاست کو وہ طاقت بھی عطا کرنی چاہی جس کے توسّل سے سرمایہ دار طبقوں کی مزاحمت کی سرکوبی کی جا سکے۔ چونکہ سنڈی کل ازم کے برعکس گلڈ اشتراکیت تشدد کا استعمال کرنا نہیں چاہتی ہے، اس لئے قیصر شمیم گلڈ اشتراکیت کے اس نظریہ کو جمہوریت اور سنڈی کل ازم کا درمیانی راستہ تسلیم کرتے ہیں :

چیخوں کے موسم میں قیصر، چپ جور ہے وہ مجرم ہے　　　منھ تو کھولو، کچھ تو بولو، کس کو خبر ہے، کل کیا ہو

نہرو کے اشتراکی نظریہ کے متعلق قیصر شمیم کی رائے ہے کہ اشتراکیت نہرو کے لئے ایک نظریۂ حیات نہیں بلکہ ایک رجحان تھا، جو روس میں سوشلسٹ تجربوں کی کامیابی کے زیر اثر آیا تھا۔ مگر قیصر شمیم گاندھی جی کے اشتراکی نظریے سے بہت حد تک متاثر ہوتے دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ گاندھیائی اشتراکیت انسان دوستی اور اخلاقی اوصاف پر مبنی تھی۔ گاندھی جی نجی ملکیت کو چھین کر معاشی استحصال کا خاتمہ نہیں چاہتے تھے، بلکہ ان کا یہ خیال تھا کہ امرا اپنی ملکیت کو ایک امانت یا وقف (Trust) سمجھیں۔ وہ انسانی ضروریات کو محدود کرنے اور سیدھی سادی زندگی بسر کرنے کی صرف تلقین ہی نہیں کرتے بلکہ بذاتِ خود اس پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے۔ اشوک مہتہ کے لفظوں میں " گاندھی جی نے جس جمہوری نظام کا تصور اپنے ذہن میں پیدا کیا تھا اس میں اقتدار کا استعمال بتدریج کم ہوتا جاتا تھا اور جو معاشرے کے عناصر کو قائم رکھتے ہوئے نیچے سے اوپر کی طرف چلتا تھا۔" مگر گاندھی جی کے اس اشتراکی نظریے کو ہم آج بھلا چکے ہیں۔ قیصر شمیم اپنی ایک نظم " تمہاری یاد آتی ہے" میں گاندھی جی کو کچھ یوں مخاطب کرتے ہیں :

تمہاری یاد آتی ہے
مگر اس یاد میں آنسو نہیں ہوتے
تمہیں کھونے کا پچھتاوا / بھی اب دل کو نہیں ہوتا
کہ وہ دنیا / بدل کر رہ گئی ہے،
جس کی مٹی میں کبھی تم نے

www.taemeernews.com

بہت سے خواب بوئے تھے

تمہارے خواب / اس مٹی میں

یوں بے جان ہو کر رہ گئے ہیں

جیسے اپنی گود کے پالے ہوئے

معصوم بچے / دفن ہو کر رہ گئے ہوں

اپنے ہی آنگن کی قبروں میں!

غرض کہ ان تمام اشتراکی مکتبہ ہائے فکر میں قیصر شمیم کو تین چیزیں مشترک نظر آتی ہیں۔ اول، استحصالی نظام کا خاتمہ؛ دوئم، مساوات پر مبنی سماج کی تشکیل اور سوئم، اس خاتمے اور تشکیل کا آلۂ کار۔ یہ آلۂ کار کیسا ہو اس بارے میں اشتراکیوں میں نظریاتی اختلاف ہے۔ کوئی ہتھیار بند انقلاب کا طریقہ اپنانا چاہتا ہے، تو کوئی جمہوری انجمنوں کا۔ ویسے تو قیصر شمیم جمہوری طریقے سے ہی اشتراکیت کی بحالی چاہتے ہیں لیکن جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ سیاسی مساوات کی فراہمی معاشی مساوات کے بغیر بے سود ہے تو وہ دل برداشتہ ہو کر کہہ اٹھتے ہیں :

موج دریا تو لوٹتی ہی نہیں ناؤ کاغذ کی کیا بہاؤں میں

قیصر شمیم اشتراکیت کو مساوات اور سماجی انصاف کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات کو کبھی نہیں بھولتے کہ انسانی سماج میں ہمیشہ مساوات کا فقدان رہا ہے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ انسان پیدائشی طور پر ایک دوسرے کے برابر ہے۔ جغرافیائی حالات، توراث اور دیگر اسباب کی بنا پر ایک آدمی دوسرے آدمی سے جسمانی اور ذہنی طور پر مختلف ہو سکتا ہے۔ قیصر شمیم اس نابرابری کا رونا نہیں روتے، بلکہ اپنی ملامت کا نشانہ اس غیر مساوی نظام کو بناتے ہیں جس کی ساخت و پرداخت انسان نے خود اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ مساوات کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہر شخص کو اپنے کام کیلئے برابر اجرت ملے۔ اسی لئے تو utopian اشتراکی نظریہ رکھنے والے Owen کا اشتراکی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ وہ خواب جس میں انھوں نے مکمل مساوات پر مبنی ایک چھوٹے سے اشتراکی سماج کی جھلک دیکھی تھی۔ حتیٰ کہ روس اور چین جیسے اشتراکیت کے دعویدار بھی مکمل مساوات سے پہلوتہی کرتے رہے ہیں۔ ایسے میں قیصر شمیم جیسی شخصیت کے لئے مساوات کا مطلب صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کس طرح معاشرے کے ہر فرد کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ مختصر یہ کہ قیصر شمیم نظریاتی طور پر مارکسی اور دیگر مغربی اشتراکی نظریوں کے حامل تو نظر آتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ گاندھیائی اشتراکیت کے قریب تر لگتے ہیں۔ گاندھی جی کی طرح ان کا اشتراکی شعور بھی سادگی، متانت، انسان دوستی اور اخلاقی اوصاف پر مبنی ہے۔ انکی طرز حیات خود اسکی دلیل ہے۔

www.taemeernews.com

تبھی تو استحصالی نظام کے خاتمے کے لئے وہ خدا سے کچھ یوں فریاد کرتے ہیں :

دھوئیں کی گود میں جو زہر پی کر پل رہے ہیں وہ بھی تیرے ہیں
نشے میں دولتوں کے اینڈتے جو چل رہے ہیں وہ بھی تیرے ہیں
تجھے "کمزور لوگوں کا خدا" جو مانتے ہیں وہ بھی تیرے ہیں
تری دنیا کو جو اپنے ستم کی زد میں رکھتے ہیں
جو آدم زاد آدم زاد ہی کا خون چکھتے ہیں
تباہی کے دہانے پر جو لے آئے ہیں دنیا کو
تلے ہیں روکنے پر جو ابھی سے صبح فردا کو
وہ بندے کس کے بندے ہیں؟
وہ بندے بھی تو تیرے ہیں!

(سب کو خوشی دے دے)

ان کی ایک چھوٹی سی نظم "پرازر پائن کی واپسی" کو اگر ان کے اشتراکی شعور کی آئینہ دار کہا جائے تو بے جا نہیں۔ قدیم روم کی اساطیری کہانیوں میں سیرس (Ceres) زراعت کی دیوی ہے۔ جب کہ پاتال کا بادشاہ پلوٹو (Pluto) موت کا دیوتا ہے۔ سیرس اپنی بیٹی (Proserpine) کی شادی پلوٹو سے اس وعدے پر کراتی ہے کہ ہر سال پلوٹو پرازر پائن کو اسکے میکے بھیجا کرے گا۔ ہر سال جب بھی پرازر پائن اپنی ماں سیرس سے ملنے آتی ہے تو سیرس مارے خوشی کے غلے اور پھلوں کی بارش کرنے لگتی ہے۔ جس سے وہاں کے عوام آسودہ حال ہو جاتے ہیں۔ قیصر شمیم نے قدیم روم کی اس اساطیری کہانی کے پیرائے میں اپنی اشتراکی شعور کو نہایت چابک دستی اور فن کارانہ بالغ النظری سے پیش کیا ہے۔

اب کے برس بھی پرازر پائن
پلوٹو کے پاتالی گھر سے
سیرس کے گھر آئی نہیں ہے
(کتنا بھیانک سناٹا ہے!)
پلوٹو شاید اپنا وعدہ بھول گیا ہے
یا دھرتی کے داتو جیسے بھگوانوں نے

www.taemeernews.com

اس پر سایہ ڈال دیا ہے !
کچھ بھی ہو، لیکن یہ سچ ہے
بھول نہیں سکتی ہے عورت اپنا میکہ

اُس کی اپنی کوکھ ہی اس کو
ماں کی کوکھ نظر آتی ہے
ماں کے درد کا اک اک لمحہ
اس کو یاد آتا رہتا ہے
کیسا ہے یہ درد کا رشتہ!
یہ رشتہ ہی پرازر پائن کو ماں کے گھر لے آئے گا
اور اسی دن سُونی دھرتی کا سناٹا چھٹ جائے گا

(پرازر پائن کی واپسی)

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قیصر شمیم نے اشتراکیت کے مختلف نظریوں کا نہایت تبحر و تعمق سے مطالعہ کیا۔ ان میں سے انھیں جو زیادہ موثر، قابلِ عمل اور لائق اعتنا لگا وہ ان پر عمل پیرا ہوئے۔ انھوں نے ان نظریوں کو اپنی شاعری میں بڑی خوش اسلوبی سے سمونے کی کوششیں کیں۔ بے حد احتیاط سے شعری ہیئتوں کا انتخاب کیا۔ اور یہ بھی مسلم الثبوت ہے کہ انھوں نے اردو کی روایتی و غیر روایتی رجحانات کے ساتھ ساتھ فارسی، بنگلہ، ہندی اور انگریزی ادب کے رجحانات کو قابلِ قبول سمجھا اور ان سے خاصا استفادہ بھی کیا۔ ان کے اشعار میں جا بجا اس کی علامتیں ملتی ہیں۔ مثلاً :

رات، جنگل ، خامشی ، تنہا سفر ، سو وسوسے
دے نہ منزل کا نشاں ، پر نقشِ پا تو دے مجھے

اور فارسی کے مشہور شاعر منوچہری دامغانی کا یہ شعر ملاحظہ ہو :

کارواں رفت، تو در خواب و بیاباں در پیش
کیں روی، رہ کہ ز پرسی ، چہ کنی ، چوں باشی

قیصر شمیم کے یہ اشعار دیکھئے :

www.taemeernews.com

کیا دوسرے پہاڑ پہ تیشہ چلاؤ گے؟
کب تک یہ پہاڑوں سے پنجے لڑاؤ گے؟
فرہاد کا یہ فرض کہاں تک نبھاؤ گے؟
جس نہر کی تلاش ہے وہ نہر پاؤ گے؟

(نظم: بتیسواں پہاڑ کٹنے کے بعد)

شیخ سعدیؔ فرماتے ہیں :

ای عاقل ! اگر پای بہ سنگیت برآید — فرہاد بدانی کہ چرا سنگ بریدا ست
رحمت نہ کند بر دلِ دیوانۂ فرہاد — آن کس کہ سخن گفتن شیریں نشنید است

اسی طرح ان کی نظم "نئی صف" جو انھوں نے پرویز شاہدی کی آٹھویں برسی پر لکھی ہیں بنگال کے نامور جدید شاعر سبھاش مکھوپادھیائے کی نظم "پھیرے پھیرے" کی یاد تازہ کردیتی ہے :

میں چل رہا ہوں
چل رہا ہوں
چل رہا ہوں آج بھی
اسی طرف
جدھر تری نگاہ تھی

(قیصر شمیم)

سیڑی دیئے گھورے گھورے آمی نامچی — گھومتا ہوا سیڑھیوں سے میں اتر رہا ہوں
نامچی — اتر رہا ہوں
نامچی — اتر رہا ہوں

(سبھاش مکھوپادھیائے) — (ترجمہ)

ان کے اشعار میں انگریزی شاعری کی بھی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "یہ گوشۂ تنہائی" پڑھتے وقت لاشعوری طور پر ہمارا ذہن William Wordsworth کی مشہور نظم The Daffodils کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم "تمہاری یاد آتی ہے" Thomas Hood کی نظم I Remember I Remember کی یاد دلادیتی ہے۔ ان کی نظم "تنہائی"، "پرانز پائن کی واپسی"

www.taemeernews.com

وغیرہ انگریزی ادب ان کی گہری نظر کی غمازی کرتی ہے۔ ان کی نظم "مجھے دکھ ہے" پڑھئے تو فوراً نظروں کے سامنے John Keats کی شہرآفاق نظم Ode to a Nightingale ابھرنے لگتی ہے۔ ان کا یہ شعر :

زندگی کا کوئی موسم ہو بدل ہی جائے گا
میں پنپ سکتا ہوں، مٹی میں دبا تو دے مجھے

اور P.B.Shelley کی معروف نظم Ode to the West Wind کی یہ سطور ملاحظہ کریں :

hou
Who chariotest to their dark wintry bed
The winged seeds, where they lie cold and low,
Each like a corpse within its grave,until
Thin azure sister of the Spring shall blow
Her clarion o'er the dreaming earth, and fill
(Driving sweet buds like flocks to feed in air)
With living hues and odour plain and hill

ان کے گیت ان کی ہندی دانی کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ "آگھات"، "کب تک نیر بہائے کوئی"، "ہائے یہ آگ بجھائے کون؟" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن کے پڑھنے سے ایک ہندی کوی کی چھبی ابھر کر ہمارے سامنے آنے لگتی ہے:

مایا کا بندھن ہے پُرانا، من من میں ہے لوبھ کا روگ
اس لوبھی سنسار میں رو کر، تیاگ کا راگ سنائے کون؟
ہائے یہ آگ بجھائے کون؟

(ہائے یہ آگ بجھائے کون)

اس طرح اشتراکیت کی بوقلمونی اور انسانیت کے جذبے سے سرشار؛ فارسی، ہندی، بنگلہ اور انگریزی زبان وادب سے سیراب، سادہ لوح، بلند فکر، قیصر شمیم اردو زبان وادب کا ایک سرچشمہ ہیں۔ ایسا سرچشمہ جو بنگال کے سیکڑوں شاعروں اور ادیبوں کی آبیاری کرتا رہا ہے، اور جس نے بنگال کے اردو ادب کو ایسی شادابی بخشی ہے کہ مستقبل قریب میں اس سرزمین سے اردو کے نئے نئے پودے اگنے اور ان سے بے شمار کونپلیں پھوٹنے کی امیدیں کی جاسکتی ہیں۔ ایسی کثیر الجہات شخصیت اور فقید المثال انسان آج کل نایاب ہے۔ ان کا احترام ہم پر لازم ہے:

مری آہ پر نہ دو دھیان تم، نہیں اس کا کوئی گلہ، مگر
مرا درد جس کا ہے مستحق، وہی احترام تو دو کبھی

www.taemeernews.com

ڈاکٹر کوثر مظہری

دہلی

قیصر شمیم کی نظمیں

اناج سے لدی ہوئی گاڑی کو ریشم کی ڈور سے کھینچنا مشکل ہے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں اور نہ کوئی نظریہ ہے۔ دراصل فکر کی کجی کو راست کرنے کا طریقہ ہے۔ میں یہاں چوں کہ غزل کے بجائے نظم کے حوالے سے گفتگو کرنے جا رہا ہوں اس لیے شعور نقد بھی تھرتھراہٹ کا شکار ہے کہ نظم میں جس فکری گہرائی اور انداز پیشکش کو ہم آپ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، بہر حال اس کا ریشم کی ڈور (یعنی غزل اور اسلوب غزل) سے علاقہ کم کم ہی ہے۔

قیصر شمیم نے غزلیں بھی کہی ہیں اور کیا خوب کہی ہیں لیکن ان کی نظموں میں جو کھردرے لہجے کا بانکپن اور فکری شعور ملتا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھیں نظم کے کینوس پر الفاظ و تراکیب اور شعور و افکار کا رنگ بھرنا خوب آتا ہے۔ ایسا ممکن اس لیے ہوا ہے کہ ان کی فکری جڑیں اپنی ہی مٹی میں پیوست ہیں۔ جس طرح اخترالایمان کی تھیں۔ قیصر شمیم کی ایک نظم ہے "جیون پتھ پر" جسے پڑھتے ہوئے اخترالایمان کی نظم "پگڈنڈی" کی یاد آتی ہے۔ یہ نظم پگڈنڈی کی طرح طویل نہیں ہے۔ دو بند ملاحظہ کیجیے :

اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے
گھور اندھیرے جیون پتھ پر
ننھی منی آشاؤں کے
جلتے بجھتے دیپ لیے میں
جانے کب سے بھٹک رہا ہوں
آج اکیلے اندھیارے میں
ننھی منی آشاؤں کے
جلتے بجھتے دیپ لیے میں
اپنی منزل ڈھونڈ رہا ہوں

www.taemeernews.com

ہر فنکار اپنے عہد یا پیش رو قریب کے فن اور اسلوب سے متاثر ہوتا ہے۔ متاثر ہونے کا عمل بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ اختر الایمان اپنے عہد کے شاعروں میں اور بالخصوص نظم نگاروں میں ایک بڑا نام ہے۔ اختر الایمان جیسا دکھ اور ماضی، اپنی زمین اور مٹی کی مہک قیصر شمیم کی نظموں میں موجود ہے۔

"سر راہے" جو ایک مختصر سی نظم ہے، اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس عہد کے کرب کو، زندگی کے بدلتے رشتوں کو بڑی خوب صورتی سے قیصر شمیم نے اس چھوٹی سی نظم میں پیش کر دیا ہے۔ دس مصرعوں کی اس نظم سے کچھ مصرعے دیکھیے :

بعد مدت کے ملاقات ہوئی ہے تم سے
آؤ، کچھ دیر کہیں بیٹھ کے ہم بات کریں
کیا خبر، پھر کسی منزل میں ملیں یا نہ ملیں
کیا خبر، دوسرے دن زیست کہاں لے جائے
کیا خبر، وقت بھلا دے سب کو
اور پھر ہم جو ملیں بھی تو نہ پہچان سکیں
آؤ، کچھ دیر کہیں بیٹھ کے ہم بات کریں

یہاں بھی "وقت" کو مرکزیت حاصل ہے۔ قیصر شمیم نے بھی اختر الایمان کی طرح وقت کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اپنے فکر و شعور سے ہم آمیز کر کے اسے منظوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اختر الایمان کی نظمیں ایک لڑکا، باز آمد، تبدیلی، عہد وفا، پرانی فصیل، یادیں اسی قبیل کی ہیں۔ نظم "تبدیلی" کا یہ حصہ دیکھیے :

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے "او بے او سر پھرے"
دونوں اک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
گھنٹوں اک دوسرے کی سنیں اور کہیں (تبدیلی/ اختر الایمان)

آج وقت کس کے پاس ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگوں کے پاس وقت ہی وقت ہوا کرتا تھا۔ پوری پوری رات داستاں سرائی میں گزر جایا کرتی تھی۔ وقت کے ساتھ داستان بھی قصۂ پارینہ بن گئی۔ آج شاعر کا احساس

www.taemeernews.com

ہے کہ آج اس کا عزیز دوست / محبوب بعد مدت کے ملا ہے تو اس سے کچھ دیر مل بیٹھ کر غنیمت جان کر اگر ہم باتیں نہ کرلیں تو معلوم نہیں دوسرے دن زندگی ہمیں کہاں لے جائے اور پھر ہم وقت کے جلوے نکل کر کہیں گم ہو جائیں۔

اس نظم میں وقت سے شاعر سراسیمہ ہے جو اس کا مشاہدہ ہے۔ اس تلخ تجربے اور مشاہدے نے قیصر شمیم کی نظم میں نئی حسیت اور سچائی کے عناصر بھر دیے ہیں۔

نظم ''چرواہے'' میں قیصر شمیم نے شہر سے اکتا کر گاؤں کی طرف آنے والے کردار کو پیش کیا ہے۔ شہری آب و ہوا اور بو باس میں رچ بس کر آدمی خود غرض اور Introvert ہو جاتا ہے۔ شاعر گاؤں کی فضا پیش کرتا ہے۔ چرواہے کی عکاسی ملاحظہ کیجیے۔ :

آؤ چلیں چرواہی کرنے ، چرواہے بن جائیں
باندھیں اپنے سر پہ مریٹھا اور گھٹنوں تک دھوتی
ایک ہاتھ میں چھی لے لیں ، ایک ہاتھ میں بنسی
کھونٹوں سے گایوں کو کھولیں ، چنوری اور ہنکائیں

آگے چل کر آخری بند میں شاعر کا احساس دیکھیے ، اس بند سے کچھ سطریں :

سچ پوچھو تو شہری دنیا ، روپ کی سنیہ ناسی
شہر کو ہم تم دیکھ چکے ، اب گاؤں کو بھی دیکھ آئیں

سب سے پہلے بند میں کہا گیا تھا :

میں بھی شہر کا باسی پیارے ، تم بھی شہر کے باسی
ہم دونوں کی آنکھیں ، روحیں سنیہ روپ کی پیاسی

روحیں سنیہ روپ کی پیاسی ہیں۔ اسی پیاس اور تشنگی کو مٹانے یا کم کرنے کی غرض سے گاؤں کی فضا کو سازگار تصور کیا گیا ہے۔ شہر چوں کہ روپ کی سنیہ ناسی ہے اس لیے شاعر نے گاؤں کی سمت رخت سفر باندھنے کا قصد کیا ہے۔ گاؤں سے انسیت اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کی فکر ناسٹلجیائی ہے یا پھر یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کے مشاہدے نے طرز فکر میں ایک طرح کا تغیر پیدا کر دیا ہے۔

قیصر شمیم کی فنکارانہ نظر طبقاتی کشمکش پر بھی رہی ہے۔ ''پہاڑ کاٹتے ہوئے'' (۱۹۹۸ء) کے پیش لفظ (دائرے) میں لکھتے ہیں :

'' مجھے یاد ہے کہ جوٹ مل کے جس علاقے میں پیدا ہوا تھا، وہاں

www.taemeernews.com

جی.ٹی.روڈ کے ایک طرف مزدوروں کی بستی تھی جس میں مرغیوں کے ڈربوں جیسے
چھوٹے چھوٹے گھر تھے ان میں اکثریت بانس اور مٹی سے بنے ہوئے ایسے
گھروں کی تھی جو بیشتر اوقات بوسیدہ رہا کرتے تھے۔ میاں، بیوی، بیٹے، بیٹیاں
یعنی پورا خاندان ایک ہی گھر میں ٹھنسا پڑا رہتا تھا......

......دوسری طرف نہایت بلند و بالا چہار دیواری کے اندر ایک دوسری
دنیا تھی جس میں جوٹ مل کے انگریز افسروں کے رہنے کے لیے عالی شان عمارتیں
تھیں اور تفریح کے لیے ٹینس لان، کلب، بال روم اور سنیما ہال تھے......

(پہاڑ کاٹتے ہوئے : ص ۱۴)

انسانی زندگی کے یہ دو مختلف Shades تھے جن کا قیصر شمیم کے ذہن و دل پر گہرا اثر پڑا۔ اس احساس کے نقوش ان کی شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ نظم ''عید آئی ہے مگر......'' کا آخری حصہ دیکھیے جس میں کارخانہ بند ہونے کے بعد ایک مزدور کے احساس کو پیش کیا ہے :

تیری دنیا میں خدایا!
کیوں حصولِ رزق کا موقع ہمیں ملتا نہیں
کون سی منڈی میں جائیں، ہم جہاں پھر بک سکیں
جگمگائیں پھر ہمارے ہاتھ پر / دو چار ہی سکے سہی
جن سے ہم بچوں کو اپنے خوش کریں
اور سمجھیں / آج اپنی عید ہے!

اس نظم کے تیور سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں، البتہ وہ مقصدیت و ادبیت کے درمیان نیز اجتماعیت و انفرادیت کے درمیان معقول تناسب و توازن رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے پیش لفظ (دائرے) میں کیا ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے۔ مزدور اور کسان یا سماج اور سماجی مسائل کو شاعری میں پیش کرنا کوئی بری بات نہیں، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس میں شاعری اور شعریت کہاں تک ہے۔ محض پروپیگنڈہ تو نہیں۔ ترقی پسندوں نے اجتماعیت پر اتنا زور دیا کہ انفرادیت مجروح ہو کر رہ گئی۔ انسان کے کرب اور دکھ کو سمجھنے کے بجائے ترقی پسندوں نے انسان کے دکھ کو علم کے طور استعمال کیا اور انقلاب انقلاب چلا کر دکھ کی عظمت کو داغ دار کیا۔ قیصر شمیم کی نظموں میں دکھ، دکھ ہی ہے ترقی پسندوں کا علم نہیں۔

www.taemeernews.com

ایسا نہیں کہ قیصر شمیم کی فکری جہات محدود ہوں۔ اگر ان کی نظم "ہمارے اپنے لہو کا حصہ" کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک وسیع النظر فنکار ہیں۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ وسیع ہے۔ اس نظم میں اپنی زبان کے تحفظ کو موضوع بنایا گیا ہے :

جلائے رکھنا چراغ اپنا / چراغ اپنا، زبان اپنی!
زبان اپنی ہے وہ نشانی / جو ماں نے بچپن میں ہم کو دی تھی
زبان ہے دودھ اپنی ماں کا، ہمارے اپنے لہو کا حصہ!

نظم میں روانی اور دل کشی ملاحظہ کیجیے :

ہمیں ملی ہے زبان اپنی تو یوں ملی ہے
گلوں کو ملتی ہے جیسے خوشبو / گھٹا کو ملتا ہے جیسے پانی
شجر کو ملتا ہے برگ جیسے / زباں ہے چڑیوں کی چہچہاہٹ
زباں ہے پھولوں کی مسکراہٹ / یہ چہچہاہٹ یہ مسکراہٹ بچائے رکھنا

آگے چل کر تلمیحات کے بطور دیارِ حسان ابن ثابت، دیارِ رومی، دیارِ چاسر، دیارِ گوتم اور ان سے متعلق انسلاکات کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح جسم سے جان کا رشتہ ہوتا ہے اسی طرح مذکورہ بالا دیار اور ان کے تلازموں سے ہماری زبان کا رشتہ ہے۔

آخر میں اپنی زبان کی شناخت پر مہر استحکام ثبت کرنے کی کوشش کی گئی ہے :

زبان اپنی نہیں ہے کوئی لباسِ کہنہ
بدلتے فیشن کو دیکھتے ہی جسے بدن سے اتار پھینکیں
زبان اپنی نہیں ہے ماضی کا داغ کوئی
جسے چھپانے کے سو جتن ہوں
زبان سے ہے شناخت اپنی
بچائے رکھنا شناخت اپنی / چراغ اپنا جلائے رکھنا

قیصر شمیم کی نظموں کے انسلاکات و موضوعات سے ان کی فکری جہات کا اندازہ ہوتا ہے۔ نظم کے لیے زبان و اسلوب کی حد تک جس سنجیدہ دکشن کی ضرورت ہوتی ہے، قیصر شمیم کی نظموں میں موجود ہے۔ ان کا تہذیبی شعور اور فنی اسلوب ان کی نظموں کو منفرد بناتا ہے۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد
بھاگل پور

نظم نگاری کا فرہاد : قیصر شمیم

دنیائے شاعری میں اردو غزل کے بعد نظم ہی وہ صنف سخن ہے جس کا جادو ہر زمانے میں شاعروں کے ذہن و دل و دماغ پر چڑھ کر بولتا رہا۔ ہر زمانے میں شعری اصناف سخن پر طبع آزمائی کرنے والوں نے نظم نگاری پر تھوڑی سی توجہ ضرور فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نظم نگاری کے نوک پلک درست کرنے والوں اور اسے رنگینی و رعنائی بخشنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ نظیرا کبرآبادی، مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر، میر انیس، مرزا دبیر کی نظموں کو اگر اردو نظم نگاری کا آغاز تصور کر کے اس کے ارتقاء پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو پنجاب کے ایک انگریز کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد کی کوششوں کے نتیجے میں لاہور میں ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام جس قسم کی نظمیں منظر عام پر آئیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پھر مولانا حالی، اسماعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، ضامن کستوری، اقبال، چودھری خوشی محمد ناظر، غلام محمد بھیک نیرنگ، سرور جہان آبادی، ظفر علی خان، تلوک چند محروم، شبلی نعمانی، چکبست، جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی، حفیظ میرٹھی، ساغر نظامی، احسان دانش، عبدالرحمان بجنوری، عظمت اللہ خان، اختر شیرانی، تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر، مجاز لکھنوی، کیفی اعظمی، فیض احمد فیض، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، ساحر لدھیانوی، میراجی، ن۔م۔راشد، اختر الایمان، سلام مچھلی شہری، انشاء، عبدالعزیز خالد، مجید امجد، عزیز حامد مدنی، ڈاکٹر منیب الرحمان، بلراج کومل، وحید اختر، عمیق حنفی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ اس فہرست میں اہم ہیں۔

ان میں سے کسی نے اردو نظم کو چند بندھے ٹکے موضوعات کے حصار سے نکال کر موضوعی اعتبار سے اس کو وسعت بخشی اور ہر طرح کے خیالات و نظریات اور تجربات و مشاہدات کو اردو نظم کے پیرایہ میں پیش کر کے اس کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے تو کسی نے ہیئت میں نت نئے تجربے کیے۔ کسی نے دیگر زبانوں سے نظموں کا ترجمہ کر کے اس کے ذخیرے کو وسعت بخشی تو کسی نے مواد، موضوع اور فنی اعتبار سے اردو نظم نگاری کو بلندیوں اور وسعتوں کی نئی منزلوں سے آشنا کیا۔ کسی نے نظموں کے دامن میں وطن پرست نظموں کے گل و بوٹے

www.taemeernews.com

کھلائے تو کسی نے اردو نظموں کے ذریعہ جذبۂ حب الوطنی کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ جمہوریت، سماجی انصاف، محنت کش طبقوں کی آواز، سب مل کر اردو نظم نگاری کے دائرے کو بڑھاتی رہیں۔ کسی نے انگریزی جذبات و احساسات اور مغربی فکر وفن سے متاثر ہو کر اردو نظموں کو نئے احساسات، نئی لہر سے آشنا کیا تو کسی نے اردو نظموں کو ہندستانی تہذیب وتمدن کا جلوۂ صد رنگ بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

نظم نگاری اسی آغاز وارتقا، ترقی و فروغ کی متعدد دہلیز عبور کرتے ہوئے ایک ایسی دہلیز پر پہنچی ہے جہاں اس نے اپنے پیروں سے اوزان اور قوافی کے مروجہ بندھن کو اتار پھینکا۔ اسی دہلیز کو آزاد نظم کی جائے پیدائش کہہ سکتے ہیں۔ جی ہاں! آزاد نظمیں اوزان اور قوافی کے ضابطوں سے آزاد ہوتی ہیں۔ ان میں ایک آہنگ اور ترنم ضرور ہوتا ہے۔ اس کا ہر لفظ اور ہر مصرعہ بنیادی خیالات ونظریات کے اظہار میں معاون ومددگار ہوتا ہے۔ اس میں شاعر تمام پابندیوں سے بے نیاز ہو کر اپنے خیالات ونظریات کو موزوں ترین الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ آزاد نظموں کی موزونیت اور موسیقیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر کی سوچ اور فکر کے بہاؤ کو قافیے اور وزن کی پابندی سے جو رکاوٹ پیدا ہوتی تھی اس کا خاتمہ ہوا جس کے نتیجے میں شاعر کے خیالات ونظریات فطری بہاؤ کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ اور اس فطری بہاؤ سے قارئین کرام پوری طرح لطف اندوز ہوئے۔ آزاد نظموں کی مقبولیت کا اندازہ کثرت سے شعرائے کرام کی اس پر طبع آزمائی سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بیشتر شعرائے کرام کی نظمیں نہ صرف عوام و خواص میں مقبول ہوئیں بلکہ ان کی شہرت ومقبولیت سے متاثر ہو کر کثیر تعداد میں شعرائے کرام نے اس کی جانب توجہ فرمائی۔ ن۔م۔ راشد، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی کی نظموں کو بے پناہ شہرت اور مقبولیت ملی۔ اور اسی مقبولیت کے بعد شعرائے کرام کے ایک ہجوم نے اس صنف سخن پر طبع آزمائی کی۔ وزن اور قوافی کی مروجہ بندھنوں سے آزادی کا خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہوئے شعرائے کرام نے دل کھول کر اپنے خیالات ونظریات کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں اردو نظم نگاری کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اسے مزید رنگینیاں اور رعنائیاں حاصل ہوئیں۔ نت نئے تجربات ومشاہدات نے اس کے کینوس میں جگہ پائی جس کے نتیجے میں اردو نظم نگاری اردو کے تمام اصناف سخن میں ممتاز ہوئی۔ اردو میں نظم نگاری کے جادو کو فنکاروں اور قارئین کے سر چڑھ کر بولنے کا کارنامہ انجام دینے والے بے شمار نظم نگاروں میں ایک اہم اور معتبر نام ہے قیصر شمیم۔

قیصر شمیم کا مجموعۂ کلام ''پہاڑ کاٹتے ہوئے'' میرے زیر مطالعہ ہے جس کی روشنی میں مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ قیصر شمیم کی نظمیں اردو نظم نگاری کے سرمایہ میں بیش قیمت ہیں۔ نظموں کا مطالعہ ذہن پر یہ واضح کرتا ہے کہ اردو نظم نگاری کے نوک پلک سنوارنے والوں اور اس کے دامن کو مزید وسعت ورنگینی بخشنے والے

www.taemeernews.com

بے شمار نظم نگاروں میں قیصر شمیم بلند و بالا مقام پر فائز ہیں۔ قیصر شمیم نے انفرادی جذبات واحساسات، ذاتی تجربے اور مشاہدے کو نہایت ہی پرکشش، منفرد اور جاذب نظر انداز میں پیش کر کے اپنے کلام کو قدیم وجدید روایات کا حسین سنگم بنا دیا ہے۔ قیصر شمیم کی بیشتر نظموں میں ایک نغمگی ہے، ایک موسیقیت ہے۔ ان کی نظموں میں سماجی تقاضے، عصری مسائل، فن کے سانچے میں اس طرح ڈھلے ہیں کہ ان نظموں کی حیثیت عصر حاضر کی بیشتر نظموں میں نمایاں ہو گئی ہے۔ عصر حاضر کے ایک عظیم سانحہ کو قیصر شمیم نے کس پُر اثر انداز میں اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے، اس نظم کے چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں :

ایک صدیوں پرانے معبد کو
کر کے تبدیل ایک ملبے میں
آج ہیں خوش بہت وہ بازی گر
جن کا مذہب فریب کاری ہے
ساتھ جن کے ہے ایک ایسی فوج
جس کی آنکھوں میں روشنی کی جگہ
خواب ہے ایک جھوٹی جنت کا!
کون سمجھائے ایسے اندھوں کو
ایک معبد جو سنگ و خشت کا تھا
کر کے مسمار اس کو کیوں خوش ہو

(نظم : کل آج کل/ص : ۲۴-۲۵)

سماج اور معاشرے میں پھیلی اخلاقی پستی اور آپسی اختلافات وتضادات و رنجش و کدورت اور بے گانگی کے ماحول سے شاعر کا دل کس قدر مضطرب ہے اس کا اندازہ ان کی نظم "دعا مانگو" سے لگایا جا سکتا ہے

دعا مانگو
کہ خالق آتش و آب و ہوا کا
کچھ تو جدے / تو وہ لاوا
(جو میرے سینۂ سوزاں میں کب سے قید ہے
نہ بند بھٹی کی بھڑکتی آگ کی صورت)

www.taemeernews.com

میرے سینے کو شق کر دے
بہا کر صاف کر دے ہر طرف پھیلی کثافت کو
دلوں کے آئینوں پر تہہ بہ تہہ بیٹھی کدورت کو! (نظم: دعا مانگو/ص:۲۹)

جذبۂ حب الوطنی سے لبریز دل پر مجاہدین آزادی کی قربانیوں کے فراموش کیے جانے ان کے اصولوں اور اقدار کو بھلائے جانے اور محض رسمی طور پر انھیں یاد کیے جانے کی موجود روایت پر کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ قیصر شمیم کی نظم "تمہاری یاد آتی ہے" کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے جسے انھوں نے گاندھی جی کی ۱۲۵ویں سالگرہ پر لکھا:

تمہاری یاد آتی ہے / مگر اس یاد میں آنسو نہیں ہوتے
تمہیں کھونے کا پچھتاوا / بھی اب دل کو نہیں ہوتا
کہ وہ دنیا / بدل کر رہ گئی ہے،
جس کی مٹی میں کبھی تم نے
بہت سے خواب بوئے تھے
تمہارے خواب / اسی مٹی میں
یوں بے جان ہو کر رہ گئے ہیں
جیسے اپنی گود کے پالے ہوئے
معصوم بچے / دفن ہو کر رہ گئے ہوں
اپنے ہی آنگن کی قبروں میں!
تمہاری دیش بھکتی / بند ہے تاریخ کے بوسیدہ پتوں میں
تمہاری وہ اہنسا' / جس کے آگے سورما بھی سر جھکاتے تھے'
تمہارے ساتھ ہی اس کو بھی گولی لگ گئی تھی
اب اس کی لاش بھی ملتی نہیں ہے

(نظم: تمہاری یاد آتی ہے/ص:۳۵)

قیصر شمیم کی نظموں میں عصر کی ان تمام بے راہ روی پر اظہار افسوس ہے، جس کی وجہ سے انسانیت سسک رہی ہے۔ خواہ وہ لیبیا پر امریکی حملے کے نتیجے میں کرنل قذافی کی گود لی ہوئی بچی کی ہلاکت کا وحشیانہ واقعہ ہو یا حریت پسند افریقی شاعر بنجامن مولائز کو پھانسی کی سزا دینے کا واقعہ ہو۔ شاعر نے اپنے جذبات و احساسات کو

www.taemeernews.com

نہایت ہی پر اثر انداز میں پیش کر کے قارئین کو دعوتِ فکر دینے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے کہ سسکتی انسانیت کو دائمی صحت اور ابدی زندگی عطا کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟ فرقہ پرستی کی لعنتوں کو کس طرح ختم کیا جائے؟ اور صرف یہی نہیں کہ قیصر شمیم مسائل کا ذکر کر کے خاموش ہو جاتے ہیں بلکہ اس کا خوبصورت حل بھی نہایت ہی فن کاری اور ہنرمندی سے پیش کرنے میں قیصر شمیم لاجواب ہیں۔ فرقہ پرستی کی لعنتوں نے ملک کے امن واتحاد، بھائی چارگی، دوستی اور خلوص ومحبت کا شیرازہ بکھیرا ہے اس کا خوبصورت حل آپسی خلوص ومحبت اور اتفاق واتحاد میں ہے۔

اس کی تعلیم کس فن کاری سے انھوں نے اپنی نظم ''درد، آنسو، مسکان'' میں دی ہے ملاحظہ فرمائیں :

درد نہ گورا ، درد نہ کالا
درد نہ ہندو ، درد نہ مسلم
درد جہاں ہو' جس دل میں ہو
ہی اس کا نام
دل میں رہنا، دل کو ستانا، جگ میں اس کا کام
ہی اس کا نام

آنسو پورب ، آنسو پچھم
آنسو اتر ، آنسو دکھن
دیش دشا کا بھید نہ مانے
آنسو کوئی دھرم نہ جانے
آنسو چاروں دھام
دکھ سکھ کا کچھ حال سنانا جگ میں اس کا کام
آنسو چاروں دھام

ہونٹوں پر مسکان کھلے تو
روپ نہ دیکھے، رنگ نہ دیکھے
نام نہ پوچھے، ذات نہ پوچھے

www.taemeernews.com

کوئی نر ہو یا ناری ہو
عمر بڑی ہو یا چھوٹی ہو
سب کے لیے اس کی شوبھا ہے
صبح رہے یا شام
سب کے لیے ہیں جگ میں تینوں...... درد، آنسو، مسکان
کاش یہی اک بات سمجھ لیں آج کے ہم انسان! (درد، آنسو، مسکان ۳۹)

قیصر شمیم کی نظموں میں گل وبلبل کی کہانیاں اور ہجر ووصال کا ذکر نہیں بلکہ ان کی نظموں میں ان کا عہد اور ان کے عہد کی زندگی سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں کی تازگی قارئین کو فکر وخیال اور انبساط وآگہی کی ایک نئی دنیا کی سیر کراتی ہے۔ موضوعی اعتبار سے ان نظموں کا توانا و پر جوش مغموم وافسردہ لب ولہجہ ان کے خیال کے چہرے کو نہ صرف واضح اور روشن کرتا ہے بلکہ جذب وکشش کی نمو اور متاثر کرنے کی قوت کا اظہار کرتا ہے۔ الفاظ و ترکیب کے حسن کارانہ استعمال نے ان نظموں میں جذب وکشش کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ قارئین کو ان نظموں کا مطالعہ ایک نئی لذت فراہم کرتا ہے۔

قیصر شمیم نے اپنی نظموں کے موضوعات کے انتخاب میں اپنے پختہ کار ذہن، وسیع تجربے اور مشاہدے، حساس دل اور شاعرانہ صلاحیتوں کا انتہائی فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ ذیل میں ان کی نظموں سے چند ایسے نمونے پیش کرتا ہوں جس سے میرے مذکورہ خیال پر صداقت کی مہر لگ جائے :

رشک آتا ہے مجھے ان دوستوں پر
بھیڑ میں رہتے ہوئے جو بھیڑ کا حصہ کبھی بنتے نہیں ہیں
اور اپنے جذبۂ بیگانگی کو
خوبصورت نام 'تنہائی' کا دے کر
ایک طلسماتی فضا میں اس طرح اب جی رہے ہیں
جیسے یکتائی کا درجہ / ان کی تنہائی نے ان کو دے دیا ہو
کیا غضب کی ان کی یہ انا ہے
جس نے ان کی حسیت کو
خود پرستی کے نئے معنی سکھا کر

www.taemeernews.com

بھیڑ میں بھی ایک اونچی سطح پر رکھا ہے ان کو

وہ جہاں سے / ڈیٹیل ڈیغو کے ہیرو کی طرح

ایک بادشاہی کروفر سے / جائزہ لیتے ہیں سب کا

اور اک احساسِ عظمت کی چمک

'آنکھوں سے ان کی' / جھانکتی ہے

(نظم: تنہائی/ص: ۴۳)

احساسِ برتری اور خود پرستی کی مہلک بیماری سے پنپنے والے بیگانے پن کی روایت کو شاعرِ موصوف نے کس فن کاری سے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ طلسماتی فضا میں تنہائی کا خوبصورت نام دے کر جینے والوں کو شاعر نے نہایت ہی فن کارانہ لہجے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی اور زندگی کی حقیقتوں سے دور یہ زندگی ایک طلسماتی فضا میں پل رہی ہے۔ یا پھر نظم "عید مناؤ" کے ہی دو بند ملاحظہ فرمائیں :

مہنگائی کیا ہے؟

مہنگائی تو اپنے ملک میں برکت ہے

اس برکت کے پیچھے کتنی حرکت ہے

مہنگائی سے رسوائی کیا؟...... عید مناؤ'

عید مناؤ! / چولھا ٹھنڈا

ہانڈی خالی، پیٹ بھی خالی ہے تو کیا؟

تن پر لتّا یا بدحالی ہے تو کیا؟

بدحالی سے رسوائی کیا؟...... عید مناؤ / عید مناؤ!

(نظم : عید مناؤ/ص : ۵۱)

بڑھتی ہوئی مہنگائی کا اثر غریبوں کی زندگی پر کس طرح پڑ رہا ہے اس کی لفظی تصویر کشی میں قیصر شمیم نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے اس کا اندازہ نظم کا مطالعہ کرنے والے کو ہوتا ہے کہ ٹھنڈے چولھے اور خالی ہانڈی اور خالی پیٹ عید منانے کے لیے مجبور و بے بس ہیں۔ اس نظم کے ذریعہ شاعر نے صرف غریبوں کی عید کی تصویر کشی نہیں کی ہے بلکہ ان افراد کے حس کو جگانے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے جو ان بدحالیوں کو تھوڑی آسودگیوں میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

www.taemeernews.com

ملک میں تخریبی کارروائیوں سے شاعر کا دل کس قدر مضطرب اور پریشان ہے اس کا اندازہ ان کی نظم ''ایمان'' کا مطالعہ کرنے والوں کو ہوگا کہ کس ہنرمندی اور فن کاری سے قیصر شمیم نے تخریب کاروں کے دلوں میں جذبۂ حب الوطنی بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزادی کی جدوجہد اور قربانیوں کا ذکر کر کے شاعر موصوف نے نظم کو اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

اپنے وطن کو ماں کا درجہ دیتے ہیں ہم لوگ۔
پھر کیوں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر آمادہ ہیں
کیا اپنی ہی ماں کو ٹکڑے ٹکڑے اس کے اپنے بچے کرتے ہیں
ہم کیا وہ دن بھول گئے ہیں / جب پچھم سے کالی آندھی آئی تھی
جس نے ہماری ماں کا آنچل چھینا تھا
اور ہمارے کھیتوں کو کھلیانوں کو / برسوں ہی بھر لوٹا تھا
جس آنگن میں ہم تم پل کر جواں ہوئے تھے
اس آنگن پر کیسی آفت آئی تھی

(نظم: ایمان/ص: ۷۳)

صرف یہی نہیں بلکہ قیصر شمیم کی دیگر نظمیں بھی نہایت ہی خوبصورتی اور فنکاری سے جذبۂ حب الوطنی کو بیدار کرتی ہیں بلکہ قارئین کے ذہن و دل پر حصولیابی آزادی کے لیے کی گئی جہد و جہد اور قربانیوں کو بھی واضح کرتی ہیں۔ غریبوں کی عید کی بدحالی ہی نہیں بلکہ مہنگائی کی قہرناکیوں کو بھی واضح کرتی ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام ''پہاڑ کاٹتے ہوئے'' کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کا ذہن شاعر کی وسیع النظری، ذہنی بلند پروازی اور حساس ذہن کے تاثرات سے پوری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ الفاظ کے استعمال پر مکمل گرفت اور اسے برتنے کے فنکارانہ اظہار نے ان کی نظموں میں جذب و کشش کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جس پر زوال ممکن نہیں الفاظ کے استعمال کی ہنرمندی کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں :

جہت جہت ' طبق طبق	افق افق ' شفق شفق
صدا صدا ' ورق ورق	نمو نمو ' رمق رمق
قلم قلم ' سبق سبق	بس اک نشاں بس اک نسق
بس اک نام نام حق	بس اک نام نام حق

www.taemeernews.com

اور صرف یہی نہیں کہ قیصر شمیم کے مجموعۂ کلام "پہاڑ کاٹتے ہوئے" میں صرف ثنائے حق ہے۔ ثنائے حق کے ساتھ ہی سجدہ بھی ہے، غار حرا ہے اور ذکر غار حرا میں مدینے کی گلیاں ہیں، وہاں کی ہوائیں ہیں۔ پہاڑ بھی ہے، تیشہ بھی ہے، بیکراں سمندر ہے، نئے کوہ قاف کی کھوج ہے، کل آج کل کے تغیرات بھی ہیں، سرد شب ہے، نغمۂ حرارت ہے، طیور کے نشیمن ہیں، فسردۂ خواہش فغاں ہے، درد نہاں ہے، گریہ وغم ہے، آہ وفغاں ہے، ریزہ ریزہ خواب ہیں، دلوں کے آئینے میں بیٹھی تہہ بہ تہہ کدورت کو بہا کر صاف کرنے کی دعائیں مانگنے کی تلقین ہے، کالی بلاؤں کے پرستاروں سے دشمنی بھی ہے، شفق کے گیت ہیں، دوستوں کی وفات پر اظہار تعزیت ہے، گاندھی جی کی عقیدت ہے، مہنگائی کی برکت ہے، ٹھنڈے چولہے اور خالی پیٹ ہیں۔ بدحالی ہے، رسوائی ہے، نقلی اور اصلی چہرے ہیں، دل کی دھڑکنیں ہیں، مغموم دل ہے، بکھری زمین ہے، بند ہوتی ہوئی آنکھیں ہیں، نئی صف ہے، جستجو کی لو ہے، دردِ زندگی ہے، اشک وآہ ہے، دھوپ ہے، صعوبتیں ہیں، نیا سال ہے، جلتے مکان ہیں، کٹتے سر ہیں، پھٹتے سینے ہیں، لٹتے بدن ہیں، رام کے داس ہیں، رحیم کے بندے ہیں، پرانا رستہ ہے، نئی تاریخ ہے، دل کی چبھن ہے، ماتھے کی جلن ہے، ہاتھوں کی تھکن ہے، ان کہی کہانی ہے گویا وہ سب کچھ ہے جو کائنات میں ہے۔ قیصر شمیم نے انتہائی فنکاری سے اپنے تجربات ومشاہدات اور محسوسات ونظریات کو نظموں کا پیکر بخشا ہے۔ ایک عظیم شاعر کا دل بھی وسیع وعریض ہوتا ہے۔ قیصر شمیم کی نظم "سب کو خوشی دے دے" کا مطالعہ قارئین کے ذہن پر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ان کا دل بھی انتہائی وسیع وعریض ہے اور وہ سبھوں کی خوشی چاہتے ہیں :

خدایا! / دے خوشی سب کو خوشی دے دے
یہ دنیا تیری دنیا ہے / تری دنیا کی ہر مخلوق تیری ہے
یہ بندے تیرے بندے ہیں
(ترے ایک نام پر سو بار سجدہ ریز ہوتے ہیں مگر قسمت کو روتے ہیں)
دھوئیں کی گود میں جو زہر پی کر پل رہے ہیں وہ بھی تیرے ہیں
نشے میں دولتوں کے اینڈتے جو چل رہے ہیں وہ بھی تیرے ہیں
تجھے 'کمزور لوگوں کا خدا' جو مانتے ہیں وہ بھی تیرے ہیں
تری دنیا کو جو اپنی ستم کی زد میں رکھتے ہیں
جو آدم زاد آدم زادہی کا خون چکھتے ہیں
تباہی کے دہانے پر جو لے آئے ہیں دنیا کو

www.taemeernews.com

تلے ہیں روکنے پر جو ابھی سے صبحِ فردا کو
وہ بندے کس کے بندے ہیں؟
وہ بندے بھی تو تیرے ہیں!

اپنے ان بندوں کو جو آقا نما بندے بنے بیٹھے ہیں دنیا میں
جو اپنی طاقت بے جا سے خود اندھے بنے بیٹھے ہیں دنیا میں
اب ان کی چشمِ نابینا کو تھوڑی روشنی دے دے!

دے خوشی سب کو خوشی دے دے (نظم: سب کو خوشی دے)

"سر راہ" عنوان سے قیصر شمیم نے اپنی نظم میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اسے تیز رفتار زمانے میں انسانی الجھنوں اور پریشانیوں کی تصویر کشی سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایک ایک مصرع دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتا ہے۔

"سنگ ناتراشیدہ" بھی ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر نے اچھوتے انداز میں فن کی دیوی کو مسکرانے کے لیے مجبور کیا ہے۔ محرومی سے شروع ہونے والی اس نظم کو شاعر نے نہایت ہی خوش آئند توقعات پر ختم کیا ہے۔ جس سے ان کے سوچنے کے مثبت انداز فکر کا اظہار ہوتا ہے۔

"یہ وہ سرزمیں ہے" عنوان سے قیصر شمیم نے جو نظم لکھی ہے اسے اپنی مثال آپ کہا جائے تو کوئی مذائقہ نہیں۔ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار دل کی نگاہ میں وطن کی ایک ایک شے کتنی پیاری ہوتی ہے اس کا اندازہ اس نظم کے حوالے سے ہوتا ہے۔

"آرتی" نظم میں شاعر نے جس خلوص اور شردھا سے امید کی دیوی کی آرتی اتاری ہے وہ قابل مطالعہ ہے اور پھر نظم "ایمان" میں وطنِ عزیز کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کرنے والے گمراہوں کو کس فنکاری سے سمجھایا ہے اس کا اندازہ قارئین کو بخوبی ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

جس آنگن میں ہم تم پل کر جواں ہوئے تھے
اس آنگن پر کیسی آفت آئی تھی
کھونٹے سے جو بندھی تھیں گائیں

www.taemeernews.com

ان کے گورے گورے تھنوں سے

لپٹے ہوئے تھے کتنے بھیانک کالے ناگ!

چاہے جیسی ہو سنتان

اس آنچل کے ٹکڑے کرنا

ماں کا ہے اپمان

(نظم: اپمان)

اور بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ قیصر شمیم نے عید ۱۹۸۷ء کے عنوان سے لکھی نظم میں جو سوال ابھارے ہیں وہ قارئین کے ذہن پر کچوکے لگاتے ہیں اور سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کرتا:

کیوں کبھی میرٹھ، کبھی دلی، کبھی گجرات کا، کوئی علاقہ

بھائی چارہ، دوستی، ہمسائگی، انسانیت ____

سب کچھ بھلا کر

دیکھتے ہی دیکھتے تبدیل ہو جاتا ہے قبروں کے نگر میں

اور انھی قبروں پر جا کر عید کے دن

کتنے ہی معصوم چہرے، خامشی سے پوچھتے ہیں

واقعی کیا اپنے بندوں سے خدا روٹھا ہوا ہے؟

کیا زمانے کی سیاست کھیل اپنا کھیلتی ہے؟

زندگی چپ چاپ کیا کیا جھیلتی ہے! (نظم: عید ۱۹۸۷ء)

قیصر شمیم کے مجموعہ کلام "پہاڑ کاٹتے ہوئے" میں خیالات ونظریات، تجربات ومشاہدات اگر منفرد انداز میں ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو طرز بیان کی دلکشی نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ لفظوں کے برتنے اور فنکارانہ نشست و برخواست نے اس میں مزید کشش پیدا کر دی ہے۔ بیشتر نظمیں شیرنی اور نغمگی سے اس قدر لبریز ہیں کہ مٹھاس کی لذت کا احساس قارئین کو ہوتا ہے۔ کیف وسرور، یاس وقنوطیت اور ناامیدی پر امید کی مرہم سازی، اضطراب وکشمکش میں امن وسکون کی پردہ داری، پختہ کاری، معصومیت، سادگی، سنجیدگی ان سب نے مل کر "پہاڑ کاٹتے ہوئے" کی نظموں کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان نظموں کو بے پناہ شہرت و مقبولیت ملی۔ اور انھیں مقبولیت اور قبولیتِ عام کے طفیل گذشتہ دہائیوں میں نظم نگاری کے افق پر نمودار ہونے والے

www.taemeernews.com

شعرائے کرام میں قیصر شمیم کی شخصیت ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اگر چہ ان کے دیگر شعری مجموعے "ساعتوں کا سمندر" اور "تیری دھارا" کو بھی مقبولیت وشہرت ملی لیکن مجموعۂ کلام "پہاڑ کاٹتے ہوئے" کی نظموں نے قیصر شمیم کی فنکارانہ صلاحیتوں اور شاعرانہ خوبیوں اور خصوصیتوں کو آشکار کرنے کا کارنامۂ عظیم انجام دیا ہے۔ بلاشبہ "پہاڑ کاٹتے ہوئے" کا مطالعہ قارئین کو لطف وانبساط، تفریح طبع، سکون طبیعت، ذہنی آسودگی واطمینان، ذوق کی تسکین کے ساتھ ہی دعوت فکر وعمل بھی دیتا ہے۔ اچھوتے تراکیب، منفرد لہجہ، معنوی گہرائی، سلیس زبان، نفیس اسلوب، بندی الفاظ کا نہایت ہی موزوں استعمال، ندرت بیان، نغمگی وموسیقیت، ترنم وشگفتگی نے مل جل کر قیصر شمیم کی نظموں کو آفاقی حیثیت عطا کر دی ہے۔ مجموعۂ کلام میں ایسے بہت سارے مصرعے اور بند ہیں جن کا جواب تلاش کرنا سرمایۂ اردو نظم نگاری میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مجموعۂ کلام میں ایسی چند نظمیں ہیں جو عقیدت کے جذبات واحساسات سے معمور ہیں۔ اس کے باوجود فنی اعتبار سے جامع اور مکمل ہیں۔ ان نظموں میں خلوص و عقیدت کا اظہار بھی انتہائی فطری انداز میں ہوا ہے۔

القصہ مختصر قیصر شمیم کا مجموعۂ کلام "پہاڑ کاٹتے ہوئے" مختلف رنگوں، آہنگوں سے آراستہ خوبصورت دلکش، پراثر، بامعنی، پرکشش اور جاذب نظر نظموں کا نہایت ہی حسین گلدستہ ہے۔ جس نے بزم اردو نظم نگاری کو رونق بخشی ہے۔ جس کی رنگینی اور دلکشی سے قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرے خیال میں جیسے جیسے ان نظموں کی معنوی گہرائی میں اترتے جائیں گے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہے گا اور نقادان ادب نظم نگار شعرائے کرام کی بھیڑ میں قیصر شمیم کی اہمیت وعظمت اور شاعرانہ وقار کا اعتراف کریں گے اور تسلیم کرلیں گے اس حقیقت کو بھی کہ "پہاڑ کاٹتے ہوئے" کی نظمیں صرف نظمیں نہیں بلکہ قیصر شمیم کی کوہ کنی کی جدوجہد، قوت طاقت، حوصلے، شجاعت، فنکاری، محنت، لگن، کوشش، کاوش، علمیت، صلاحیت، عقل وشعور اور سوچ وفکر کی نشانیاں ہیں۔ سیاہ پہاڑ کے بکھرے ہوئے ہر ٹکڑے میں کوہکن قیصر شمیم کا خون جگر ہے اور یہ قیصر شمیم کے فنکارانہ ذہن کا کمال ہے کہ انھوں نے پہاڑوں کے ان ٹکڑوں کو نظم کا عنوان دے کر قوت گویائی عطا کر کے قارئین کے حوالے کیا ہے۔

میرے خیال میں قیصر شمیم کو فرہاد کے فرائض کی ادائیگی میں نمایاں کامیابی ملی ہے۔ "پہاڑ کاٹتے ہوئے" کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ قیصر شمیم نے اس نہر کو سر کرلیا ہے جس کی انھیں تلاش تھی۔ بلاشبہ "پہاڑ کاٹتے ہوئے" کی نظمیں وہ نہر آب ہیں جس سے شعروادب سے ذوق رکھنے والوں کی تشنگی کا خاتمہ ہی نہیں ہوگا بلکہ عرصۂ دراز تک وہ اس کی سیرابی کیفیت کو محسوس کریں گے۔

www.taemeernews.com

اسلم حنیف
مئو

قیصر شمیم کی شاعری میں
کرۂ ارضی کی محوری اور دائروی گردشوں کا احساس

قیصر شمیم کے چوتھے شعری مجموعے "پہاڑ کاٹتے ہوئے" کی پہلی تخلیق "۳۲واں پہاڑ کٹنے کے بعد" کا مطالعہ کرتے ہوئے جب ہم اس اختتامیہ حصے تک پہنچتے ہیں :

بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے قبل تک — وہ آرزو مگر نہ ہراساں ہوئی کبھی
لیکن وہ آرزو ، وہ طرح دار آرزو — بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے بعد ہی
گھبرا کے پوچھتی ہے کیا آگے جاؤ گے — کیا دوسرے پہاڑ پہ تیشہ چلاؤ گے ؟
کب تک یہ پہاڑ سے پنجے لڑاؤ گے؟ — فرہاد کا یہ فرض کہاں تک نبھاؤ گے ؟
جس نہر کی تلاش ہے وہ نہر پاؤ گے ؟ — ان ناگہاں سوالوں پہ پل بھر رکا ہوں میں
پھر مسکرا کے تیشہ لیے چل پڑا ہوں میں

تو یہ احساس یقین سے بدل جاتا ہے کہ شاعر نے پہاڑ کا استعارہ زندگی کی اس اکائی کے لیے وضع کیا ہے جسے "سال" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ سال کی اکائی مہینوں، دنوں، گھنٹوں اور ساعتوں میں منقسم ہے۔ انھی چھوٹی بڑی اکائیوں سے کائنات کی ایک ایک شے اور انفرادی اور اجتماعی انسانی زندگی کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ مشینی عہد سے آج کے الیکٹرانک دور تک کے تاریخی سفر نے انسانی زندگی میں وقت کے احساس کو بہت شدید اور گہرا کر دیا ہے جس کی وجہ سے روز بڑھتے ہوئے مسائل حیات کے جبر اور حالات و ماحول میں پیہم اذیت ناک تغیر پذیری کے عمل میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ مختلف و متضاد مسائل و مصائب میں جکڑی ہوئی وقت کی چھوٹی اکائیوں سے عبارت بڑی اکائی یعنی سال کو عبور کرنا آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس المیے کا احساس قیصر شمیم کے یہاں ابتدا سے ہی پایا جاتا ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے کا نام ہے" ساعتوں کا سمندر" اور یہ عنوان مجموعے کے اسی شعر سے ماخوذ ہے :

www.taemeernews.com

ہمارے جسموں کو موجیں نگل گئیں قیصر　　　　کہ ساعتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاعر زندگی کے ساتھ وقت کے برتاؤ، اس کے پیدا کردہ مسائل اور اس کے متنوع مظاہر سے کسی بھی لمحہ غافل نہیں ہے اور اس کے شعری مجموعوں کے عنوانات میں معنوی ہم آہنگی وقت کے عطا کردہ زخموں کی کسک ہی کا نتیجہ ہے۔

زندگی کے ساتھ ساعتوں کے سلوک اور اس کی چاپوں سے ذہن و دل پر ہونے والی جراحتوں کا شدید احساس نئے سال کی آمد کی ان دیکھی مسرتوں کو بھی چاٹ جاتا ہے یا انھیں مشکوک بنا دیتا ہے۔ ایک نفسیاتی حقیقت یہ بھی ہے کہ سابقہ دکھوں اور تکلیفوں کی کسک کسی بھی لمحہ بشارت سے دو چار ہونے پر روح تک اترنے لگتی ہے اور جو کھرنڈ ان پر جم جاتے ہیں وہ خود بخود اتر کر ایک نئے اضطراب کا سبب بن جاتے ہیں۔ قیصر شمیم کے دو موشحات میں اس طرح کی اضطرابی کیفیت بہت واضح انداز میں ابھرتی ہے :

اے وقت کی رقاصہ　　　　پھر سال گرہ تیری
کس شان سے آئی ہے　　　　اس سال گرہ پر ہم
کرتے ہیں دعا دل سے　　　　اس سال ترا جوبن
کچھ اور نکھر جائے　　　　اس سال ترا گیسو
کچھ اور سنور جائے　　　　پھر تیری اداؤں سے
اس سال کے آخر تک　　　　جو کچھ بھی گزرنا ہے
وہ ہم پہ گزر جائے !

(نیا سال)

ایک نئے کیلنڈر کے لگ جانے سے
کیا میرے گھر کا ماحول / بدلے گا؟
کیا دکھوں بھری اس دنیا میں / سچ مچ سکھ کا کوئی سورج چمکے گا؟
کیا دل کی چبھن / ماتھے کی جلن
ہاتھوں کی تھکن / کچھ آرام بھی پائے گی
کیا ایسی گھڑی بھی آئے گی؟ / جب نفرت کا چنڈال کہیں
ننگا ناچ نہ ناچے گا؟ / ہر سال تو یونہی ہوتا ہے

www.taemeernews.com

ہر سال کی پہلی صبح نئے کلینڈر سے
کمرے کی دیوار سجا تو جاتی ہے
ہم سرخ و سیہ تاریخوں سے
ان کی کہانی سنتے ہیں / پھر کچھ سپنے بنتے ہیں
لیکن پھر ہوتا ہے وہی / جو کچھ ہوتا آیا ہے
اور نئے کلینڈر کی تاریخیں بھی
پرانی تاریخوں کے رستے پر چل پڑتی ہیں
کیا اس سال / نئی تاریخیں اس رستے کو چھوڑیں گی؟
اپنا رخ کچھ موڑیں گی؟ (پرانا رستہ، نئی تاریخ)

پہلے مصرا موشح میں نئے سال کی آمد پر رقاصۂ وقت کے لیے خلق کیے گئے دعائیہ مصرعوں میں تحلیل نشتریت بغیر کسی وضاحت کے آخری چار مصرعوں میں سمٹ آئی ہے اور یہی عدم وضاحت کا تخلیقی پہلو ہم عصر زندگی کے بے شمار روحانی زخموں کا نقیب بھی ہے جس کے سلسلے ماحول اور تاریخ کی جڑوں میں اتر کر ہی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

آزادی کے بعد ملک کے سیاسی، اخلاقی، تہذیبی اور سماجی منظر نامے کی اذیت ناک تبدیلیوں نے بے شمار مسائل پیدا کر دیے ہیں جن سے آزادی کے صحیح مفہوم اور ملک کے مرتبہ قانون مساوات پر مختلف قسم کے سوالات قائم ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ بنیادی سوالات قیصر شمیم کے آزاد موشح" پرانا رستہ، نئی تاریخ" میں بازگشت کرتے نظر آتے ہیں۔

کلینڈر جو دن، تاریخ اور مہینوں کی ترتیب سے ایک سال کو مکمل کرتا ہے اس کو گھر یا کمرے کی دیوار پر آویزاں کرتے وقت ایک لاشعوری مسرت کا احساس، بہت سی خوش فہمیوں، بہت سی نئی آرزوؤں اور خوش نما خوابوں کے ساتھ ذہن میں کوندے لیتا ہے لیکن انسان کی اس عمومی فطرت کے برخلاف ہر فن کار اور ہر صاحب احساس شخص کی سوچ کا مسئلہ مختلف ہوتا ہے۔ قیصر شمیم کے یہاں نئے سال کا کلینڈر زندگی، ماحول اور تاریخ کے گذشتہ واقعات و حالات کے کتابے کا محرک بن کر مستقبل کی روشنی کی خوش فہمیوں اور بنے گئے خوابوں کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ آزادی سے قبل سرمایہ داروں کے عائد کردہ قوانین سے محنت کش عوام کے استیصال اور بورژوا طبقے کی جانب سے محکوم طبقوں پر جبر مظالم کی داستان اور طبقاتی کشمکش کے خلاف ملک گیر سطح پر ابھرنے والے تصورات آزادی کے بعد صحت مند تعبیروں سے ہم کنار نہ ہو سکے۔ نصف صدی سے زائد کا ہر سال جہاں تہذیبی، ثقافتی،

www.taemeernews.com

اخلاقی اور سیاسی عظیم قدروں کے گراف میں پیہم زوال کی نشان دہی کرتا رہا وہیں قوم و مذہب کے نام پر تعصبات، فرقہ وارانہ فسادات اور باہمی نفرتوں کے سلسلے بھی طول پکڑتے رہے اور پوری نوع انسانی کے ذہن و ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے بہیمانہ اور وحشیانہ سلوک کا مظاہرہ گجرات فسادات کے روپ میں سامنے آیا۔ قیصر شمیم نے بھی آزادی کے خوبصورت خوابوں کو بنا تھا جس کا اظہار ان کے موشح '' یہی وہ دن ہے '' میں موجود ہے لیکن سپنوں کے ٹوٹنے بکھرنے کا گہرا احساس '' میرا ساتھ کہاں تک دو گے؟ '' میں اس طرح ابھرتا ہے :

میرے سپنو!

ننھی منی کلیوں جیسے کومل سپنو!
میرا ساتھ کہاں تک دو گے؟

میں تو ہوں اس پتھ کا راہی
جس پر کتنے چلتے چلتے

اپنا سب کچھ کھو بیٹھے ہیں
اور نہ جانے کتنے ہیں جو

گرتے پڑتے بڑھ تو رہے ہیں
لیکن ان میں جان نہیں ہے

ایسے جان کے دشمن پتھ پر
جیون گھاتک جیون پتھ پر

ننھی منی کلیوں جیسے کومل سپنو
دبلے پتلے بچوں جیسے دربل سپنو

میرا ساتھ کہاں تک دو گے؟

سپنے کومل ہی ہوتے ہیں مگر انہیں بچوں جیسے دربل کہنا گہری یاسیت کا نتیجہ ہے۔ اپنے وطن اور اپنے ملک کے ہولناک ماحول کا اشاریہ جیون پتھ کو جان کا دشمن اور جیون گھاتک جیسے الفاظ کے استعمال میں موجود ہے اور یوں موشح کی معنوی فضا پر یاس و حرماں اور خوف و ہراس کا غلبہ جہاں ایک طرف افلاس و غربت سے کسمساتی ہوئی روحوں اور فاقہ کش جسموں کی باطنی آواز میں گم احتجاج کو نمایاں کرتا ہے، وہیں اقلیت کے ساتھ جابرانہ بڑھتے ہوئے دباؤ اور زندگی پر منڈلاتے ہوئے مہیب دہشتوں کے سایوں کا نقیب بھی ہے۔ دہشتوں کے مہیب سائے کا عکس ان کے موشح '' یکسانیت، ایک سوال '' میں بڑی واضح نقش گری کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ کیجیے :

جو افسانہ سنایا گیا ہے / نیا نہیں ہے
اس کا منظر / جلتے مکاں / کٹتے سر
پھٹتے سینے / لٹتے بدن ـــــــ / آتش و خوں کے یہ سب منظر
۔ بار بار کے دیکھے ہوئے ہیں!

ہر سال ملک کے مختلف گوشوں میں ہونے والے فسادات کیلنڈر کی کتنی ہی سیاہ و سرخ تاریخوں کو

www.taemeernews.com

یومِ سیاہ اور یومِ قتل وقتال میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ سیکولر ذہن ان کے خلاف عملی طور پر آگے آتے ہیں اور پوری قوت کے ساتھ صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں لیکن زیادہ تر نتائج مایوس کن مرحلے میں داخل کر دیتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے گزرنے والے دانشوروں کو جب لگا تار ناکامیوں کا شکار ہونا پڑے تو آخری آواز بھی کب تک ساتھ دے گی؟ میرے خیال سے متذکرہ موشح کے ابتدائی مصرعے اسی تھکن کے انداز کو نمایاں کرتے ہیں۔

عالمی سطح پر مرتب کیے جانے والے کلینڈر یا تو نظامِ شمسی کے تحت مرتب کیے جاتے ہیں یا پھر نظامِ قمری کے تحت، لیکن ہر قوم، ہر مذہب، ہر ملک یا کسی فرد، خاندان اور جماعت کے نقطۂ نظر سے سال کے آغاز و تکمیل کا نظام کلینڈر کے نظام سے مختلف ہوتا ہے۔ ہندستان کا سالِ آزادی ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ آزادی کے حوالے سے ملک کے لوگوں نے ڈھیر سارے خواب بنے تھے۔ ان خوابوں میں غلامانہ زندگی اور شاہانہ نظام سے نجات اور حق خود ارادی کے استعمال نیز مساویانہ حقوق کے خواب بھی تھے۔ ہر سال کی گردش میں یہ دن اسی حقیقت کی یاد دلاتا ہے۔ قیصر شمیم کے متذکرہ آزاد موشح " یہی وہ دن ہے" میں کئی خوبصورت خوابوں کا بڑے دل کش پیرائے میں ذکر موجود ہے۔ ایک محبِ وطن شاعر کے یہاں زندگی کی انفرادی اور اجتماعی مایوسی کے باوجود یومِ آزادی کے تعلق سے پاکیزہ خوابوں کی لفظی تجسیم کے ساتھ کسی شکایت یا کرب کا عدم اظہار اس کے بلند تصورِ آزادی کا احساس بیدار کرتا ہے۔ لیکن جب اقلیت کے سالانہ مذہبی تہوار" عید" کو بھی ۱۹۸۷ء میں خون کی ہولی سے رنگ دیا جاتا ہے تو شاعر بری طرح تلملا کر پکار اٹھتا ہے:

عید / پچھلے چند برسوں میں
ہمارے ملک میں / آئی ہے جب بھی
خون سے لتھڑا ہوا اس کا بدن ہم کو ملا ہے
عید کی آمد سے پہلے / یہ صدائیں کیوں فضا میں گونجتی ہیں
کیوں کبھی میرٹھ، کبھی دلی، کبھی گجرات کا کوئی علاقہ
بھائی چارہ، دوستی، ہمسائگی، انسانیت ـــــ
سب کچھ بھلا کر / دیکھتے ہی دیکھتے تبدیل ہو جاتا ہے قبروں کے نگر میں

یا اس کے برعکس جب وہ افلاس زدہ لوگوں کی روح میں اتر کر اس متبرک تیوہار کی مسرتوں کو پستا ہوا دیکھتا ہے تو اس طرح کی شاعری بھی اس کے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بن جاتی ہے:

بے کاری ہے؟ / بے کاری تو سب سے بڑی ہے فصل یہاں

www.taemeernews.com

کام نہیں آتی ہے کوئی عقل یہاں / بے کاری سے رسوائی کیا

عید مناؤ (عید مناؤ)

جب کہ یہی متبرک تیوہار اس کی نگاہ میں اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے تو فنی سطح پر نادر تشبیہات اور علوئے تخیل سے سحر آفریں جمالیاتی کیفیات کا مظہر بن جاتا ہے۔

عید ___ / جیسے لو لگے تپتے بدن پر
آم کے گودے کا ٹھنڈا، ٹھنڈا لیپ!
عید ___ / جیسے آنسوؤں سے سر بہ سر
بھیگے ہوئے اک لمحۂ محبوب پر
جگمگا اٹھے اسی کی مسکراہٹ کی لکیر!
عید ___ / جیسے دور تک پھیلے ہوئے کالے سمندر میں معا
روشنی کے ایک جزیرے کا ظہور! (عید)

قیصر شمیم کی شاعری میں حقیقت کے کئی پہلوؤں کی تلاش کا مسلسل عمل ان کی فنی بصیرت اور مشاہداتی حسوں کی ہمہ وقتی بیداری سے نمو پذیر ہوتا ہے۔ ان کے یہاں ساعتوں، دنوں، مہینوں اور بالخصوص سال کو شعری تخلیق میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ احساس ہر لحظہ اقدار کی شکست و ریخت، اخلاقی، سیاسی اور سماجی سطح پر بکھراؤ اور ماحول کی افراتفری کے مشترکہ عوامل کا عطا کردہ ہے۔ اگر چہ عصری آگہی نے ان کے ارفع اور آفاقی تصورات و احساسات کو چکنا چور کر کے رکھ دیا ہے مگر وہ مستقبل سے مایوس نظر نہیں آتے اور نہ ہی ان کے حوصلوں میں شکست کا احساس پایا جاتا ہے اور یہی چیزیں اگر انھیں ترقی پسند شعرا میں شامل کر دیتی ہیں لیکن حقیقتاً وہ اس عہد کے پروردہ ہونے کے باوجود ترقی پسند تحریک کے بجائے لاتحریک کے اہم فن کاروں میں شامل ہیں۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب "پہاڑ کاٹتے ہوئے" میں دائرے کے تحت انھیں کی تحریر کے یہ الفاظ میری نگاہ کو مسرت سے دوچار کرنے لگے :

"ترقی پسند ادب کے مطالعے نے ادب، زندگی اور سماج کے رشتوں اور ان رشتوں کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ذہن میں وقتاً فوقتاً ابھرنے والے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کے لیے ایک نئی راہ دکھائی تھی لیکن اس زمانے میں بھی کسی نظریے کے دیوتا کو خوش کرنے کے لیے ادب کے حسن اور اظہار کی آزادی کو بھینٹ چڑھانا پسند نہیں کرتا تھا...... اپنے اسی ذہنی رویے کے ساتھ میں نے

www.taemeernews.com

ہمیشہ ادب کے نئے نئے رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور ان میں ادب و زندگی کے لیے مجھے جو کچھ قابلِ قبول نظر آیا ہے، اس کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔'' (ص ۱۵)

نظریوں کے دیوتا کو خوش کرنے والے فن کار تحریکوں کے زوال کے ساتھ ہی مر کھپ بھی گئے لیکن جو فن کار اپنی ذہنی آزادی کے ساتھ متنوع اور بلند ادب تخلیق کرتے رہے وہ تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود زندہ ہیں لیکن تحریکوں نے نظریات کے محدود دائروں کے تحت ادب کے تخلیقی تصورات کو جو نقصان پہنچایا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تحریکوں کے ادوار میں ادب کا بڑا علاقہ لاتحریک ہی کے فن کاروں کے قبضے میں تھا اور اگر وہ کے فن کار کسی بھی نظریے سے استفادہ کو معیوب نہیں سمجھتے تھے اس لیے ان کے یہاں تخلیقی سطح پر عصری حسیت کے ساتھ زندگی کے بیشتر مسائل اور عقائد و مذہب کو بھی خاصی اہمیت حاصل رہی جس کی بنا پر یک رُخا ادب تخلیق کرنا ان کے مزاج و مسلک کے خلاف ٹھہرا۔ اردو ادب کا یہ اہم دھارا ترقی پسند دور کے بعد جدیدیت کے دور میں بھی اسی موقف کے ساتھ شعر و ادب کی آبیاری کرتا رہا اور پھر وہ وقت آ ہی گیا کہ جب روشن خیالی کے پراجیکٹ کو ۸۰ء کی نسل نے مسترد کر کے اپنے اسلاف کی روایت کو پورے ادبی منظرنامے پر پھیلا دیا۔ آج جس مابعد جدیدیت کو نئی نسل پر جبراً عائد کیا جا رہا ہے، یہ دراصل نئی نسل پر اپنی امامت کو تھوپنے کی ایک ناکام کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔

قیصر شمیم کی شاعری جس متنوع تخلیقی ادب کا نمونہ پیش کرتی ہے، اس میں ترقی پسند ادب کی جھلکیاں نظریے کا توسیعی عمل نہیں ہیں بلکہ ان میں عہد کی ترجمانی کے ساتھ ان کے انفرادی اسلوب اور ادبی مسلک کا بھی دخل ہے جسے ہم مارکسی تنقید یا تصوری کے حوالے کی بجائے اگر امتزاجی تنقید کے حوالے سے دیکھیں تو جمالیات، حقیقت پسندی، نفسیات، تاریخیت، رومانیت اور مذہبیت و روحانیت کے بہت سے مسائل زیرِ بحث آ سکتے ہیں اور یہ تنقید صرف اسی لیے کارگر ثابت ہو سکتی ہے کہ انھوں نے امتزاج پسند شاعری تخلیق کی ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میں نے جگہ جگہ موشح کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔ جن لوگوں نے میری تحقیقی مضامین پڑھے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ لفظ میں آزاد، معریٰ اور نثری شاعری کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ پابند نظم اس سے مستثنیٰ ہے۔ قطع نظر اس کے مجموعے ''پہاڑ کاٹتے ہوئے'' آزاد اور معریٰ موشحات، گیتوں اور نظموں کا ایک ایسا خوبصورت مجموعہ ہے جسے شاعری میں اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بعض آزاد موشحات میں بحور آہنگ کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے اور بالخصوص بحرِ متقارب کے وزن پر مشتمل بہت سے مصرعے عروضی اعتبار سے محلِ نظر ہیں۔ حالاں کہ بیشتر شعرا کے یہاں قیصر شمیم ہی کی طرح متقارب میں غلط آہنگ کا استعمال عام نظر آتا ہے۔ کاش دیگر ہم عصر شعرا کی طرح وہ اس تسامح کا شکار نہ ہوئے ہوتے۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر سیفی سرونجی
سرونج

قیصر شمیم : پہاڑ کاٹتے ہوئے

قیصر شمیم کلکتہ کے ان استاد شاعروں میں سے ایک ہیں جن کا نام ادبی دنیا میں احترام سے لیا جاتا ہے۔ ''پہاڑ کاٹتے ہوئے'' ان کا وہ شعری مجموعہ ہے جو نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔ ۱۶۰ رصفحات کے اس شعری مجموعے میں بے حد خوبصورت و معیاری نظمیں اور گیت شامل ہیں جن میں شاعری کی پرواز فکر اپنے اوج پر دکھائی دیتی ہے۔ کئی نظمیں تو ایسی ہیں جو منفرد ہیں اور اب تک ان موضوعات پر کسی دوسرے نظم نگار نے سوچا تک نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں قیصر شمیم نے کسی کا دیباچہ یا پیش لفظ بھی شامل نہیں کیا ہے بلکہ پورے اعتماد کے ساتھ ادبی دنیا میں پیش کیا اور '' دائرے'' کے عنوان سے خود ہی اپنی شاعری سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ '' میری نظموں کے پورے پس منظر کی بجائے میرے ذہن اور زندگی کی صرف چند جھلکیاں ہیں جن کی مدد سے مجھے اور میرے فن کو سمجھا جا سکتا ہے۔'' قیصر شمیم کے فن کو سمجھنے کے لیے ان کی زندگی اور ان کے تجربات کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر نے اپنی زندگی میں جو تلخ تجربات کیے ہیں وہ اپنے فنی لوازمات کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کر دیے ہیں۔ ان تجربات میں سب سے اہم تجربات ہیں ہندوستان کے فسادات جن کے بارے میں انھوں نے دائرے میں تحریر کیا ہے۔ اپنی کم عمری میں ہی انھوں نے ایسے خونی مناظر دیکھے ہیں کہ ایک سچے حساس شاعر کی آنکھوں میں اس طرح رچ بس گئے جس کے اظہار پر وہ مجبور ہو گئے اور انھیں خیالات نے نظموں، گیتوں کا روپ اختیار کر لیا۔ نظم '' کلکتہ'' دیکھیے :

ظلم ہوتا ہے کہیں تو / سر کو گھٹنوں میں دبائے
سانس روکے / اپنے ہونٹوں پر کوئی تالا لگائے
بیٹھے رہنے کی تجھے عادت نہیں ہے
سر اٹھا کر تو ہمیشہ چیختا ہے
اور تری چیخ ـــــ پھر چاروں طرف کتنے دلوں میں

www.taemeernews.com

یوں اتر جاتی ہے جیسے یہ صدا سب کی صدا ہو!

میں صدا کو نعرہ بنتے / نعرہ بن کر نغمہ بنتے

نغمہ بن کر روح میں ڈھلتے ہوئے بھی دیکھتا ہوں

اور اکثر سوچتا ہوں

کیا مری آواز بھی اس روح کے نغمے میں شامل ہو گئی ہے

سوچتا ہوں...... / اور تیرا سرخ چہرہ دیکھتا ہوں (کلکتہ)

قیصر شمیم صاحب کی صرف یہ ایک نظم پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک حساس شاعر نے کس طرح اپنی اس نظم میں فساد کی منظر کشی کی ہے۔ آج ہر شہر کا چہرہ سرخ ہے اور یہی سب کچھ نظر آتا ہے جس کی عکاسی قیصر شمیم صاحب نے اس نظم میں کی ہے۔ اس طرح دیگر درجنوں نظمیں ہیں جن میں قیصر شمیم نے اپنی شاعرانہ فنی تقاضوں کو نہ صرف پورا کیا ہے بلکہ اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ یہ نظمیں اتنی پر اثر ہو گئی ہیں کہ پڑھتے ہوئے قاری بھی ایک ذہنی تناؤ محسوس کرنے لگتا ہے اور اس پر بھی ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے مثلاً ان کی دیگر نظمیں جن کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں: ''کل اور آج، یہ سرو شب ہے، زیر دیوار، دعا مانگو، مجھے چھوڑ، یقیناً تمہاری یاد آتی ہے، درد آنسو مسکان، مجھے دکھ ہے، تیاگی، ایک پرانا بازی گر، جنسی کے دو بول'' اس طرح کی کئی نظمیں ہیں جن میں کسی نہ کسی اہم پہلو کو نہ صرف اجاگر کیا گیا ہے بلکہ بڑے موثر انداز میں اپنی بات کہی ہے۔ قیصر شمیم کو زبان پر بڑا عبور حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف زبان کا رکھ رکھاؤ ہے وہیں دوسری طرف ان کی علمی قابلیت بھی جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ شاعر کی نظر نہ صرف عالمی ادب پر گہری ہے بلکہ معلومات کا ایک بھنڈار ہے ان کے فن میں یہی وجہ ہے کہ کچھ ایسی نظمیں بھی اس کتاب میں شامل ہیں جن میں ان کی معلومات اور مطالعہ بھی عیاں ہے مثلاً ''نیل گائے'' کے عنوان سے جو نظم ہے وہ حریت پسند افریقی شاعر بنجامن مولائز کو ۱۹۸۵ء میں پھانسی کی سزا دینے پر کہی گئی ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کی عالمی ادب پر بھی گہری نظر ہے ورنہ ہم اردو والوں کو تو اردو کے ہی شاعروں کے بارے میں معلومات نہیں رہتیں۔ نظم ملاحظہ فرمائیے:

شکاریوں کے درمیاں / گھری ہوئی ہے نیل گائے

لہولہان ہے بدن / شکاریوں کے دانت بھی لہو کی طرح سرخ ہیں!

مگر عجب ہے نیل گائے / کہ اس کی آنکھ میں نہ کوئی خوف ہے نہ بے بسی

ہے آج اس کے سامنے اسی کے ایک بچھڑے کا جوان تن پڑا ہوا

www.taemeernews.com

شکاریوں کی رسیوں کی داستاں بنا ہوا!

اس جوان بچھڑے کے لبوں کی آخری صدا

فضا میں آج گونجتی ہے دور تک

شکاریو! / نجات نیل گائے کی قریب ہے

قریب ہے نجات نیل گائے کی

شکاریو! / یہ دیکھ لو کہ نیل گائے کے تمام بچھڑوں میں

ہے جوش انتقام کا

انھیں اب اپنی گولیوں سے روکنے کی کوششیں فضول ہیں! (نیل گائے)

اس طرح کی درجنوں نظمیں ہیں جن میں شاعر نے اپنے مختلف تجربات کو پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے خوبصورت اور پیاری نظم ہے "خدمتِ خلقِ خدا سے ہے منور تیرا نام" جو انجمن مفید الاسلام کلکتہ کی نذر ہے۔ قیصر شمیم کو اپنے وطن کلکتہ سے والہانہ پیار ہے جس کا اظہار انھوں نے دیگر نظموں میں بھی کیا ہے۔ سچائی یہ ہے کہ قیصر شمیم ایک طاقتور لہجے کے منفرد شاعر ہیں جن کی شاعری میں زندگی کی تلخیوں ان کے گہرے تجربات سے شاعر کو ایک مفکر کی سی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ قیصر شمیم نے بہت کچھ لکھا ہے۔ کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن پر تفصیل سے گفتگو انشاء اللہ بعد میں کی جائے گی۔ فی الحال ان کی اسی کتاب کی وہ شاہ کار نظم جو مجھے بے حد پسند ہے یہاں پیش کر رہا ہوں جو گاندھی جی کی ۱۲۵ ویں سال گرہ پر کہی گئی ہے بعنوان "تمھاری یاد آتی ہے":

تمھاری یاد آتی ہے

مگر اس یاد میں آنسو نہیں ہوتے

تمھیں کھونے کا پچھتاوا / بھی اب دل کو نہیں ہوتا

کہ وہ دنیا / بدل کر رہ گئی ہے

جس کی مٹی میں کبھی تم نے / بہت سے خواب بوئے تھے

تمھارے خواب / اسی مٹی میں

یوں بے جان ہو کر رہ گئے ہیں / جیسے اپنی گود کے پالے ہوئے

معصوم بچے / دفن ہو کر رہ گئے ہوں

اپنے ہی آنگن کی قبروں میں!

www.taemeernews.com

تمہاری یاد آتی ہے / مگر اس یاد کے پردے پہ
وہ تصویر بھی ہوتی نہیں ہے / جو تمہارے نام پر
اس دیش کے بازار میں / ہر روز بکتی ہے ___
تمہارے جنم دن پر / یا تمہارے مرتیو دیوس پر
یہی تصویر سب کے کام آتی ہے / اسی تصویر پر مالائیں چڑھتی ہیں
کہ مالائیں چڑھا کر لوگ / اس احسان کا بدلہ چکاتے ہیں'
جو اپنی جان دے کر ایک دن تم نے کیا تھا!
تمہاری دیش بھگتی / بند ہے تاریخ کے بوسیدہ پنوں میں
تمہاری وہ اہنسا / جس کے آگے سورما بھی سر جھکاتے تھے'
تمہارے ساتھ ہی اس کو بھی گولی لگ گئی تھی
اب اس کی لاش بھی ملتی نہیں ہے

تمہاری یاد آتی ہے / مگر اس یاد میں آنسو نہیں ہوتے
کہ کوئی دل بھی اب سابرمتی کا آشرم
بنتا نہیں ہے! (تمہاری یاد آتی ہے)

قیصر شمیم کی یہ وہ دل دہلا دینے والی نظم ہے جس میں پورے ہندستان کی تاریخ بیان کردی گئی ہے کہ جس آزادی کا خواب گاندھی جی نے دیکھا تھا اگر وہ آج ہوتے تو خون کے آنسو روتے۔ اس لیے کہ جو کچھ ان کے دیش میں اب ہو رہا ہے یہ دیکھ کر تو اب ان کی آتما بھی روتی ہوگی۔ نظم کے ایک ایک لفظ میں شاعر نے زندگی کی روح کو سمو دیا ہے اور وہ سب کچھ بیان کردیا ہے جسے دیکھ کر گاندھی جی کی روح بھی کانپ اٹھے لیکن واہ رے اس دیش کے باسی، گاندھی جی کی تصویر کو تو اتنا سمّان! مگر اس دیش کے انسانوں کی لاشوں کو دیکھ کر کوئی ملال نہیں! اس طرح کی بہت سی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے اپنی دلی کیفیت کو بڑے دردانگیز لہجے میں بیان کیا ہے جس سے نظموں میں ایک زبردست تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔

www.taemeernews.com

خالق عبداللہ

حضرتِ قیصر شمیم کی شاعری یا کارگہِ شیشہ گری

حضرتِ قیصر شمیم کی پُر وقار شاعری پر اظہار خیال کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ادب کی تھوڑی سی بات کر لی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ادب کسی جامد دریا کی طرح نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے اور اس کی یہ نئی شکل جو اپنی پچھلی ہیئت کی نفی کر کے حاصل ہوتی ہے' زیادہ پُرکشش اور حقائق انسانی کے زیادہ قریب ہوتی ہے یعنی دنیا میں خیالات اور تفکرات ہی حقیقت ہیں اور یہ خیالات اور تفکرات ہی بامِ ترقی پر پہنچ کر ہیئت اور مواد میں قابلِ اعتبار تغیر پیدا کر کے سماجی اور ذاتی دونوں احساسات کو اپنی معنوی گرفت میں لیتے ہیں۔ صرف تصور اور زماں اور مکاں کے اسرار پنہاں کو سمجھنا مزاج ادب کے بالکل متوازی ہوتا ہے۔ بالکل ریل کی پٹریوں کی طرح جو کسی مقام پر بھی آپس میں مل نہیں سکتیں۔ ہر شاعر اور ادیب اگر وہ ادب کے منصب سے واقف ہو' یہی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے دور کے ڈھونگی اور نادیدہ حقائق پر نشتر زنی کر کے اپنے دور کو ایک راہِ نجات دکھانے کی سعی کرے۔ حتیٰ کہ سائنسی علوم بھی اسی لیے معرضِ وجود میں آئے ہیں کہ وہ انسان کی مثبت رہنمائی کر سکیں۔ مثل مشہور ہے کہ زبان کی طاقت بر سرِ اقتدار طبقہ کی بے ضمیر استعمال شدہ حاکمانہ زبان کی کھوکھلی طاقت سے زیادہ قوی اور احتجاجی ہوتی ہے۔ قیصر صاحب کی پوری شاعری اس محور کے گرد گردش کرتی ہے اور شعور و آگہی کے ایسے روشن اور منور چراغ روشن کرتی ہے جسے بجھانا خود اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کرنا ہے۔ وہ لوگ جو محض تفنن طبع کی خاطر عادتاً شعر گوئی کرتے ہیں' قیصر شمیم صاحب کی گردِ پا کو بھی نہیں چھو سکتے کیوں کہ قیصر شمیم صاحب اس سماج میں شمع لاشریک کی طرح نہیں رہے۔ ظاہر ہے کہ اوسط درجہ کے فن کاروں کے بے جان بیانات ہوا کے ہلکے جھونکے ہیں جو چراغوں اور سورج کو تو خیر بجھانے سے رہے' وہ معمولی پودوں کو بھی گزند پہنچانے کی منفی صنعتوں سے معذور و لاچار ہیں۔

قیصر شمیم صاحب کے زمانے میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی عامرانہ نگرانی میں جدیدیت کا آغاز ہو چکا تھا۔ بہت سی معصوم روحیں ہزاروں انسانوں کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر بھی محض حصولِ شہرت کی خاطر اپنی ذات کا نوحہ پڑھ رہی تھیں جس کا تعلق روزمرہ کی عام زندگی سے بالکل نہیں تھا۔ نئی تہذیب کی روشنی جس کو

www.taemeernews.com

غالب کی جہاندیدہ آنکھوں نے بہت پہلے دیکھا تھا اس سے انحراف کر کے ماضی بعید کی جانب مراجعت کر رہی تھیں۔ جب کہ کامیُو کافکا اور سارتر وغیرہ جیسے شعرا اور ادبا جن کو ماورائیت کی تحریک سے جبراً منسلک کر دیا گیا تھا ان فنکاروں کے یہاں بھی زندگی کے تلخ حقائق کا ذکر انتہائی شکایتی انداز میں ملتا ہے۔ اس میں لاشعور کی کارفرمائی قطعی نہیں ہے۔ بہر کیف قیصر شمیم صاحب نے اس طوفانِ بلاخیز کا پہلے تو خوب گہری نظروں سے جائزہ لیا اور عالمِ افراتفری میں فوراً اس معاملے میں ایک شریکِ کار کی حیثیت سے شامل نہیں ہوئے ہیں۔ استعارے، کنایے، علامتیں وغیرہ کی خودساختہ تعریفوں کے جادو کا اثر کچھ اپنے باشعور ذہن پر مرتسم ہونے نہیں دیا۔ بلکہ کچھ دنوں تک ان تخلیقات کا ہر پہلو سے مطالعہ کرنے کے بعد اپنے انداز کے جدید رجحان کو اپنایا اور ایک صحت مند اور افادی شاعری کا آغاز تابناک کیا۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "ساعتوں کا سمندر" جسے "سپرنا" جیسے مشہور و معروف ادارے نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع کر کے ادبی دنیا میں ایک ولولہ انگیز ماحول پیدا کر دیا۔ عوام سے لے کر خواص تک نے اس کو نگاہِ پسندیدگی سے دیکھا اور ان کی حق بیانی سے بہت متاثر ہوئے۔ بہت دنوں کے بعد ایک مردِ حق آگاہ نہایت جسارت کے ساتھ منظرِ عام پر آیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد ایسی آواز سنی گئی جو صدائے صحرا کی بجائے عصائے کلیمی سے مماثل تھی۔ اس طرح قیصر صاحب نے اپنی ادبی برتری کا سکہ ہر شخص پر جما دیا۔ یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی کی ہی دلسوزی پنہاں نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری عصری تاریخ پر بھی حاوی ہوتی ہے۔ وہ پیچیدہ خیالات کے گلیاروں میں سرگردانی نہیں کرتے اور بلاوجہ ہر آستانے پر سجدہ ریز نہیں ہوتے۔ الفاظ کا بیجا اور غیر ضروری استعمال تو سرے سے ان کے یہاں ہے ہی نہیں۔ ان کی تخلیق شہریار، عمیق حنفی، شہاب جعفری اور اختر الایمان کی طرح Compact ہے۔ معنویت کے اعتبار سے ان کی شاعری جمہوری ضمیر کو بیدار کرنے کی ایک فطری کاوش ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جس ملک کا تعلیمی، اقتصادی، دفاعی غرض کہ ہر نظام بدعنوانی اور بدنظمی کا شکار ہو وہاں ایک شاعر کا انداز یقیناً شکایتی ہوگا اور یہ خلافِ فطرت بھی نہیں ہے۔

قیصر صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام "پہاڑ کاٹتے ہوئے" اسی قسم کی شاعری کی ایک کڑی ہے۔ اس میں خیالات اور زیادہ وسیع ہیں۔ ان میں کثیر المعنویت بھی ہے اور ہمہ جہتی بھی۔ اس مجموعہ کو پڑھ کر ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شاعر ہیں ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگانے والے کرتب باز نہیں ہے۔ ان کی اپنی ایک آواز ہے۔ اپنی ایک شناخت ہے۔ فنی لحاظ سے ان کی شاعری میں میر کی خستگی اور غالب کی پریشان خیالی ہے۔ ان کی شاعری رطب و یابس سے پاک ہے۔ وہ لفظوں کا مناسب اور موزوں استعمال کرنے پر قادر ہیں ان کے زیرِ سایہ جو بھی آیا وہ خود ہی ایک امتیازی خصوصیت کا شاعر بن گیا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ان کی شاعری

www.taemeernews.com

کارگہِ شیشہ گری ہے۔ مبصروں کو چاہیے کہ ان کے کلام پر رائے زنی ہوتے وقت یہ خیال رکھیں کہ یہ تخلیقات نازک آبگینوں کی طرح ہیں۔ ان کی ذرا سی بد احتیاطی ان آبگینوں کو پاش پاش کر سکتی ہے۔

درج ذیل نظموں کا مطالعہ کریں اور اپنے ذہن و دل کو فکر کی ضیاباری سے روشن کرلیں۔

سمندر کو / کئی ندیوں میں
جب ہم بانٹ دیں گے / تو یہ ندیاں بھی
سفر میں روز و شب کے / دیکھتے ہی دیکھتے
چھوٹی بڑی کتنی ہی نہروں میں بٹیں گی
اور سونے بے مروت آسماں کا منہ تکیں گی
پھر کسی دن یوں بھی ہوگا :
سر برہنہ پیاس / جب نکلے گی پانی ڈھونڈنے
تو ہر طرف اس کو چمکتی ریت کے ذرے ملیں گے!

(سمندر بے کراں ہے)

اس نظم میں انسانوں کے غیر منظم رویے کی جانب نہایت حسین پیرائے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ایک دوسری نظم "کل آج کل" کا اختتامی حصہ ملاحظہ فرمائیں :

اصل معبد ہر ایک دل میں ہے　　غیر ممکن ہے توڑنا جس کا
تیر سینوں پہ لوگ کھائیں گے　　اپنا ایماں مگر بچائیں گے
کب یہ سمجھے گی فوج اندھوں کی　　آج مٹی کا ایک ڈھیر سہی
کل یہ ملبہ شکستہ معبد کا　　ایک جوالا مکھی نہ بن جائے

اس نظم میں بے ضمیر اور لاکرداری پر سخت تنقید کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ پیش قیاسی بھی کی گئی ہے کہ وہ وقت نزدیک ہے جب اس شیطانی ذہنیت کا خاتمہ بالخیر ہوگا اور ظلمت کے بطن سے ہی انسانیت کا سورج طلوع ہوگا۔ ایک دوسری نظم "درد آنسو مسکان" کا ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیں :

درد نہ گورا، درد نہ کالا
درد نہ ہندو، درد نہ مسلم
درد جہاں ہو، جس دل میں ہو

www.taemeernews.com

درد ہی اس کا نام

دل میں رہنا' دل کو ستانا' جگ میں اس کا کام

ہی اس کا نام

اس میں دنیا کے تمام انسانوں کے لیے متحد ہو کر بھائی چارگی کے ساتھ رہنے کا ابدی پیغام ہے۔ اسی طرح کی شاہ کار نظموں میں نئی صف پر اتارا' ستہ' نئی تاریخ' ایمان وغیرہ ہیں۔

ایمان کے آخری بند پر توجہ دیں :

ماں کی آنکھوں کی مسکان / جوت جگاتی رہتی ہے'

راہ دکھاتی رہتی ہے / ماں کے آنچل کا سایہ آج ہمارے سر پر ہے

ماں کے آنچل کے سائے میں بچوں کا سکھ ہوتا ہے

ماں کے آنچل کا سایہ تو سب کے لیے ہے

چاہے جیسی ہو سنتان / اس آنچل کے ٹکڑے کرنا

ماں کا ہے اپمان

اس نظم میں مادرِ وطن سے گہری محبت کا اظہار ملتا ہے۔ ایک اور نظم "سب کو خوشی دے دے' بہت ہی غور طلب ہے۔ آخری حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

خدایا!

اپنے ان بندوں کو جو مظلوم بن کر جی رہے ہیں تیری دنیا میں

جو شمعیں چشمِ تر کی لے کے نکلے ہیں کسی امیدِ فردا میں

انھیں اب آبرومندانہ کوئی زندگی دے دے

خدایا!

دے خوشی، سب کو خوشی دے دے!

یہ ایک مناجاتی نظم ہے جو خدا کے حضور میں حسن' مسرت کے لیے دعا گو ہے۔ کیوں کہ زندگی خدا کی سب سے بیش بہا نعمت ہے۔ پورا مجموعۂ کلام ہی لائق مطالعہ ہے۔ ان نظموں میں پیڑ پودے، سنگِ دشت، قصبے اور شہر، شاہراہیں غرض کہ کائنات کا ذرہ ذرہ مائل بہ احتجاج ہے۔

www.taemeernews.com

سلیم انصاری
جبل پور

قیصر شمیم کی نظموں پر ایک نظر

قیصر شمیم ایوانِ ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا تخلیقی سفر پانچ دہائیوں سے بھی زائد عرصہ پر محیط ہے۔ ان کا کلام عرصۂ دراز سے رسائل و جرائد کے حوالے سے ادب کے سنجیدہ قارئین تک پہنچ رہا ہے۔ "پہاڑ کاٹتے ہوئے" نظموں پر مشتمل ان کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔

قیصر شمیم مغربی بنگال کے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں، ان کی خصوصیت بلکہ کنٹری بیوشن (Contribution) یہ ہے کہ وہ نوجوان نسل کی ذہنی و شعری تربیت کا نیک کام بھی انجام دے رہے ہیں۔

قیصر شمیم کی نظموں کے موضوعات عام انسان کے مسائل و مصائب سے عبارت ہیں، جس کا سبب غالباً یہی ہے کہ انھوں نے جس علاقے میں آنکھ کھولی وہاں زندگی سے جوجھے انسانوں کی ایک پوری بستی آباد تھی۔ قیصر شمیم کی نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مسائل سے راہ فرار اختیار نہیں کی، بلکہ ان سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کیا۔ زندگی کی یہ تمام جدوجہد ان کی نظموں میں تخلیقیت سے مملو نظر آتی ہے۔ ان کی کتاب کا نام "پہاڑ کاٹتے ہوئے" بھی ان کی تخلیقی دشاؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

قیصر شمیم کی نظموں میں جو خصوصیت سب سے نمایاں ہے وہ ان کے مشاہدات و محسوسات کے تخلیقی تجربے سے عبارت ہے۔ وہ حوصلہ، امید اور زندگی کے تئیں مثبت رویوں کے شاعر ہیں، ان کی نظمیں ایک ایسے انسان کا زندگی نامہ ہیں جو مایوسی، ناامیدی اور ذات کی شکست و ریخت سے مسلسل برسرِ پیکار رہتا ہے:

اگر کالی بلاؤں کے پرستاروں میں تم بھی ہو
تو جاؤ شوق سے جاؤ / سیاہی منہ پہ مل لو
رات کے خیمے میں جا کر / سازشی ہاتھوں کو چومو
رات بھر نشے میں جھومو، جس طرح چاہو
مجھے چھوڑو کہ میں کالی بلاؤں کے پرستاروں کا دشمن ہوں (مجھے چھوڑو)

www.taemeernews.com

یا پھر :

اجل سے لڑتے ہیں جو لوگ اہلِ ہمت ہیں
تمہاری طرح جہاں سے بدل نہیں جاتے
نظامِ جور و ستم کو جو بدلتے رہتے ہیں
وفورِ غم سے وہ خود ہی بدل نہیں جاتے (خودکشی کرنے والے کے نام)

نظموں کے مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قیصر شمیم کے یہاں نظمیں کسی میکانکی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے جذبوں کی صداقت کا آئینہ ہیں۔ ان کی نظموں میں مجھے ایک خاص بات اور نظر آئی اور وہ یہ ہے کہ ان کی بعض نظموں کا لہجہ دعائیہ ہے، بلکہ کئی نظموں میں خدا کے سامنے خود سپردگی کا جذبہ بھی موجود ہے، جو یقینی طور پر خدا پر ان کے یقین اور ایمان کی پختگی کا مظہر ہے۔ اس اعتبار سے قیصر شمیم کی نظموں کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نظموں کی تخلیق کو تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اپنی وارداتِ قلب اور جذبِ دروں کو تخلیقی پیرہن عطا کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں :

خدا میں سر بہ سجدہ ہوں / ترے احسان کے آگے
مرے سجدے نہیں کچھ بھی / میں تیرے بندگانِ نیک کی
خاکِ کفِ پا سے بھی ہر حالت میں کمتر ہوں (سجدہ)

دے خوشی، سب کو خوشی دے دے
یہ دنیا تیری دنیا ہے
تری دنیا کی ہر مخلوق تیری ہے
یہ بندے تیرے بندے ہیں (سب کو خوشی دے دے)

سجدہ گزاروں کو اپنے خوار نہ کر
عزت و ذلت کے مالک کچھ عزت دے
بہنوں کے سر سے جب چادر چھنتی ہے
بھائی تکتے رہ جاتے ہیں، غیرت دے
(دعا)

www.taemeernews.com

قیصر شمیم کی شاعری کے مختلف پڑاؤ ہیں، ان کے یہاں حالاں کہ شاعری میں کلاسیکی قدروں کے احترام کا جذبہ شدید ہے تاہم انھوں نے عصری حسیت اور جدید تقاضوں کی آمیزش سے اپنی نظموں کا خمیر تیار کیا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ ان کے یہاں شاعری کبھی مل میں کام کرنے والے مزدوروں کے مسائل کی آواز بن جاتی ہے تو کبھی ظلم وستم، فرقہ واریت اور طبقاتی کش مکش کے خلاف احتجاج بن جاتی ہے۔ انھوں نے عید پر متعدد نظمیں اپنی کتاب میں شامل کی ہیں، جن میں انھوں نے اپنے محسوسات کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ عید خوشی اور مسرت کا تہوار ہے لیکن بیکس و مجبور اور محروم لوگوں کے لیے عید کے کیا معنی ہیں، اس کا اظہار انھوں نے اپنی نظم میں کیا ہے، اس کے علاوہ عید کے دن رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں بھی انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں :

چولہا ٹھنڈا
ہانڈی خالی، پیٹ بھی خالی ہے تو کیا؟
تن پر لتّا، بدحالی ہے تو کیا؟
بدحالی سے رسوائی کیا......؟ عید مناؤ۔ (عید مناؤ)

کیوں کبھی میرٹھ، کبھی دلّی، کبھی گجرات کا کوئی علاقہ
بھائی چارہ، دوستی، ہمسائیگی، انسانیت......
سب کچھ بھلا کر
دیکھتے ہی دیکھتے تبدیل ہو جاتا ہے قبروں کے نگر میں
اور انھیں قبروں پہ جا کر عید کے دن
کتنے معصوم چہرے خامشی سے پوچھتے ہیں
واقعی کیا اپنے بندوں سے خدا روٹھا ہوا ہے؟
یا زمانے کی سیاست کھیل اپنا کھیلتی ہے
زندگی چپ چاپ کیا کیا جھیلتی ہے (عید ۱۹۸۷ء)

عید آئی ہے مگر ہم کیا کریں

www.taemeernews.com

مدتوں سے کارخانہ بند ہے

یہ خوشی کا دن بھی

اپنے ذہن پر اک بار سا محسوس ہوتا ہے ہمیں......

دست گیری کوئی بھی کرتا نہیں،

کس قدر بد بخت ہے محنت یہاں

کوڑیوں کے مول بھی بکتی نہیں (عید آئی ہے مگر)

قیصر شمیم نے اپنے تلخ تجربات کو نظموں کے وسیلے سے زبان دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے جہاں ایک طرف مزدوروں کی بے بسی، بے کسی، محرومیوں اور ملک میں تیزی سے تبدیل ہوئی سیاسی صورت حال کے نتیجے میں ختم ہوئی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارگی کو اپنی سوچ کا محور بنایا وہیں دوسری طرف جمہوری قدروں کی پامالی اور ملک میں غریب، نادار اور بے بس مزدوروں کی پسماندگی کے حوالے سے بھی سوال قائم کیا ہے۔

قیصر شمیم اپنے گردوپیش کے حالات سے باخبر ہیں، اور شاید یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں نظموں کے موضوعات بھی آس پاس کی مٹی سے روشن ہوتے ہیں۔

قیصر شمیم نے شخصی نظمیں بھی لکھیں ہیں اور خاصی تعداد میں لکھی ہیں۔ کبھی اپنے دوستوں اور شاگردوں کی غم وخوشی پر نظمیں لکھتے ہیں۔ کبھی گاندھی جی کی سال گرہ اور نیلسن منڈیلا کی شخصیت سے متاثر ہو کر نظمیں لکھتے ہیں تو کبھی ان کی نظمیں افریقی شاعر بنجامن مولائز کو دی گئی پھانسی اور لیبیا پر امریکی حملے کے خلاف احتجاج بن جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو قیصر شمیم کی نظموں کا کینوس وسیع ہے اور سرحدوں، زبانوں اور تہذیبوں کے حصار سے باہر نکل گیا ہے۔

قیصر شمیم چوں کہ کہنہ مشق شاعر ہیں، فن پر ان کی دسترس عمدہ ہے لہٰذا ان کے یہاں اظہار و بیان میں ایک طرح کی شگفتگی اور روانی کا احساس ہوتا ہے ـــــ اور چونکہ ان کی حیثیت پر کلاسیکی شاعری کی پوری وراثت موجود ہے، لہٰذا ان کی نظموں میں مبہم علامتیں اور گنجلک استعارات کا احساس نہیں ہوتا بلکہ براہ راست ذہن و دل پر اثر انداز ہونے والا ایک پاور فل لہجہ موجود ہے جو ان کی نظموں کو ترسیل کے المیے کا شکار نہیں ہونے دیتا۔

"پہاڑ کاٹتے ہوئے" ایک ایسی کتاب ہے جس میں لفظوں سے بنائی ہوئی ایسی تصویریں ہیں، جو اپنے عہد کی سچائیوں کا خوب صورت تخلیقی اظہار ہیں۔

www.taemeernews.com

افضال عاقل

گاردلیا

انسانی تجربوں کے مزاج شناس : قیصر شمیم

(نظموں کے حوالے سے)

"بنگال" آزادی کے بعد بھی اپنے دامن میں دہشت ناک واقعات، تباہی اور بربادی لیے ہوئے تھا۔ ہر سطح پر معاشرتی تغیر، تہذیبی بکھراؤ، انسانی اقدار کی پامالی ہوتی رہی تھی۔ لیکن مغربی بنگال کے شعراء و ادباء نے اپنے حساس ذہن کو کھلا رکھا اور اپنے خطے کی صورت حال کی تصویر کشی کرتے رہے۔ آزادی کے بعد جن چند شعراء نے اپنے عہد کی شکست و ریخت کا احاطہ کیا، ان میں قیصر شمیم کا کردار قابل تحسین رہا ہے۔ انھوں نے فقط حالات کی ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ "اردو نظم" کو نئی جہت سے آشنا بھی کیا اور اس کو پرانی تشبیہات و استعارات کے حصار سے باہر نکالا اور نئے مفاہیم سے آراستہ کیا۔

گرچہ ہمارا خطہ (بنگال) کا شعری منظر نامہ خصوصی طور پر غزل سے عبارت ہے اور کسی شاعر نے نظم کی طرف رجحان قائم کیا بھی تو وقتی طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ منہ کے ذائقہ بدلنے کے لیے۔ لیکن اس سے انکار بھی ممکن نہیں کہ یہاں کے شعراء نے ہر دور میں اصناف سخن کو کلیجے سے لگائے رکھا۔

قیصر شمیم بقول عنوان چشتی "شاعر کا ذہن اشتراکیت سے وابستگی کی باوجود جدید شاعری کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے" نے نہایت ہی سچائی اور ایمان داری کے ساتھ اپنے خطے کی کشمکش اور زمانے کی روش، حالات، مسائل اور کرب کو نظموں کی وساطت سے پیش کیا ہے۔ ان کی نظمیں مقناطیسی قوت اظہار کے سبب قاری کی توجہ کھینچتی ہیں۔ وہ سخن شناس اور سخن فہم شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک بڑا حصہ گہرے تجربات و مشاہدات اور عصری احساسات کا غماز ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے نئی لفظیات، نئی تشبیہات اور استعارات کی مدد سے انسانوں کی زندگی کے درد و داغ کو شدت احساس کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کی نظموں کی جدت میں کائنات کے مختلف تجربات اور جہد مسلسل کی کشاکش، شاعرانہ بصیرت، حالات و ماحول کے ظالمانہ رویے کے خلاف احتجاج کی قوت موجود ہے۔

www.taemeernews.com

مظہر امام کے الفاظ میں "وہ (قیصر شمیم) انسانی زندگی کے رمز آشنا اور انسانی تجربات کے مزاج شناس ہیں۔" کی روشنی میں عرض کرتا چلوں کہ قیصر شمیم کی نظموں میں زندگی کے مصائب، لاحسیت، انسانوں کے کرب، زمانے کی ستم ظریفی موجود ہے۔ بطور مثال نظم "آج کا انسان" پیش کی جاسکتی ہے جس میں زندگی کی نئی للک اور زنداں سے نکلنے کا درس ملتا ہے :

نہ صبح ' صبحِ مسرت
نہ شام شامِ الم
نہ کوئی حرفِ تمنا
نہ کوئی آہتِ غم
نہ دل میں جوشِ توقع
نہ جاں کو بیمِ توہم
نہ زندگی کا تموج
نہ موت کا ہی سکوت
کہاں ہے ؟ آج کا انساں ' اسے خبر بھی نہیں '
قیام بھی نہیں اس کا ' کہیں سفر بھی نہیں !

(نظم : "آج کا انسان" - ساعتوں کا سمندر ص ۱۴)

قیصر شمیم کا پہلا شعری مجموعہ "ساعتوں کا سمندر" ۱۹۷۱ء میں پیرنا کے زیر اہتمام اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں مشترکہ شائع ہوا تھا۔ اس میں غزلوں کے ساتھ سولہ نظمیں بھی ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں غزلوں کا مجموعہ "سانس کی دھار" کی اشاعت کے بعد ان کی نظموں اور گیتوں کا مجموعہ "پہاڑ کاٹتے ہوئے" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کی نظمیں پڑھنے سے علم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ شہر کی بے وفائیوں اور کرب ناکیوں میں گزرا ہے۔ باوجود اس کے ان کی نظموں میں شہروں کی قدروں کا احترام ملتا ہے اور اس کا احساس بھی ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی سفر کرب ناکیوں سے عبارت ہونے کی باوجود شاعری زندگی کا استعارہ بن گئی۔ ان کی نظمیں "تاش کے پتے"، "میرا کمرہ"، "کلکتہ"، "نئے کوہ قاف کی کھوج میں" اور "آئینۂ آب" زمانے کی شکست و ریخت، اداس اور خوف زدہ ماحول کی بشارتیں دے رہی ہیں نیز الم دیدگانِ شہر کے گوناگوں احساسات اور نئی زندگی کے دستِ ہنر سے آشنا بھی کرتی ہیں :

www.taemeernews.com

آب کے آئینے کی طرح حسیں
اے مرے دوست میرا دل بھی تھا
وقت نے جس کو کردیا مجروح
اس حسیں آئینے کو توڑ دیا!!

(نظم: "آئینۂ آب" ساعتوں کا سمندر ص ۸)

اس لمبی چوڑی دنیا میں میرا یہ چھوٹا سا کمرہ
جیسے باغ کے اک کونے میں مٹی کا اک پنجرہ ہے
کاٹ رہا ہوں اپنے دن میں اس پنجرے میں گھٹ گھٹ کر
یہ جیون کیسا جیون ہے، یہ جینا کیا جینا ہے!!

(نظم: "میرا کمرہ" - پہاڑ کاٹتے ہوئے ص ۸۵)

مہ و سال کتنے گزر گئے — کئی راستے، کئی پیچ و خم
کفِ پا سے لے کے خراجِ خوں — ہوئے خوش تو اور سنور گئے
مگر آنکھ ان سے نہ خوش ہوئی — نہ ٹھہر سکی، نہ چمک سکی
مہ و سال دوشِ ہوا پہ تھے — وہ ستم ستم کئی راستے
وہ الم الم کئی پیچ و خم — لیے اپنے ساتھ گزر گئے
ہمیں دے گئے — نئی ساعتوں کے دیار میں
" رہ گزر، نئے پیچ و خم !!

(نظم: نئے کوہ قاف کی کھوج میں)

ہم سب کیا ہیں؟ تاش کے پتے! — جانے کتنی صدیوں سے ہم
انگلی انگلی ناچ رہے ہیں — اور ہمارے ناچ کی دھن پر
کھیلنے والے جھوم رہے ہیں — اپنی تجوری چوم رہے ہیں!

(نظم: تاش کے پتے)

"ایک صبح" ایک شہکار نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے جنگلی ندی کا نظارہ پیش کیا ہے۔ جنگلی ندی کی کشش شاعر کو مختلف مراحل کی سیر کراتی ہے۔ شاعر جنگل کی خاموشی کو عورت کے گورے مکھ پر گہری اداسی سے تعبیر کر رہا ہے تو

www.taemeernews.com

بھی اونچے اونچے پیڑ پر خاموشی سے تکنے کا منظر پیش کیا ہے۔شاعر کے خیال میں ندی کے کنارے کھڑے درخت کی ساری شاخیں اور سارے پتے پاپوں کے پیک بنے ہوئے ہیں لیکن جب ہُگلی کی لہریں بل کھاتی تٹ پر آتی ہیں تو شاعر کے من کو پاگل بنا دیتی ہیں اور شاعر مانجھی کو گیت سنانے کی اصرار کرنے لگتا ہے۔نظم "خلیج" میں شاعر نے "میں اور ہم" کے فاصلوں کو پاٹنے کا سلیقہ بیان کیا ہے۔"تہذیب کا زندانی" میں شاعر نے بلندی کے پیروں میں پستی کی زنجیر پڑنے سے جو الجھن پیدا ہوتی ہے اس کو لفظوں میں بیان کیا ہے۔آج کے دور کا انسان خواب و خیال میں زندگی کے ایام کاٹ رہا ہے۔اس کی مثال نظم "گمشدگی" ہے جس میں شاعر اپنی پہچان کی بازیافت کر رہا ہے کہ انسان کتنا نادان ہوتا ہے جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی شناخت کرنے میں ناکام رہتا ہے:

اپنے گرد و پیش ابھی تک
میں نے کتنی ہی دیواریں چن رکھی ہیں
میری ترقی کے زینے بھی
دیواروں سے اوپر اٹھنا بھول چکے ہیں
میری بلندی کے پیروں میں
میری پستی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں
آپ ہی اپنا زندانی ہوں! (نظم: تہذیب کا زندانی)

اپنی اپنی گم شدگی کی دنیا میں
اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں ہم نادان!
کون یہاں ہے، جس سے پوچھیں اپنا پتہ! (نظم: گمشدگی)

"میں" سے "ہم" تک کی دوری کو
کتنے "میں" جب مل جاتے ہیں
ہر "میں"
اپنے آپ میں گم رہتا ہے
دور کھڑا رہتا ہے سب سے!
میں سے ہم تک کی دوری کو؟

ہم تم کیسے پاٹ سکیں گے؟
تب "ہم" کی منزل آتی ہے
ایک اکیلے پیڑ کی صورت
جھنڈ میں پیڑوں کے رہ کر بھی
ہم تم کیسے پاٹ سکیں گے
ہم تم بھی تو ایک نہیں ہیں!
(نظم: "خلیج")

www.taemeernews.com

نظم "بتیسویں پہاڑ کٹنے کے بعد" ایک شہکار نظم ہے جو ہر قاری کو حسین تہذیب کی دہلیز پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ شاعر سے خود آرزو دے سفر کا سوال کرتی ہے اور شاعر مسکرا کر آگے چل پڑتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عام انسان کی طرح شاعر بھی آرزو کے سفر کو آئینہ دکھاتا ہے یعنی تمام خواہشوں کو بلند ہونے نہیں دیتا۔ نظم پڑھنے کے بعد محسوسات کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں اور آرزو کے ناگہانی سوالوں کے دائرے میں شاعر گھر جاتا ہے۔

نظم کی تمہید ملاحظہ کیجیے :

ہاتھوں پہ میرے برف کی بارش ہوئی مگر — یہ ہاتھ ہی رکے نہ مرا تیشہ ہی رکا
بتیسویں پہاڑ کی چوٹی بھی کٹ چکی — لیکن وہ آرزو، وہ طرح دار آرزو
جس کو کھلی فضا کا تبسم پسند ہے — آزاد پنچھیوں کا ترنم پسند ہے

بتیسویں پہاڑ کے کٹنے سے پہلے "وہ آرزو" کبھی ہراساں نہیں ہوئی تھی لیکن پہاڑ کٹنے کے بعد "آرزو" گھبراہٹ میں سوال کرتی ہے :

کیا دوسرے پہاڑ پہ تیشہ چلاؤ گے؟ — کب تک یہ پہاڑوں سے پنجے لڑاؤ گے؟
فرہاد کا یہ فرض کہاں تک نبھاؤ گے؟ — جس نہر کی تلاش ہے، وہ نہر پاؤ گے؟
ان ناگہاں سوالوں پہ پل بھر رکا ہوں میں — پھر مسکرا کے تیشے لیے چل پڑا ہوں میں

"نیل گائے" حریت پسند افریقی بنجامن سولائز کو ۱۹۸۵ء میں پھانسی کی سزا دینے پر لکھی گئی۔ اس نظم میں انتقام کی کشش ہچکولے مار رہی ہے۔ اس قبیل کی دوسری نظم "؟" ہے۔ یہ نظم لیبیا پر امریکی حملے کے نتیجے میں کرنل قذافی کی گود لی ہوئی بچی کی ہلاکت پر کہی گئی تھی جس میں ایک معصوم چہرے کی بے گناہی مہک رہی ہے۔ "قلم کا سپاہی" منشی پریم چند کی یاد میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں پریم چند کے عہد کی افراتفری، معاشی ابتری اور مناظر قدرت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

مجموعہ "پہاڑ کاٹتے ہوئے" کی بیشتر نظمیں مقصدیت، تخلیقیت، اجتماعیت اور انفرادیت کا حسن بکھیرتی ہیں۔ شہر کی بھیڑ میں سانس لینے والا شاعر شہر کی ریاکاری، سیاسی ابتری، نفرت، دشمنی اور تعصب و اضطراب کی عکاسی کرتا ہے۔ جن کے ہر مصرعے میں دردمند دل کی لہریں اور سنجیدہ کیفیات کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ نظم "کل آج کل" میں ساعت فیصلہ کی تفسیر ملتی ہے کہ فیصلے کے وقت انسان کس قدر ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور مذہب کی فریب کاری میں الجھ جاتا ہے۔ نیز پہلے معبد کو ایک جلسے میں تبدیل کر کے جھوٹی جنت کا خواب دیکھ رہا ہوتا ہے۔ دوسری طرف وقت کی موج شاعر کو تھپیڑے لگا رہی ہے اور "بچی کے بول" اسے گالی لگ رہے ہیں اور وہ محسوس کرتا ہے کہ آج کے منصب

www.taemeernews.com

دور میں انسان دورخی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ کہیں وطن کو مادرِ ہند کہتا ہے اور کہیں مادرِ ہند کا سودا کر رہا ہے۔ اس صورت حال میں شاعر"ایمان" نظم کہتا ہے۔ نظم "یہ سپنا کب پورا ہوگا" میں شاعر نئے سنسار کا سپنا دیکھ رہا ہے لیکن پھولوں میں تیزاب کی بو چتوں میں گندھک کی مہک زندگی کے خون کے دھبے سارے سپنوں کو توڑ دیتے ہیں :

ہم سب کب سے دیکھ رہے ہیں	ایک نئے سنسار کا سپنا
یہ سپنا کب پورا ہوگا؟	آج تو ہم سب دیکھ رہے ہیں
پھولوں میں تیزاب کی بو ہے	چتوں میں گندھک کی مہک ہے
ڈالی ڈالی آگ بھری ہے	جیون پر ہیں خون کے دھبے
لمبی ہے یہ دکھ کی کہانی	کیا یہ کہانی ختم نہ ہوگی

یہ لمبی کہانی ختم نہیں ہوتی بلکہ زندگی کے پیلے چہرے پر پھول کی لالی' سندرتا کی کرنیں اور مدھ کا پیالہ دے کر چپ چاپ مسکرا کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن نظارا کرنے والے خود سندرتا کی تکمیل کی کشش میں جتلا ہو جاتے ہیں :

ہم سب کب سے سوچ رہے ہیں	جیون کے پیلے چہرے پر
پھولوں کی سی لالی ہوگی	نورس کلیوں کے مکھڑوں پر
سندرتا کی کرنیں ہوں گی	چھا چھا ناچ اٹھے گا
ڈالی ڈالی جھوم اٹھے گی	جھومتی گاتی کالی گھٹائیں
مدھ کا پیالہ چھلکائیں گی	دھیرے دھیرے مسکائیں گی
ان کی مسکانوں سے ہم تک	کچھ سندر کرنیں آئیں گی
ایسے چمکتے جیون سے پھر	ایک نیا سنسار بنے گا

نئے سال کی آمد اور عید کے موقع پر قیصر شمیم کی کہی گئی موضوعاتی نظموں کے خوبصورت مصرعے فعالیت' بے قراری اور معنویت کی دلیل بن گئی ہیں۔ "سمندر بے کراں ہے"؛ "یہ سرد شب ہے"؛ "دعا مانگو"؛ "پھاگن کی ایک نظم"؛ "فن کی انفرادیت اور درد آگیں لہجے کی مثالیں ہیں۔" تنہائی"؛ "مراقم" اور "ہمارے اپنے لہو کا حصہ" ایسی نظمیں ہیں جو قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہیں اور ان کے دکھ درد کی شریک بھی بنتی ہیں۔

نظم "تنہائی" اپنے اندر کرب کی لطیف آنچ اور دلکش انداز رکھتی ہے جس میں زمانے کی شدت بھی ہے اور معاشرتی عوامل کے احساسات بھی۔ اس نظم کے ہر مصرعے سماج اور معاشرے کے رشتے کو استوار کرتے

www.taemeernews.com

ہوئے ہر خاص و عام کو تنہائی سے جدو جہد کرنے کا سلیقہ اور ہنر بتاتے ہیں :

"رشک آتا ہے مجھے ان دوستوں پر
بھیڑ میں رہتے ہوئے جو بھیڑ کا حصہ کبھی بنتے نہیں ہیں
اور اپنے جذبۂ بے گانگی کو
خوبصورت نام 'تنہائی' کا دے کر
اک طلسماتی فضا میں اس طرح اب جی رہے ہیں
جیسے یکتائی کا درجہ
ان کی تنہائی نے ان کو دے دیا ہو
کیا غضب کی بیانا ہے............

(نظم "تنہائی" کے چند مصرعے)

"میرا شہری دوست"، "مراغم" میں شہر کے شاطر دوستوں کی بدنیتی، نیک نفسی اور زندگی کی مثبت قدروں کا ذکر ملتا ہے جب کہ "درد آنسو مسکان" آرزو کی طرح داری، کھلی فضا کے تبسم، اجتماعی زندگی اور مذہب و قوم کے درد و خوشی کے محرک ہیں۔ درد ہندو، مسلم، گورا، کالا دیکھ کر نہیں اٹھتا، آنسو دیش و بھاشا نہیں دیکھتے، مسکان رنگ و روپ کی کیفیت نہیں پوچھتی لیکن انسان، ان کی حقیقت کی بازیافت نہیں کر سکتا ہے :

سب کے لیے ہیں جگ میں تینوں - درد، آنسو، مسکان
کاش یہی اک بات سمجھ لیں آج کے ہم انسان!

قیصر شمیم کی نظموں میں جذبات و روایات کے حسین امتزاج، تخیل کی گہرائی، زبان و بیان کی گیرائی، زندگی کی تلخیاں اور عہد حاضر کی بے راہ روی موجود ہے جو انسان کے ذہنی و قتی ردعمل اور زندگی کی ٹیس کا احاطہ کرتی ہیں۔

ہندوستانی زندگی کے رکھ رکھاؤ "گیت" میں ابھرتے ہیں۔ گیت ماضی کے ماحول سے آشنا اور حال کی کیفیات کا استعارہ ہے۔ ارضیت کے حسین نمونے گیت میں موجود ہیں (اگر چہ اس البیلی صنفِ سخن سے ہمارے شعرا دور رہنا چاہتے ہیں)۔ قیصر شمیم خوبصورت گیت کے بھی شاعر ہیں اور ان کے گیت کی کوکھ سے خوف، فنا، درد، خوشی اور اداسی کی کیفیات جنم لیتی ہیں، جن کے اندر کرب کی دھیمی آنچ بھی ہے اور تہذیب و روایت کے یقین بھی۔ جن میں سچائی کی جلوہ گری بھی ہے اور پُر فریب ماحول کی کشاکش بھی۔ ایک گیت کے چند بند ملاحظہ کریں :

رو رو کر اک عمر گنوائی ' آج مجھے کچھ گانے دو

www.taemeernews.com

اپنے بے کل' پاگل من کو گیتوں سے بہلانے دو

آج مجھے کچھ گانے دو

جیون کے دکھ سکھ کی کہانی کہتے کہتے جگ بیتے

آنکھوں کے جھرنوں کے پانی بہتے بہتے جگ بیتے

' بہتے پانی کی دھارا کو آج ذرا رک جانے دو

آج مجھے کچھ گانے دو

اپنے بھولے بسرے سپنے' آج مجھے یاد آتے ہیں

میرے کومل ہردے کو پھر تڑپاتے' برماتے ہیں

ان بھولے بسرے سپنوں کو اور مجھے تڑپانے دو

آج مجھے کچھ گانے دو

قیصر شمیم کی ذات ارضِ بنگالہ کی آبرو ہے جو کئی دہائیوں سے علم و ادب کے چراغوں کو روشن کرتی آرہی ہے۔ موصوف اپنی نظموں میں مثبت و منفی افکار و خیالات تواتر کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور شاعری کے لیے تلاش کرتے ہیں بلکہ تعمیر بھی۔

غزل

قیصر شمیم

تنہائیوں کا میری صلہ دے گئی مجھے
تم مل گئے تو عید مزا دے گئی مجھے

وقتِ مصافحہ ترے ہاتھوں کی نرم آنچ
سلگے ہوئے بدن کا پتا دے گئی مجھے

سینے سے آ لگا جو ترے شیشے کا بدن
یہ نازکی بھی ایک نشہ دے گئی مجھے

آنچل سنبھالنے میں تھی جو شوخیِ ادا
کیا کیا سراغِ بندِ قبا دے گئی مجھے

آنکھیں تھیں بند' ہونٹ کھلے' بال منتشر
غفلت کی تیری نیند سزا دے گئی مجھے

آئی تھی کل کہیں سے جو بہکی ہوئی ہوا
گزری جب اس طرف سے' صدا دے گئی مجھے

آئی جو ایک ساعتِ امید شعلگی
میں راکھ ہوا چلا تھا' ہوا دے گئی مجھے

قیصرؔ میں ساحلوں کی طرف دیکھتا نہیں
کیسا شعورِ موجِ بلا دے گئی مجھے

www.taemeernews.com

ڈاکٹر ناصر علی انصاری
کلکتہ

گیت کا تصور اور قیصر شمیم

گیت مزاجاً نسوانیت کے غنائی اظہار کی ایک صورت ہے۔ ثقافتی لحاظ سے اس کا نہایت گہرا تعلق زمین سے ہے اور زمین عورت سے مشابہ ہے۔ وہ عورت کی طرح "روح" کو ایک ارضی جسم عطا کرتی ہے اور زندگی کی بقا اس کا عظیم ترین مقصد ہے۔ مگر اس مقصد کی تکمیل کے لیے خود زمین کو آسمان کی ضرورت ہے۔ آسمان سے نہ صرف وہ برکھا ہوتی ہے جس پر زمین کی روئیدگی کا دارومدار ہے بلکہ وہ روشنی بھی جسے اپنے اندر جذب کر کے وہ گویا تخلیق کے عمل میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ مزاجاً زمین متلون اور تغیر پذیر ہے اور ہر نئے موسم سے ایک نیا لباس مستعار لیتی ہے۔ دوسری طرف آسمان خود کو روشنی کے تحریک سے ظاہر کرتا ہے۔ جب آسمان اور زمین ملتے ہیں اور روشنی کا تحرک خود کو زمین میں جذب کر دیتا ہے تو اس کے نتیجے میں زمین زرخیز ہو جاتی ہے۔ یوں دیکھیں تو رات زمین کے ایک حصے کے لیے فراق اور مفارقت کا وقفہ ہے جب کہ دن وصال اور ملن کی ایک صورت ہے۔ زمین کی متلون مزاجی کی سب سے بڑی علامت رگ وید کی دیوی اریتانی ہے جو سدا ایک سی حالت میں نظر نہیں آتی۔ خود عورت نے تنوع، رنگینی اور تلون کی صفات براہِ راست زمین سے حاصل کی ہیں۔ پھر جس طرح زمین آسمان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس کا مظہر پھول اپنے رنگ اور خوشبو کی مدد سے تتلیوں اور بھونروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے ویسے ہی عورت بھی بناؤ سنگھار سے مرد (آسمان) کو اپنی طرف مائل کرتی رہتی ہے۔ عورت نے مرد کو ملتفت کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے اسے عورت کے "جادو" کا نام دیا گیا ہے۔ جادو سے مراد ہی یہ ہے کہ کوئی ایسی کیفیت وجود میں آ گئی ہے جس نے فریقِ ثانی کی تمام مدافعتی قوتوں کو سلب کر لیا ہے۔

اس جادو کو زیادہ فعال بنانے کے لیے عورت نے مرد کی تمام حسیات کو متاثر کیا ہے۔ مثلاً بھڑکیلے رنگوں اور تیز خوشبوؤں کے استعمال سے اس نے مرد کی باصرہ اور شامہ کو تسکین پہنچائی ہے اور اپنی آواز کی لوچ سے اس کی سامعت کو۔ گیت میں عورت کے اسی جادو کا پرتو ملتا ہے۔ گویا گیت میں عورت کی ساری نسوانیت سمٹ کر یکجا ہو گئی ہے۔ اس کا حسن، جسم کا لوچ، پتلی کمر، گہری ناف، ابھرے ہوئے سینے یہ تمام پہلو گیت میں مجتمع ہو گئے ہیں۔

www.taemeernews.com

تاہم یہ بات قابلِ غور ہے کہ گیت میں سامعہ کا پہلو زیادہ اجاگر ہوا ہے اور یہ اس لیے کہ گیت میں لے، تھاپ اور جھنکار کا براہ راست تعلق سماعت سے ہے۔ نمودِ حیات کے بارے میں بھی یہی قیاس کہ پہلے روشنی نمودار ہوئی جس کے لیے بصارت کو متحرک کیا گیا، اس قدر قرین قیاس نہیں جتنا یہ خیال کہ پہلے موسیقی وجود میں آئی جسے گرفت میں لینے کے لیے سب سے پہلے سامعہ کو متحرک کیا گیا۔ چوں کہ ہندو علم الاصنام میں برہما کی محبوبہ سرسوتی نغماتی زیروبم کی مدد سے کائنات کی تخلیق کرتی ہے۔ اس خیال کی سچائی کا ثبوت انسانی زندگی میں بھی ملتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے سامعہ متحرک ہوتی ہے اور وہ دیکھنے اور پہچاننے سے بہت پہلے سننے کی کوشش کرتا ہے۔ خود جنگل آوازوں کا مسکن ہے اور جنگل یا زمین سے وابستہ تہذیب "سامعہ" کے مدارج سے گزر رہی ہوتی ہے۔ جب یہ تہذیب جنگل سے نکل کر کھلی فضا میں آتی ہے تو اس کی بصارت تیز تر ہو جاتی ہے۔ گیت زمین اور جنگل کی پیداوار ہے اس لیے یہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سامعہ کو متحرک کرتا ہے۔ اسی لیے گیت مزاجاً موسیقی سے ہم آہنگ ہے۔ رقص اس کا ایک اضافی پہلو ہے اور یہ عورت کی مرد کے لیے والہانہ محبت کا اظہار ہے۔

بنیادی طور پر گیت میں مرد مخاطب اور معشوق ہے اور عورت ایک عاشق زار ہے۔ پھر چوں کہ گیت عورت کی طرف سے اظہارِ محبت کی ایک صورت ہے اس لیے اس میں سوچ اور تحرک کا تسلسل نسبتاً بہت کم ہے۔ اس کی جگہ ایک والہانہ جذبے نے لے لی ہے۔ فی الواقع گیت عورت کے جسم کی پکار ہے اور اسی لیے اس میں نہ صرف جذبات کی فراوانی ہے بلکہ یہ کسی مثالی یا تخلیقی محبوب کی بجائے ایک گوشت پوست کے بت کو اپنی نگاہ کا مرکز بناتا ہے۔ مبادا کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ گیت عورت کے جسم کا اظہار نہیں بلکہ اس کی پکار ہے اور پکار اس وقت وجود میں آتی ہے جب باہر سے جسم کو کوئی چرکا لگتا ہے۔ ایک ایسے ٹھہرے ہوئے معاشرے میں جس پر جنگل کی فضا پوری طرح مسلط ہو فنونِ لطیفہ کی نمو ممکن ہی نہیں۔ فنونِ لطیفہ صرف اس وقت وجود میں آتے ہیں جب باہر سے کوئی عنصر اس معاشرے میں داخل ہوگا اور اسے روح عطا کر دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی عورت جنگل کے ایک خودرو پودے کی طرح اس پکار سے ناآشنا ہوتی ہے جو گیت کی جان ہوتی ہے۔ پھر کیا یک دور دیس سے کوئی مسافر آتا ہے۔ کورا برتن بج اٹھتا ہے۔ پودے کو ایک زخم سا لگتا ہے اور دل میں جذبہ متحرک ہو جاتا ہے۔ بنیادی طور پر گیت اس محبت کا اظہار ہے جو مسافر کو دیکھتے ہی عورت کے دل میں پیدا ہوئی اور جو مسافر کے چلے جانے کے بعد ایک آتشِ پنہاں کی صورت اختیار کر گئی۔ گیت کا اصل مزاج فراق اور مفارقت کی اسی آگ سے مرتب ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ گیت کا وجود کسی بھی صنفِ سخن سے بہت پہلے کی چیز ہے۔ اس نظریے سے قیصر شمیم نے اپنے گیت میں تصوریت اور مثالیت کو بھی پیش کیا ہے اور ان راستوں سے ہٹ کر

www.taemeernews.com

ایک ایسی راہ نکالی ہے جو مادیت کے شعور سے ارضی حقیقتوں کی جانب جاتی ہے۔ "جیون گیت" ملاحظہ فرمائیں:

میں ایسے راگ اٹھاؤں، کچھ پھول کھلیں ہر بن میں
میں ایسی تان لگاؤں، اک لہر ہر اٹھے من میں
میں ایسے بول سناؤں، مل آئے زبل تن میں
میں ایسے بھاؤ بتاؤں، سب بھید بھاؤ ڈھہ جائیں
میں ایسے ساز بجاؤں، مٹ جائیں سب شنکائیں
میں ایسے گت پر گاؤں، خود ناچ اٹھیں آشائیں
میں گاؤں تو گیتوں سے چھٹ جائے گھور اندھیرا
میں گاؤں تو گیتوں سے ہو سارا جگ اجیارا
میں گاؤں تو گیتوں سے دکھ بھولے ہر دکھیارا
وہ بانی ہو گیتوں میں، پتھر کا کلیجہ دھڑکے
جب برف گرے اُپون پر، ہر پھول میں شعلہ بھڑکے
جب ظلم اٹھائے سر تو، اوپر سے بجلی کڑکے
میں گاؤں تو اک بچے سے سرپاپی سمہ کا کھوے
میں گاؤں تو خوش ہو کر، دل کل دھرتی کا جھومے
میں گاؤں تو ماں اپنی سنتان کا ماتھا چومے
میں گاؤں، تم بھی گاؤ، یہ ساری دھرتی گائے
میں گاؤں، تم بھی گاؤ، یہ دنیا پربت بڑھائے
میں گاؤں، تم بھی گاؤ، یہ جیون بڑھتا جائے

قیصر شمیم کے گیت کا ایک سرا انقلاب سے ملتا ہے تو دوسرا خود اعتمادی سے۔ خودداری، محبت اور رومان کی دھیمی آنچ میں پرورش پاتا ہے جو بہت کچھ انفرادی ہوتے ہوئے بھی سینکڑوں نوجوان دلوں کی امنگوں اور آرزوؤں سے بنا ہے۔ جس پر وقت اور تاریخ کا عکس مستزاد ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس میں شرکت کے لیے فکروفن کی ان چہاردیواریوں کو عبور کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی جو مسائلِ حیات کے عام کارناموں سے الگ تھیں یا جن کے لیے کسی مابعد الطبیعاتی فلسفے اور ذہن کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ تجربہ ایک طرف تو نوجوانوں کے

www.taemeernews.com

منتشر اور بے چین ذہن کو فکر و عمل کے دائرے اور امکانات فراہم کرتا ہے اور دوسری جانب ہندستان کی تقدیر بدلنے کے لیے راہِ عمل دکھاتا ہے۔ مستقبل ایک بہتر اور متناسب دنیا پیش کرے گا۔ انسان اس زندگی کا متلاشی ہے جو متجلی اور منور ہے۔ شاعر و ادیب کی یہ مستقبلیت کتنی ہی خیالی کیوں نہ ہو مگر بغیر اس امید افزا تصور کے انسان کی عملی قوتوں کو حرکت میں لانا ممکن نہیں۔ بغیر کسی امید اور سہارے کے زندگی کا قیام مشکل ہو جاتا ہے۔ ماہیت کے امکانات اور روحِ عصری کی کارفرمائیوں سے بے خبر اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ کیا وہ خیالی خاکہ جو ماضی میں بنایا گیا تھا اس میں رنگ بھرا جا سکا؟ کیا اس دور کے انسانوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ شرمندۂ تعبیر ہو سکے؟ عام نظر میں ہو سکتا ہے کہ وہ سب خیالات عملی جامہ نہ پہن سکے ہوں لیکن امید اور بہتر مستقبل کی انھی عالمی نظریات نے فاشسٹ (Fasist) قوتوں کا قلع قمع کر دیا۔ آج نازیت دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ قیصر شمیم نے جس امید افزا زمانے کا تصور پیش کیا ہے، وہ آئے یا نہ آئے مگر ہندستان نے ۱۹۴۷ء میں آزادی کا وہ خواب پورا کر ہی لیا جس کا تصور انیسویں صدی کے ایسے پُر امید اور حرکت پر یقین رکھنے والے سماج نے کیا تھا اور متحدہ قوتوں کے اثرات نے بہت سے مسائل حل کر ہی لیے جن کے لیے آزادی کی جنگ لڑی گئی تھی۔ شاعری امید اور آرزوؤں کی ہوائیں روحِ عصر کے ساتھ ایسے رخ اور اپنے محور بدلتی رہتی ہیں۔ یہ کوریا، ویت نام اور روڈیشیا کے حالات بدلنے کے لیے بھی ہو سکتی ہیں اور ہندستان میں ایک معاشی اور ذہنی انقلاب لانے کے لیے بھی۔ یہ امیدیں اور آرزوئیں بہتر سے بہتر سماج پیدا کرنے لیے زمین تیار کرتی رہتی ہیں اور ان کا کام تاریخ کے کسی موڑ پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نئی آزمائشوں میں ڈوب کر نئے امکانات تلاش کرتے رہنا ان کا مقصد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ امیدیں روحِ عصر کو ہمیشہ باقی رکھتی ہیں کیوں کہ امیدوں اور آرزوؤں کا بھی کوئی اختیار نہیں۔ ماضی اور تاریخی واقعات کے اوراق کو پلٹ دینے کے باوجود اپنی روح کے لیے ہر دور میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی اس روح کو اپنی گرفت میں لے نہیں سکتا تو وہ ماضی کو سمجھ سکتا ہے اور نہ حال کے راز اس پر منکشف ہو سکتے ہیں خواہ وہ اپنے عہد کا نوٹن بی اور این سیگر ہی کیوں نہ ہو۔ ادب کی تاریخ میں بھی ماضی کی انھی ادبی روایتوں کی شکل میں زندہ رہتی ہے۔ ''جیون پتھ'' کے مسائل اپنی ظاہری شکل میں آج نہ سہی لیکن جب بھی انسان اپنے دور کے نامساعد حالات، آزمائشوں اور کسی نئے انقلاب سے پیشتر کی صورتوں میں گھرے ہوں گے، قیصر شمیم کی آواز ان کا سہارا بنے گی اور ان کو عمل اور امید کے نئے راستے دکھا کر انھیں شکست خوردگی سے بچانے میں مددگار ثابت ہوگی۔ گیت ''جیون پتھ پر'' ملاحظہ فرمائیں:

اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے

www.taemeernews.com

گھور اندھیرے جیون پتھ پر
ننھی منی آشاؤں کے
جلتے بجھتے دیپ لیے میں
جانے کب سے بھٹک رہا ہوں

اپنے پرائے سنگی ساتھی
اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے
گھور اندھیرے جیون پتھ پر
اک اک کرکے بچھڑ گئے ہیں

آج اکیلے اندھیارے میں
ننھی منی آشاؤں کے
جلتے بجھتے دیپ لیے میں
اپنی منزل ڈھونڈ رہا ہوں!

گیت کے یہ ٹکڑے نقیب، حبیب اور رہبر کا کام کرتے ہیں جن میں ماضی کی ادبی روایت، روحِ عصر اور غرض سب کچھ موجود ہے۔

قیصر شمیم کی شاعری نے جن راستوں سے ارتقا کی منزلیں طے کی تھیں ان کا تقاضا یہی تھا کہ ان کی جہد و تلاش میں بیرونی کشمکش اور خارجی حالات کا اثر ان کی رومانی اور انقلابی دونوں طرح کی شاعری میں موجود ہے۔

قیصر شمیم کے یہاں خود سے الجھنے کی کیفیت اور اندرونی گھٹن نہیں ملتی کیوں کہ اندرونی گھٹن اور نفس کشی ایک Neurosis کی صورت اختیار کرکے فن کار کو مختلف پرتوں اور تہوں میں چھپا دیتی ہیں۔ اندرونی تلاش فن کار کو مجہول قسم کی تخیل پرستی کی سمت لے جاتی ہے جہاں علاحدگی کے ساتھ ساتھ انسانوں کی دنیا سے ہزاروں میل کا فاصلہ ہو جاتا ہے۔ جہاں نہ ماحول اور سوسائٹی کی اس سطح کا پتہ چلتا ہے جس سے زمانہ گزر رہا ہے اور نہ اس دور کی ذہنی کیفیات کا انعکاس نظر آتا ہے بلکہ بیرونی حالات سے گھبرا کر خود کو برجِ عاج میں محصور کر لینے والی مجہولیت اور دوربینی ملتی ہے۔ کشمکش کی اس منزل سے گزرنے میں شاعر اور ادیب بھٹک جاتے ہیں اور مصائب و مسائل

www.taemeernews.com

حیات سے گھبرا کر خود کو تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ بھری بھری دنیا انھیں ویرانوں سے زیادہ بیزار کن معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس دنیا میں بسنے والے، ان کی تہذیب، ان کے اخلاق و عادات، ان کی گہما گہمی سب محض ایک سایہ نظر آتے ہیں۔ تنہائی کا یہ بے پناہ احساس ادیب کو زندگی کے صالح اصولوں تک سے برگشتہ کر دیتا ہے اور ان میں خارجی حالات سے لڑ کر اپنا راستہ پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادیب شخصی فکر اور فرد پرستی کے راستوں سے عام انسانی سماج اور زندگی کے مختلف الالوان دھارے سے کٹ کر زندگی کے مسائل سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی سماجی سوجھ بوجھ صرف اسی کی ذات میں اسیر ہو جاتی ہے اور پھر اسی راستے ادیب یا شاعر فرار کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا عقیدہ صرف اپنی محدود اور جذباتی یاد آفریں Emotional Responses اور Day Dreaming تک محدود ہو جاتا ہے۔ قیصر شمیم اس عقیدے کے شاعر نہیں۔ ان کے خالص عشق کی دنیا بھی جمالیاتی تجربوں کے ساتھ کسی ابدی مسرت کی تلاش میں زندگی کے حقیقی تجربوں کے ساتھ وابستہ رہی ہے جن میں سماجی حالات اور امکانات کی اہمیت واضح ہے۔ انھیں تجربوں سے "چھوا ہے"، "ہائے یہ آگ بجھائے کون"، "کب تک نیر بہائے کوئی" جیسے کئی گیتوں کی تکمیل ہوئی ہے جن میں وہ کلاسیکیت بھی شامل ہے جو قدیم شاعری کی میراث ہے اور وہ رومانیت بھی جو شاعر کے اپنے تخیل کی رَو نے پیدا کی ہے۔ قیصر شمیم کے ایسے تجربوں میں سے ایک گیت ملاحظہ فرمایئے :

کیسے عید مناؤں ساجن
کیسے عید مناؤں

ساتھ تمھارا چھوٹ گیا ہے
بن کے قسمت بگڑ گئی ہے
جیون مجھ سے روٹھ گیا ہے
میری دنیا اجڑ گئی ہے
اب روؤں یا گاؤں ساجن
کیسے عید مناؤں ؟

مست خوشی سے سارا جہاں ہے
سب کے چہرے دمک رہے ہیں

www.taemeernews.com

لیکن میری عید کہاں ہے ؟

میرے نیناں چھلک رہے ہیں

ان کو کیا سمجھاؤں ساجن

کیسے عید مناؤں

تم بن کیسی سدھ بدھ من کی

ہردے تم کو ڈھونڈ رہا ہے

عید کہاں ہے مجھ برہن کی

میرا چاند کہاں نکلا ہے

چاند کہاں سے لاؤں ساجن

کیسے عید مناؤں

اس گیت میں قیصر شمیم کی فکر ونظر، مشق، ذاتی تجربے، خارجی اثرات، فن کا انوکھا برتاؤ اور نئے تجربوں کو دیکھا جاسکتا ہے جن میں نہ تو وہ عصری کشمکش اور مسائل کے بہاؤ سے الگ ہوتے ہیں اور نہ ان کی آواز وقت کے Chorus میں اس طرح مدغم ہو جاتی ہے کہ پہچانی نہ جاسکے ساتھ ہی ساتھ اشعار اور مصرعے، جمالیات کی نرمی اور حسن کی کیفیت سامانیوں کا حسین مظاہرہ کرتے ہیں۔

جمالیات اور حسن کی تلاش تہذیب یافتہ انسان کی ایسی تلاش ہے جو اس نے اکتسابی طور پر اپنی نسلوں اور اپنے سے پہلے گزرے ہوئے سماج سے حاصل کی ہے۔ ادب اور فن کے لیے بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ جمالیات اور حسن کا تعلق صرف وجدان سے نہیں اور نہ یہ جذبہ وہی ہے جس کے لیے اکتساب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جمالیاتی نظریوں میں اسی وجہ سے عہد تغیر اور تبدیلی بھی ہوتی رہی ہے۔ کبھی خیال جمالیات کا محرک تھا، کبھی الفاظ معنی، حسن صورت، ترنم وموسیقی سے احساسِ جمال کی اہمیت اور گہرائیوں کو پرکھا اور کبھی ایک والہانہ جذبہ ہی جمالیات کی دنیا کے لیے سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔ ہر دور میں جمالیات کے نظریے اس دور کی نفسیات، سماجی کیفیات اور آئیڈیالوجی کے تحت بنتے اور بدلتے رہتے ہیں۔

جمالیاتی حظ، اگر صرف حسن وصورت اور الفاظ کی نغمگی ہی سے حاصل ہو سکتا تو خوبصورت اور مترنم الفاظ کے مجموعے کا ترتیب دے لینا ہی کسی شاعر کو سب سے بڑا جمالیاتی شاعر بنا دیتا لیکن ایسا نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہی ہے کہ یہ حظ ان صورتوں میں پوشیدہ ہے۔

www.taemeernews.com

مشتاق انجم

قیصر شمیم کے نثری فن پارے

یہ سچ ہے کہ قیصر شمیم بے لوث خدمت اور بے غرض ایثار کے پیکر ہیں' قابل قدر شاعر اور بہترین نثر نگار ہیں اور ان سے اکتساب فیض کرنے والے باصلاحیت اور باشعور شعرا و ادبا کی ایک کھیپ تیار ہوگئی ہے جسے ملک و بیرون ملک میں قبولیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ____ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دوسروں کو فیض پہنچانے میں انھیں ذاتی طور پر جس قدر نقصان اٹھانا پڑتا ہے' اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آج وہ اپنی عمر کے سترویں سال میں قدم رکھ چکے ہیں اور تا حال ان کے نثری فن پاروں پر مشتمل ایک بھی کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہو پائی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دوران بزرگوں کے اصرار اور دوستوں کی فرمائش کے سبب ان کے مندرجہ ذیل مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے ہیں :

(۱)	ساعتوں کا سمندر	بخط اردو اور دیوناگری	
(۲)	تری دھارا	بخط دیوناگری	
(۳)	سانس کی دھار	بخط اردو	
(۴)	پہاڑ کاٹتے ہوئے	بخط اردو	۱۹۹۸ء

بہر کیف حالات اور اسباب کی جستجو سے قطع نظر قابل غور بات یہ ہے کہ اب تک اس سلسلے کی ان کی جتنی تحریریں ادبی رسائل و جرائد کے ذریعہ اور مختلف شعرا و ادبا کی کتابوں میں شامل ان کے مضامین اور آرا کی شکل میں ہم تک پہنچی ہیں' وہ ہمیں کس قدر متاثر کرتی ہیں۔

سہولت بیان کے لیے قیصر شمیم کے نثر پاروں کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

(۱) افسانے (۲) تراجم (۳) مضامین (۴) تبصرے (۵) مختلف کتابوں کے فلیپ پر شائع ہونے والی ان کی گراں قدر آرا (۶) "دھنک اور کرن" اور متعدد درسی کتابوں کی ترتیب و تدوین۔

افسانے :- قیصر شمیم کی ادبی زندگی کی ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی لیکن شہرت بحیثیت شاعر نصیب ہوئی۔ ادبی

www.taemeernews.com

زندگی کے آغاز میں وہ عمید انکسی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ان کا پہلا افسانہ " وہ لڑکی" دہلی کے ہفتہ وار" پارس" میں ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ ماہنامہ " پگڈنڈی" (امرتسر) اور ماہنامہ " نکہت" (الہ آباد) میں بھی ان کے افسانے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں جب انھوں نے اپنا نام قیصر شمیم رکھ لیا' تو اس نام سے ان کا مشہور افسانہ " میر" ماہنامہ " صبح نو" (پٹنہ) میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ اس قدر مقبول ہوا کہ پروفیسر نیاز احمد خان نے اسے اپنے سہ ماہی رسالے " چراغ راہ" میں بھی شائع کیا۔قیصر شمیم کے صرف چند ابتدائی افسانے رومانی نوعیت کے تھے لیکن بعد میں انھوں نے جتنے افسانے لکھے' وہ سب کسی نہ کسی معاشرتی یا نفسیاتی موضوع سے تعلق رکھتے تھے۔اگرچہ ان کا ذہنی میلان ترقی پسندی کی جانب رہا لیکن خواہ مخواہ کسی نظریے کو اپنے اوپر تھوپنا انھوں نے گوارا نہیں کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قیصر شمیم نے اس دور میں اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع نہیں کیا لیکن اپنے مرحوم دوست اور ترقی پسند افسانہ نگار شمس صابری کے افسانے یکجا کیے اور ۱۹۷۳ء میں انھیں کتابی شکل دے کر " دھند اور کرن" کے نام سے شائع کیا۔حق دوستی ادا کرنے کا یہ احسن جذبہ آج کے دور میں بذات خود" افسانہ" لگتا ہے۔

تراجم :-قیصر شمیم کو ترجمہ نگاری کا بھی شوق رہا ہے۔وہ انگریزی' ہندی اور بنگلہ کی تخلیقات کو بہ آسانی اردو کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔بعض اوقات مندرجہ بالا زبانوں میں شائع ہونے والی شعری تخلیقات کا منظوم ترجمہ اس خوبی سے کر جاتے ہیں کہ کہیں نقل پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے اور کہیں ترجمے کا ذائقہ بھی ملتا ہے۔ انھوں نے منوج مترا کے بعض بنگلہ ڈراموں کا انتہائی عمدہ ترجمہ کیا جن کا کتابی شکل میں شائع ہو جانا یقیناً فال نیک ہوگا۔قیصر شمیم کی ترجمہ نگاری کے سلسلے میں معروف ادیب اور صحافی احسن مفتاحی اپنے ایک مضمون بعنوان" الحاج قیصر شمیم" میں فرماتے ہیں :

> " قیصر شمیم کو انگریزی' ہندی اور بنگلہ زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ ترجمہ بہت اچھا کرتے ہیں۔ایک مدت تک ا . رات میں خبروں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں مغربی بنگال میں متحدہ محاذ کی غیر کانگریسی حکومت قائم ہوئی تو حکومت کو بدنام کرنے کے لیے شرپسندوں نے صنعتی علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کرائے اور کرانے کی کوشش کی۔تلنی پاڑہ میں بہت خوفناک فساد ہوا۔رشڑا میں فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلائی گئی اور ہندی میں ایک پمفلٹ " بستر گول" کے نام سے تقسیم کیا گیا۔رشڑا میونسپلٹی کے اس وقت کے چیئرمین کامریڈ بسوا گوپال سین نے اس پمفلٹ کا سختی سے نوٹس لیا اور مجھ سے کہا کہ اس کا انگریزی

www.taemeernews.com

میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ میں وہ پمفلٹ لے کر قیصر شمیم کے یہاں جا پہنچا۔ قیصر شمیم صاحب نے انگریزی میں اس کا اتنا اچھا ترجمہ کیا کہ کامریڈ بسوا گوپال سین بہت خوش ہوئے جو خود بھی اچھی انگریزی جانتے تھے۔"

سہ ماہی "مژگاں" جولائی تا دسمبر ۲۰۰۴ء ص ۱۹۱

احسن مفتاحی کی مندرجہ بالا رائے سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ قیصر شمیم انگریزی، ہندی اور بنگلہ سے اردو ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہندی سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مضامین :- کسی مضمون کا اولین پیراگراف دراصل ایک ایسا دروازہ ہوتا ہے جس سے گزر کر قاری اصل موضوع تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ دروازہ خوبصورت ہو اور اس سے گزرتے ہوئے اگر قاری فرحت محسوس کرے تو اس کے ذہن میں تجسس کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور مضمون کے موضوع و متن سے اس کا رشتہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ قیصر شمیم کے مضامین کے دیگر اوصاف پر گفتگو کرنے سے قبل اس بات کی نشان دہی ضروری ہے کہ ان کے مضامین کے تمہیدی پیراگراف اپنی خوبصورتی اور کشش سے قاری کو پہلی نظر میں اس درجہ اپنی طرف مائل کرتے ہیں کہ وہ واسطہ متن سے اپنا رشتہ از خود جوڑ لیتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مضمون کے اختتام کے بعد بھی یہ رشتہ قائم و دائم رہتا ہے۔ یہاں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں :

"ایک شخصیت اور سیکڑوں یادیں! کس کس کو صفحۂ قرطاس پر اتاروں اور کس کس کو ہمیشہ کی طرح دل پر نقش رہنے دوں۔ ذہن میں ان یادوں کے جلو میں نہ جانے کتنی روشن اور نیم روشن تصویریں اپنے ساتھ لیے۔ ایامِ گذشتہ کی بھولی بسری راہوں پر بھاگا جاتا ہے اور میں ہوں کہ پوری طاقت سے اس کا تعاقب کیے جاتا ہوں۔ اچانک کوئی خیال یہ کہہ کر روکنا چاہتا ہے کہ یہ تعاقب لاحاصل ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحے کوئی امید یہ کہہ کر حوصلہ بڑھاتی ہے کہ کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ بالآخر تعاقب اس حد تک ضرور کامیاب ہوتا ہے کہ میرا بھاگتا ہوا ذہن پلٹ کر کچھ تصویریں میری طرف پھینک دیتا ہے۔"

"ایام گذشتہ کی چند تصویریں"

شیریں بیاں مفسر قرآن – مولانا حکیم محمد زماں حسینیؒ – ص : ۴۳

اسی طرح حاجی گورکھ پوری کے سلسلے میں قیصر شمیم کے ایک مضمون کے ابتدائی حصے ملاحظہ فرمائیں :

www.taemeernews.com

"اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ حسن، زندگی اور شاعری کے تعلق سے

حامی گورکھ پوری کی طرزِ فکر کیا ہے تو اس کا مختصر ترین جواب انھیں کے شعر سے دوں گا :

مجھ کو جوڑے میں کیا سجاؤ گے   سرخ شعلہ ہوں میں گلاب نہیں

عصری زندگی کے پیچ در پیچ مسائل میں الجھ کر وہ دنیائے حسن وعشق

سے وقتی گریز کی بات نہیں کرتے اور نہ فیض احمد فیض کی طرح اپنے محبوب کو یہ مشورہ

دیتے ہیں کہ :

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

حامی اس بات کے بھی آرزومند نہیں کہ مجاز لکھنوی کے محبوب کی

طرح ان کا محبوب کارزارِ حیات میں ان کے شانہ بشانہ رہے اور اپنے آنچل کو پرچم

بنالے۔ حامی تو اپنے محبوب کو صرف اس حقیقت سے آشنا کرنا چاہتے ہیں کہ انھوں

نے جس دور میں آنکھ کھولی ہے، جس معاشرے میں وہ سانس لے رہے ہیں ظلم و

جور کے جس نظام سے انھیں بار بار ٹکرانا پڑتا ہے ان سب نے ان کی زندگی اور ان

کے محبوب کے درمیان ایک بعد ہی پیدا نہیں کیا بلکہ انھیں ایک سرخ شعلے میں تبدیل

بھی کر دیا ہے جو کسی صورت میں محبوب کے جوڑے کا گلاب نہیں بن سکتا۔"

(سرخ شعلے کی روشنی، شاخِ زیتون ص ۱۰)

قیصر شمیم کے مضامین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ موضوع سے انصاف کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتے ہیں اور ایسا کرتے وقت وہ زیادہ تر مثبت پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی شیریں بیانی کا یہ عالم ہے کہ ذرا سخت بات بھی کہتے ہیں تو اس انداز سے کہ قاری اس کے لطف میں کھو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی کے عیب کو عجلت پسندی کا سبب یا پروف کی غلطی پر محمول کر کے گزر جاتے ہیں۔ ان کے مضامین یا قوارشد اور ان کی شاعری، سرمایۂ سخنوراں پر ایک نظر، عزیز غواصی - ماورائیت سے ارضیت تک، غواص صاحب کے تعلق سے چند باتیں اور ناشر بلیاوی کی شاعری وغیرہ کے مطالعے سے قیصر شمیم کے مخصوص اندازِ بیان کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی قیصر شمیم کے مضامین کا سنجیدہ مطالعہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فاضل مضمون نگار کے دل میں ایک افسانہ نگار چھپا بیٹھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مضامین میں اکثر کردار نگاری، ماجرا سازی، حالات کی عکاسی اور کہیں مکالماتی انداز بیان نظر آتا ہے۔ بعض اوقات مضمون کے اختتام پر کسی خوبصورت

www.taemeernews.com

افسانے کا اختتام ہوتا ہے۔ "شکیل نبی نگری اور ان کی شاعری" کے عنوان سے رقم کیے ہوئے ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

"شکیل صاحب حلیے سے بھی شاعر نظر آتے ہیں۔ قمیص پاجامہ ان کا مخصوص لباس تھا۔ اکثر اوقات پاجامے کا ایک پائینچہ اوپر کی طرف کھنچا ہوا رہتا تھا۔ دراز قد، گندمی رنگ، گول چہرہ، کلے میں پان، ہونٹوں پر پان کی لالی، آنکھوں میں چمک، بال خشک اور بکھرے ہوئے۔ داڑھی تو باقاعدہ رکھتے نہیں تھے لیکن گالوں پر نمودار ہونے والے چھوٹے چھوٹے بال کبھی کبھی بے قاعدہ داڑھی کا نمونہ پیش کردیتے تھے۔ شکیل صاحب میں ایسی سادگی اور ایسا خلوص تھا کہ ان کے ملاقاتی' دوست اور شاگرد بھی متاثر ہوتے تھے اور ہر حال میں ان کی باتوں سے لطف اٹھاتے تھے۔" شکیل اور ان کی شاعری ، متاع خودی ص ۹

اس طرح کا احساس قیصر شمیم کے ایک دوسرے مضمون " ذکر ایک دوست کا " کے مطالعہ سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے اپنے ساتھی اسد الزماں کے حالات زندگی رقم کیے ہیں۔ کلکتہ سے تیس پینتیس کیلو میٹر دور ہگلی محسن کالج میں اسد صاحب کے تقرر کے بعد کے معاملات ذرا ملاحظہ فرمائیے :

"ستائیس سال تک ہر روز کلکتے سے ٹرین کے ذریعہ سفر کر کے اپنے کالج تک پہنچنے میں انھیں کتنی مشقت اٹھانی پڑتی تھی' یہ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ تانتی باغ (کلکتہ) میں اپنی رہائش گاہ سے رپن اسٹریٹ کراسنگ تک پیدل' وہاں سے بس یا ٹرام کے ذریعہ سیالدہ اسٹیشن' سیالدہ اسٹیشن سے بذریعہ ٹرین نئی ہٹی' وہاں اتر کر لانچ سے دریا عبور کر کے چنسورہ گھاٹ اور چنسورہ گھاٹ سے ہگلی محسن کالج تک پھر پیدل! ستائیس سال تک اسدؔ کا یہی معمول تھا۔" (ذکر ایک دوست کا)

اسی طرح فراغ روہوی کے سلسلے میں قیصر شمیم یوں رقم طراز ہیں :

"فیرس لین' کلکتہ کی ساؤتھ ٹرانسپوز (ٹرانسپورٹ کمپنی) کے دفتر میں چلے جائیں۔ وہاں انگریزی لباس میں ملبوس' گورے چٹے اور نہایت چاق و چوبند ایک صاحب ہندستانی یا تیلگو میں ساؤتھ انڈین ڈرائیوروں سے الجھتے ہوئے یا ان ڈرائیوروں کے کاغذات سامنے رکھے کلکولیٹر پر کھٹا کھٹ کر کے روپے ادا کرتے

www.taemeernews.com

نظر آئیں گے۔ وہی اس دفتر کے علی بھائی ہیں اور ہمارے فراغ روہوی۔ فراغ کا اصل نام محمد علی صدیقی ہے اور قلمی نام فراغ روہوی۔

فراغ روہوی جس ماحول میں ملازمت کرتے ہیں وہ انتہائی غیر شاعرانہ ہے۔ اس کے باوجود ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا کہ وہ کوئی غزل، نظم، رباعی، دوہا، کہہ مکرنی یا ماہیانہ کہتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے شاگردوں میں فراغ سب سے زیادہ زود گو واقع ہوئے ہیں اور گذشتہ دس بارہ سال سے سب سے زیادہ ان ہی کی تخلیقات ہندوپاک اور امریکا و کینیڈا کے رسائل و جرائد کی زینت بنتی رہی ہیں۔"

(چھمیاں چھمیاں راہر و چھمیاں چھمیاں ص ۸)

قیصر شمیم کے مضامین کے مطالعے سے اس بات کی بھی آگاہی ہوتی ہے کہ وہ زودنویسی سے پرہیز کرتے ہیں۔ غالباً "کم کم کہو سنبھل کے کہو شان سے کہو" کے مصداق کم کم لکھنے کے قائل ہیں مگر لوازمات مضمون نگاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور ان کے ساتھ پوری طرح نباہ کرتے ہوئے مضمون سپرد قلم کرتے ہیں۔ زبان و بیان پر خاصی توجہ صرف کرتے ہیں۔ اکثر کئی جملے تحریر کرنے کی بجائے آپ ایک ہی خوبصورت جملے سے اس طرح کام لیتے ہیں کہ قاری کا ذہن ان کے قلم کی روانی کا معترف ہو جاتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے "سانس کی دھار" میں شامل پیش لفظ "جواز" اور "پہاڑ کاٹتے ہوئے" میں شامل "دائرے" کے مطالعے سے مندرجہ بالا خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

تبصرے :- قیصر شمیم کی نثر نگاری کے ضمن میں ان کے متوازن اور مدلل تبصرہ کا ذکر آنا لازمی ہے۔ وہ اپنے تبصروں میں بھی حسب معمول زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ صاحب کتاب کے اوصاف رقم کرتے ہوئے ان کی بعض لغزشوں کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں لیکن اس بات کا بخوبی خیال رکھتے ہیں کہ ان کے اس عمل سے کسی کی دل شکنی نہ ہو بلکہ اس سے مزید تحریک پیدا ہو۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں جارحانہ انداز بیان نظر نہیں آتا۔ وہ بعض دیگر مبصرین کی طرح اپنی علمیت کا ڈھنڈورا پیٹنا پسند نہیں کرتے۔ ان کے تبصرے "رعب زادہ" نہیں بلکہ سلیجھے ہوئے اور مدلل انداز میں نظر آتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں صرف چند مختصر مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں :

- "کوئی ڈیڑھ دو ماہ پہلے میرے پاس ایک کتاب آئی۔ تبصرہ کے لیے سرورق پر نظر ٹک گئی۔ کتاب کی پیشانی پر کتاب کا نام "چھوٹا سا!" پورے

www.taemeernews.com

سرورق پر مصنف کی تصویر بڑی سی۔ اندر کے اوراق الٹے۔ ایک عدد دیباچہ۔ کئی عدد چھوٹے بڑے ادیبوں کی رائیں۔ ذہن میں ایک سوال پڑ گیا! پاؤں سلامت ہوں تو بیساکھیوں کی کیا ضرورت؟ کتاب اٹھا کر الماری میں رکھ دی۔"

ایلاف - شاعر رؤف خیر - سہ ماہی "انکشاف"

"بند ہوتا ہوا بازار۔ میں مظہر امام نے اپنے سابقہ مجموعوں کی نظمیں اس قدر ترمیم و تنسیخ کے بعد شامل کی ہیں کہ ان کا اصل رنگ و روپ ضائع ہو گیا۔ شاعر کی ترمیم و تنسیخ کا نزلہ خاص طور سے زخم تمنا کی نظم "بے کشش" پر اترا ہے جسے زیر تبصرہ مجموعے میں "سرکش" کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ اپنی اصل صورت میں یہ نظم دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے حصے میں عورت کا کردار تھا اور دوسرے حصے میں مرد کا ____ اب وہی نظم ترمیم و تنسیخ کی زد میں آ کر اتنی مختصر ہو گئی کہ اس میں صرف عورت کا کردار باقی رہ گیا اور مرد کا کردار سرے سے غائب ہے!"

بند ہوتا ہوا بازار - شاعر مظہر امام

"ایک طویل ادبی عمر گزار لینے کے بعد بھی اپنے فکر و فن پر اعتماد نہ ہو تو شاعر دو کوڑی کا بھی نہیں رہتا۔ لیکن اپنے فن پر اعتماد کا ہونا ایک بات ہے اور درجۂ کمال حاصل کر لینا دوسری بات! شرار سخن کا ایک سرسری مطالعہ بھی قاری کو اس نتیجے تک پہنچا سکتا ہے کہ رباعیات کے اس مجموعے میں موضوعات کا اچھا خاصا تنوع موجود ہے۔ لیکن یہ تنوع کچھ اسی طرح کا ہے جو بالعموم کسی جنرل اسٹور میں نظر آتا ہے جہاں کم سے کم قیمت کی اور زیادہ سے زیادہ قیمت کی بہت ساری اشیا ایک ساتھ دستیاب ہو جاتی ہیں۔"

شرار سخن - ناوک حمزہ پوری

"ڈاکٹر فاطمی نے مقالے میں اپنی زبان کی سطح بلند رکھی ہے لیکن جہاں تک صحتِ زبان کا تعلق ہے انھیں بحیثیت صدر شعبۂ اردو (بی ڈی ویمنس کالج، پٹنہ) جس احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا اس کی کا احساس کہیں کہیں ہوتا ہے۔ کم از کم ایسی غلطیوں کو کاتب کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔

۱) لڑکپن ہی سے ذہانت کی شہرت تھی۔ جو بعد میں ظہور پذیر ہوئی۔

www.taemeernews.com

ص ۳۲ [یعنی ذہانت ظہور پذیر ہونے سے پہلے ہی شہرت حاصل کرچکی تھی!]

۵) بہار صاحب کے مراثی میں ایک نئی جدت اور نیا پن نظر آتا ہے۔ ص ۹۸ [بدعت کے معنی]

۶) اس میں افسانگی بھی یہی ہے۔ ص ۱۰۰ [کیا نظارہ سے نظارگی، شعلہ سے شعلگی وغیرہ بنانے والوں میں ڈاکٹر صاحب بھی شامل ہیں؟ مفہوم ادا کرنے کے لیے "افسانویت" جیسا لفظ تو سامنے ہی تھا!]

(بہاریہ۔ بہار حسین آبادی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ و انتخاب از: ڈاکٹر ذیشان فاطمی)

کتابوں کے فلیپ پر درج آرا :- دلچسپ بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے قیصر شمیم نے مضامین کم لکھے ہوں لیکن مختلف شعرا و ادبا کی کتابوں پر درج ان کی آرا کی تعداد کسی قدر کم نہیں ہے۔ میرے پیش نظر بیشتر کتابوں کے فلیپ ہیں جن پر قیصر شمیم کی مختصر آرا موجود ہیں جنھیں اگر یکجا کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے گی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان آرا کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو قیصر شمیم کی مختصر نویسی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ اپنی مختصر رائے میں مکمل مضمون پیش کرنے کے ہنر سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ ثبوت کے طور پر مندرجہ ذیل آرا ملاحظہ فرمائیں :

"شمس صابری ترقی پسند افسانہ نگار تھے، لیکن ذہنی غلامی سے آزاد! ان کی ترقی پسندی نے انسان دوستی کی کوکھ سے جنم لیا تھا جس کا اظہار جا بہ جا ان کے افسانوں میں ہوا ہے۔ انھوں نے جس زندگی کے افسانے لکھے ہیں وہ ـــــ کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یا کسی "آئی وری ٹاور" سے ـــــ تخیل کے سہارے دیکھی ہوئی زندگی نہیں تھی۔ وہ دراصل ان کی اپنی زندگی تھی جس کے دکھ سکھ کا ایک ایک لمحہ ان کی روح کی گہرائیوں سے ہوکر گزرا۔ دھند اور کرن میں گھری ہوئی اس زندگی کے آگے روشنی کی کچھ لکیریں بھی تھیں۔ شمس صابری کا ایمان انھیں لکیروں پر۔ اور یہی ان کی قوت تھی۔" (دھند اور کرن۔ پشت کور)

میری شاعری نہ آباو اجداد کا ورثہ ہے نہ استادوں کا عطیہ۔ شاعری میرا پیشہ بھی نہیں ہے اور "سنڈے پینٹرز" کی طرح اتوار کا مشغلہ بھی نہیں ہے۔ میرے نزدیک شاعری ساعتوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کے عمل سے ملتا جلتا ایک عمل ہے لیکن سخت تر اور لطیف!"

ساعتوں کا سمندر - ص ۳۳

www.taemeernews.com

''یار حشمت! کمال کرتے ہو۔ آٹھ آٹھ گھنٹے روزانہ جوٹ مل کی مشینوں سے لڑنا وہ بھی اس طرح کہ ماتھے کا پسینہ ایڑی تک پہنچ جائے۔ اس پر یہ عالم کہ فرصت کے اوقات میں نہ کسی سیاسی کام سے جی چرانا، نہ کسی سماجی خدمت سے ہاتھ کھینچنا۔ نہ تخلیقی عمل سے باز آنا اور نہ شعر و ادب کی محفلوں سے گریز کرنا۔

کیفی اعظمی جیسے شعرا کی طرح تمھاری آنکھوں میں بھی ہمیشہ ایک خواب رہا ہے۔ بہتر دنیا کا خواب! ناقد تمھاری شاعری کے لفظ لفظ کو اپنی ترازو میں تولیں گے۔ کاش کوئی اس خواب کو بھی تول سکے!''

پیچ و تاب۔ سرورق کے اندر کا فلیپ

ترتیب و تدوین :- قیصر شمیم نے دھند اور کرن (شمس صابری مرحوم کے افسانے) کی ترتیب و تدوین کے علاوہ متعدد درسی کتابیں بھی ترتیب دی ہیں۔ ہفتہ وار ہوڑہ ٹائمز کی ادارت کی ذمے داری سنبھالی تو خوبصورت اداریے لکھے۔ افسوس کہ ہوڑہ ٹائمز کی کاپیاں دستیاب نہیں ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں قیصر شمیم کی نثر نگاری کا احاطہ کرنا ادب کے مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کے لیے ممکن نہیں۔ میں نے صرف یہ کوشش کی ہے کہ ان کے منتشر نثر پاروں کی طرف شائقینِ ادب کی توجہ مبذول ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ خدا سے دعا گو ہوں کہ قیصر شمیم کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''لفظ بولتے ہیں'' اور ''منوج مترا کے ڈرامے'' (بنگلہ ڈراموں کے ترجمے) کے علاوہ ان کے دیگر نثری فن پارے کتابی صورت میں جلد شائع ہو جائیں تاکہ ناقدینِ ادب ان کی نثری خدمات کا صحیح طور سے جائزہ لے سکیں اور مجھ جیسے طالب علم کے لیے مزید اکتسابِ فیض کا سامان مہیا ہو جائے!

قیصر شمیم کے دو اشعار

خواہشوں کا جال بنتا ہے تو 'بن' پاگل نہ بن
زندگی کی آنکھ کا بہتا ہوا کاجل نہ بن

ہے سمندر میں تو رکھ گہرائیوں کا وصف بھی
سرپھری موجوں کی صورت سطح کی ہلچل نہ بن

www.taemeernews.com

क़ौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council For Promotion of Urdu Language

M/o. HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India,
West Block-1, R. K. Puram, New Delhi-66
Ph : 26109746, 26169416 Fax : 26108159 E-mail : urducoun@ndf.vsnl.net.in

قومی اردو کونسل کی نئی مطبوعات

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا

اہلِ اردو کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر' جو بین الاقوامی معیار کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ اس کا سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔ مکمل آٹھ جلدوں پر مشتمل، چھ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

قیمت:- 1555/- روپے

جامع انگریزی اردو لغت

مرتب : کلیم الدین احمد

محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہلِ علم و قلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات و معانی کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ لغت دنیا کے کسی بھی موضوع پر انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔ اس میں تمام مروجہ علوم و فنون سے متعلق انگریزی / اردو الفاظ و اصطلاحات کا ایک جامع ذخیرہ موجود ہے۔ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی یہ پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت ہے جو کونسل کی ایما پر تیار کی گئی ہے۔

قیمت: (مکمل سیٹ) -/3400 روپے

تاریخِ ادب اردو

مرتبہ : سیدہ جعفر، گیان چند جین

پانچ جلدوں پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں اردو ادب کے عہد اولیں کے تمام مہیا مواد کا تحقیق شدہ نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب کی مختلف تاریخوں میں یہ تاریخ اپنی خصوصیات کے باوصف منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ محققین، اساتذہ، اہلِ علم و قلم، طلبہ اور عام اردو داں حضرات کے لیے ایک بہترین تحفہ۔

قیمت: فی جلد -/170 روپے، مکمل سیٹ: 850 روپے

کلیاتِ پریم چند

مرتب : مدن گوپال

اردو فکشن کے بنیاد گزاروں میں منشی پریم چند کا نام سرِفہرست ہے جنھوں نے ناول اور مختصر افسانے کی اصناف کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انھیں وقار اور اعتبار بھی بخشا۔ منشی پریم چند کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اردو سے ہوا تھا، پھر وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے اور وہاں بھی اپنے عہد کی سب سے بڑی ادبی شخصیت کہلائے۔ کونسل نے پریم چند کی تمام تحریریں اس کلیات میں جمع کر دی ہیں جو 24 جلدوں پر مشتمل ہے۔

22 جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

22 جلدوں میں کی قیمت -/3395 روپے

www.taemeernews.com

क़ौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council For Promotion of Urdu Language

M/o. HRD. Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India,
West Block-1, R. K. Puram, New Delhi-66
Ph : 26109746, 26169416 Fax : 26108159 E-mail : urducoun@ndf.vsnl.net.i

قومی اردو کونسل کی نئی مطبوعات

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف : تاراچند

ہندستان کی تحریکِ آزادی کی ایک مبسوط تاریخ جو ڈاکٹر تاراچند جیسے مورخ نے تحریر کی ہے۔ جلد اول میں یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کا ارتقا، مغلیہ سلطنت کا زوال، جلد دوم میں 1857ء سے لے کر 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام، جلد سوم میں 1885 تحریکِ عدم تعاون اور چوتھی جلد میں 1 1 تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

صفحات: 2728 قیمت: -/794 روپے (چار جلدوں میں)

آثارالصنادید (مکمل تین جلدوں میں)

مرتب : ڈاکٹر خلیق انجم

آثارِ قدیمہ ہمارا عظیم تہذیبی ورثہ ہیں جن کا تعلق کسی ایک قوم یا مذہبی فرقے سے نہیں ... کتاب میں دلی کے آثارِ قدیمہ ... مختلف علوم و فنون سے تعلق ... مضمون کا بھی ذکر ہے جس سے کتاب کی اہمیت دوچند ہوگئی۔ آثار ... کا پہلا ایڈیشن 7 1 میں شائع ہوا تھا۔ یہ ... ایڈیشن اسی پہلے ایڈیشن کی ... گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں کی دست برد سے جو آثارِ قدیمہ محفوظ رہ گئے ہیں ان کی موجودہ حالت بھی اس میں بیان کردی گئی ہے۔

صفحات: 1138، قیمت: -/717 روپے

کلیاتِ میر (جلد اوّل)

مرتب : ظلِ عباس عباسی / تصحیح و اضافہ : احمد محفوظ

"کلیاتِ میر" کے اس نسخے کی بنیاد ظلِ عباس عباسی مرحوم کے مرتب کردہ نسخے پر ہے جو پہلی بار 1968ء میں شائع ہوا تھا اور جو مکمل دیوان غزلیات پر مشتمل تھا۔ اس ایڈیشن میں کتابت اور قرأت کی وہ غلطیاں دور کردی گئی ہیں جو متن میں در آئی تھیں اور وہ اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو دوسرے معتبر ماخذ سے حاصل ہوئے ہیں۔ ابتدا میں میر کی زندگی اور شاعری پر مستقل قسم کی تحریریں اور ان کے اہم اقتباسات بھی شامل ہیں۔ میر کے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک گراں بہا تحفہ ہے۔

صفحات: 870، قیمت: -/336 روپے

چلڈرن بک ٹرسٹ کی کتابیں اردو میں

قومی اردو کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ اور بچوں کا ادبی ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کی ذہنی تربیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ ان کتابوں سے بچوں کی تفریح بھی ہوتی ہے اور ان کی معلومات میں اضافہ بھی۔ کتابوں میں دی گئی خوبصورت تصاویر بچوں کو بے حد پسند آئیں گی۔

مکمل سیٹ (125 کتابیں) کی قیمت: 3472 روپے

انفرادی طور پر بھی ان کی جلدیں خریدی جاسکتی ہیں۔

نوٹ : اس کے علاوہ ... ادبیات، تاریخ، سائنس، طب و بچوں کے ادب پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔

... کے لیے 40% رعایت۔

www.taemeernews.com

"رباعی نمبر" اور "قیصر شمیم نمبر" کے بعد

دو ماہی "دستخط" بارک پور کی اب ایک عظیم الشان پیشکش

انشاءاللہ آئندہ شمارہ

عالمی حمد نمبر

ہوگا

روح پرور ☆ ایمان افروز ☆ عشق کے جذبات سے لبریز

سابقہ تمام شماروں سے ضخیم ☆ دستاویزی حیثیت کا حامل ☆ معیاری ☆ دیدہ زیب

۵۰۰ سے زائد قدیم و جدید شعراء کرام کے حمدیہ کلام پر مشتمل اس شمارے کی قیمت

صرف ۲۰۰ روپے ☆ بیرون ممالک : ۱۰ امریکی ڈالر

رقم بھجوا کر اپنی کاپی بک کروالیں۔

اہلِ قلم حضرات سے مؤدبانہ التماس ہے کہ التجاوحسنِ طلب سے پاک کم سے کم

دو منتخب حمد اور حمدیہ شاعری سے متعلق بصیرت افروز مضامین سے ہمیں نوازیں۔

تخلیقات ۳۱ مارچ ۲۰۰۶ تک درج ذیل پتوں پر مطلوب ہیں۔

مدیر : اختر بارک پوری

آڈٹ پوسٹ روڈ "نئی بستی" پوسٹ : بارک پور، کولکاتا۔ 700120

(033) 2593 2640

مرتب : فراغ روہوی

۶۷ مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کولوٹولہ اسٹریٹ) کولکاتا - ۷۳ - ۰۰۰

فون : 2519 2235 (033) موبائل : 94331 58258

www.taemeernews.com

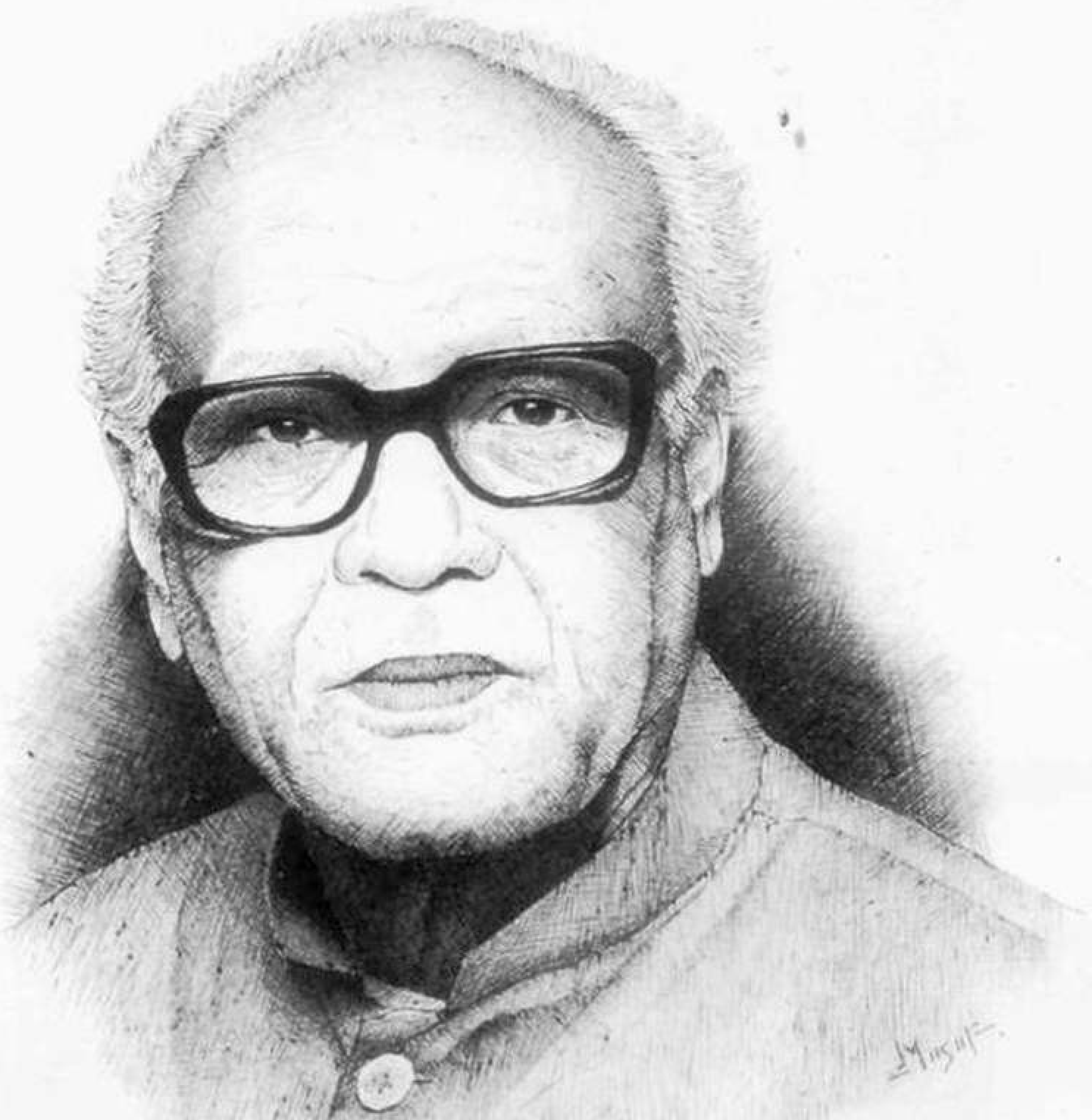

ہمارے جسموں کو موجیں نگل گئیں قیصرؔ
کہ ساعتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

قیصر شمیم

www.taemeernews.com

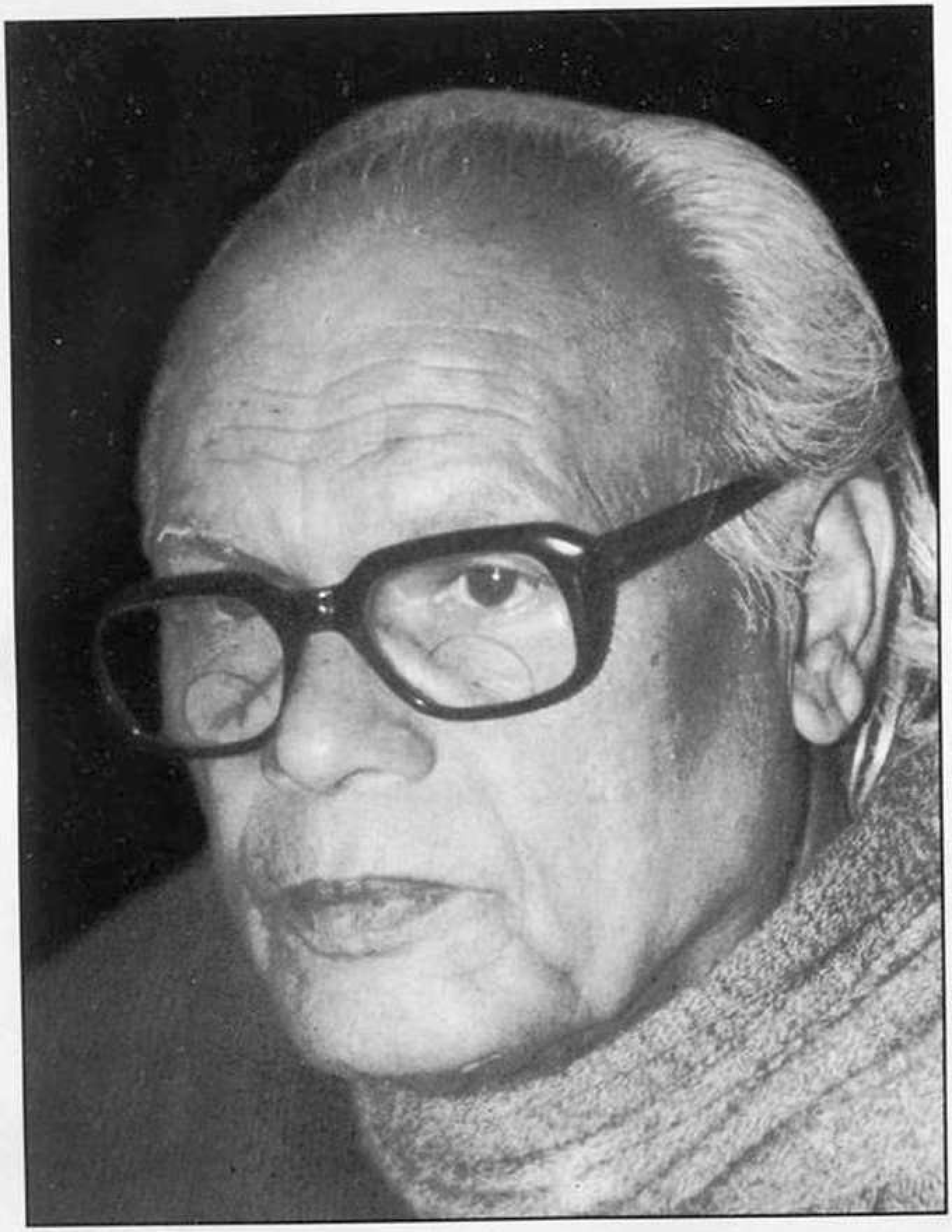

ابھی تو کاٹ رہی ہے ہر ایک سانس کی دھار
اجل جب آئے تو دیکھوں کہ انتہا کیا ہے

قیصر شمیم

www.taemeernews.com

1 2 3 قیصر شمیم عمر کے مختلف ادوار میں

4 قیصر شمیم اپنی شریکِ حیات نجمہ قیصر کے ساتھ

www.taemeernews.com

1 قیصر شمیم (اپنی فیملی) عرفان الحیات، عشرت جہاں ، نجمہ قیصر ،شفا حیات اور ارسلان حیات کے ساتھ

2 قیصر شمیم اپنے والد ماجد عبدالرحیم خاں، نجمہ قیصر (شریک حیات)، سلطانہ حشمت، نجمی ، واجدہ تبسم (خواہر)
اور فرزند عرفان الحیات کے ساتھ

www.taemeernews.com

1 اعزاز افضل، قیصر شمیم کو شال پیش کرتے ہوئے

2 مغربی بنگال اسمبلی کے اسپیکر ہاشم عبدالحلیم، قیصر شمیم کو عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ پیش کرتے ہوئے

3 اردو پریس کلب، دہلی کے اعزازیہ کے موقع پر سابق گورنر بھشم نرائن سنگھ قیصر شمیم کو سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے ساتھ میں مظہر امام اور پیغام آفاقی (صدر جلسہ)

4 دشانتر کی طرف سے اعزاز پاتے ہوئے

5 کلکتہ یونیورسٹی میں قیصر شمیم، پروفیسر مظفر حنفی، ڈاکٹر یوسف تقی اور ڈاکٹر شمیم انور کے ساتھ

www.taemeernews.com

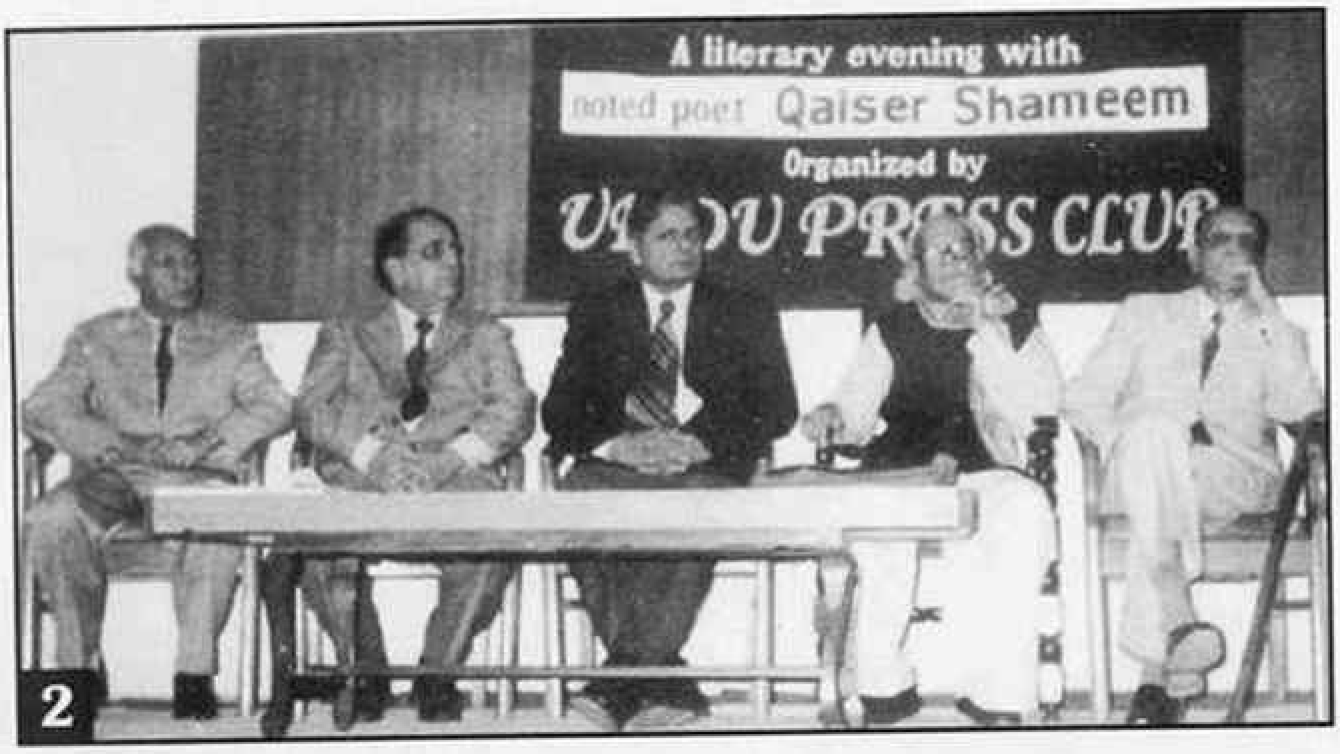

1 علقمہ شبلی، احمد رئیس، فراغ روہوی، ابومحفوظ الکریم معصومی، عطاالحق صدیقی (مالک ترکش) انیس رفیع اور قیصر شمیم

2 مظہر امام، قیصر شمیم، پیغام آفاقی، پروفیسر قمر رئیس اور وسیم الحق (مدیر، اخبار مشرق)

3 فراغ روہوی، قمر رئیس، پیغام آفاقی، وصی احمد نعمانی، طارق فیضی، قیصر شمیم، بیگم وصی احمد نعمانی، مظہر امام اور مشتاق انجم

www.taemeernews.com

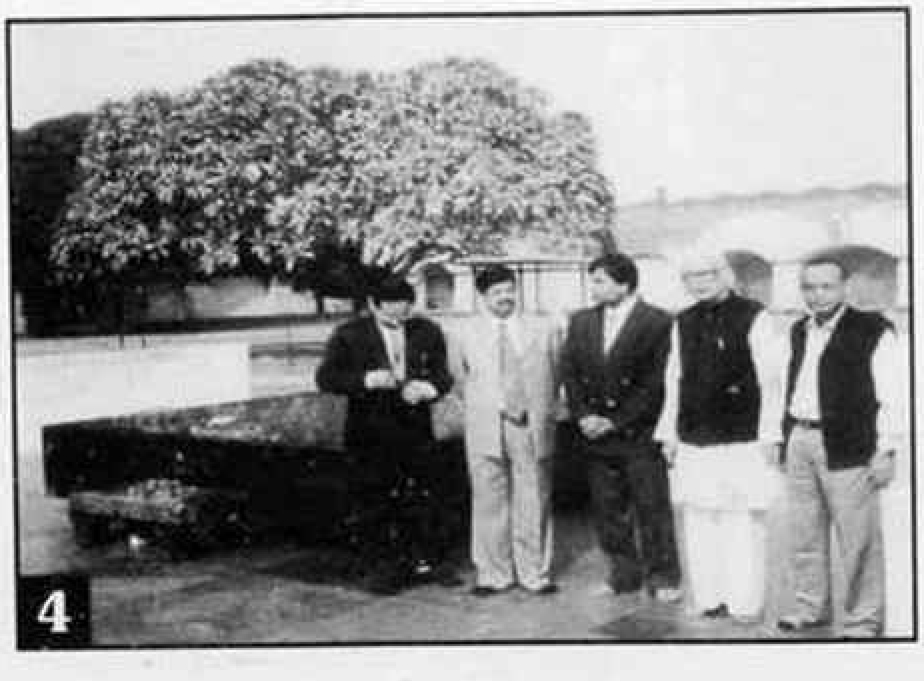

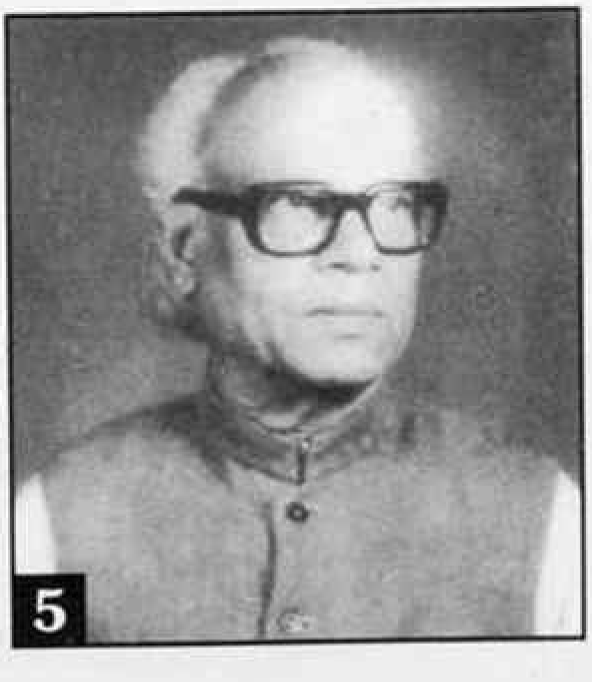

1 روضۂ حضرت نظام الدینؒ پر سید حسن، ڈاکٹر محمد عقیل، شبیر احمد، فراغ روہوی، قیصر شمیم اور مشتاق انجم

2 قیصر شمیم تاج محل کے لان میں

3 مزار غالب پر سید حسن، فراغ روہوی، قیصر شمیم، ڈاکٹر محمد عقیل، شبیر احمد اور مشتاق انجم

4 مہاتما گاندھی کی سمادھی (راج گھاٹ) پر سید حسن، قیصر شمیم، مشتاق انجم، شبیر احمد، فراغ روہوی

5 قیصر شمیم

www.taemeernews.com

1 قیصر شمیم، مولانا حکیم محمد زماں حسینی کے ساتھ

2 قیصر شمیم، محمد سلیم (وزیر اقلیت، حکومت مغربی بنگال) فراغ روہوی اور محسن باعشن حسرت کے ساتھ

3 قیصر شمیم، مظہر امام کے ساتھ

4 قیصر شمیم، رضوان اللہ کے ساتھ

5 قیصر شمیم، معین اعجاز کے ساتھ

6 قیصر شمیم، سید منیر نیازی، ڈاکٹر ہری کنور رائے، فراغ روہوی اور طالب صدیقی کے ساتھ

www.taemeernews.com

1

2

3

1 ف. س. اعجاز، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، علقمہ شبلی، مظہر امام اور قیصر شمیم

2 فراغ روہوی، شبیر احمد، ڈاکٹر عبدالصمد، قیصر شمیم، ظہیر انور اور احمد رئیس

3 ف. س. اعجاز، سعید پریمی، رفعت شمیم، ظہیر انور، فراغ روہوی، قیصر شمیم، سید حسن اور شاہد فروغی

www.taemeernews.com

1 ''پہاڑ کاٹتے ہوئے'' کی رسم رونمائی پر پروفیسر نصر غزالی، قیصر شمیم، پروفیسر اعزاز افضل، علقمہ شبلی اور پروفیسر سلیمان خورشید

2 سعید الزماں، محمود ایوبی، سید منیر نیازی اور قیصر شمیم

3 قیصر شمیم، ایک تقریب میں حامی گورکھپوری کو پھولوں کا ہار پہناتے ہوئے

www.taemeernews.com

1 سالک لکھنوی، قیصر شمیم، انیس رفیع اور آنجہانی سنتوکھ سنگھ معصوم

2 صلاح الدین پرویز، نوشاد نوری، قیصر شمیم، پروفیسر اعزاز افضل اور پروفیسر سلیمان خورشید

3 قیصر شمیم ڈراما فیسٹیول میں ظہیر انور و دیگر افراد کے ساتھ

www.taemeernews.com

1 قیصر شمیم "سہ ماہی کائنات" کے پرنٹ ایڈیشن کا اجرا کرتے ہوئے ساتھ میں مدیر کائنات خورشید اقبال، اعزاز افضل اور علقمہ شبلی

2 قیصر شمیم، فراغ روہوی کے مجموعہ غزلیات "ذرا انتظار کر" کی رسم رونمائی ادا کرتے ہوئے

3 قیصر شمیم

4 جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں فراغ روہوی کی نئی شعری تصنیف "جب ہم بھی بڑے ہو جائیں گے" کی رسم رونمائی کے موقع پر ڈاکٹر شہپر رسول، پروفیسر اختر الواسع، قیصر شمیم اور فراغ روہوی

www.taemeernews.com

1

2

3

1 قیصر شمیم کوی سمیلن میں، مائک پر ہندی کے ایک مشہور کوی شری نول جی رچنا سناتے ہوئے

2 قیصر شمیم کل ہند مشاعرے میں اپنا کلام پیش کرتے ہوئے

3 "سانس کی دھار" کی رسم اجراء پر ڈاکٹر مظفر حنفی، قیصر شمیم، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر اعزاز افضل، علقمہ شبلی، رونق نعیم اور سید منیر نیازی

www.taemeernews.com

1

2

3

4

1 ساہتیہ اکیڈمی میں مشتاق انجم، شبیر احمد، فراغ روہوی، رینوموہن بھان، قیصر شمیم، شرما جی اور سیّد حسن

2 قیصر شمیم

3 فراغ روہوی، قیصر شمیم اور جاوید دانش

4 قیصر شمیم دہلی میں

www.taemeernews.com

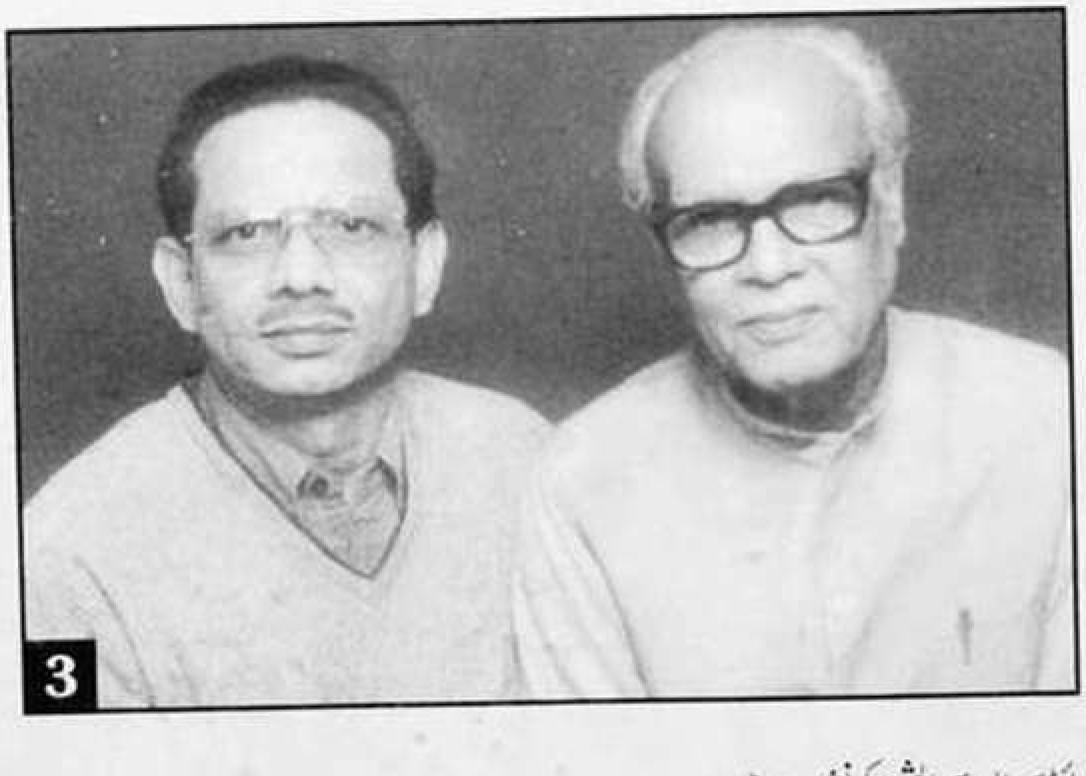

1 قیصر شمیم، احسن شفیق اور ایم علی رائٹرس ایسوسی ایشن کی نشست میں

2 قیصر شمیم مسلم انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے

3 قیصر شمیم، فراغ روہوی کے ساتھ

www.taemeernews.com

ہوا تھی تیز تو فانوس میرے ہاتھوں کا
تمھاری شمع کی لو کو سنبھالتا ہی رہا

قیصر شمیم

www.taemeernews.com

باذوق قارئین کے لیے

ہماری کتابیں،

خوب صورت کتابیں

گلستاں پبلی کیشنز ، کلکتہ (انڈیا)

Kitabi Silsila

Ph :(033) 2593 2640

Dastkhat

Qaiser Shameem Number

Out Post Road, Nai Basti, Post : Barrackpur, Kolkata-700 120

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

(پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت ۱۹۹۸ء میں قائم شدہ مرکزی یونیورسٹی)

ملک کی واحد یونیورسٹی جہاں روایتی اور فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت صرف اردو میڈیم میں تعلیمی سہولتیں دستیاب ھیں۔

فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت :

* دوسالہ پی جی کورس : ایم.اے.اردو
* دوسالہ ڈگری کورس : بی ایڈ
* تین سالہ ڈگری کورسز : بی.اے، بی.ایس.سی.اور بی.کام.
* ایک سالہ ڈپلومہ کورس : ٹیچ انگلش
* چھ ماہی سرٹیفکیٹ کورس : غذا اور تغذیہ، کمیونگ، اہلیت اردو بذریعہ ہندی، اہلیت اردو بذریعہ انگریزی اور فنکشنل انگلش

روایتی نظام تعلیم :

* دوسالہ پی جی کورسز : ایم اے اردو، ایم اے انگلش، ایم اے ان کمیونی کیشن اینڈ جرنلزم، ایم بی اے
* ایک سالہ ڈگری کورس : بی ایڈ
* دوسالہ ڈپلوما کورس : ڈپلوما ان ایجوکیشن (ڈی ایڈ)

ریجنل سنٹرس : دہلی، پٹنہ، بنگلور، بھوپال، دربھنگہ اسٹڈی سنٹرس : 88

رابطہ : گچی باؤلی، حیدرآباد 500 032

فون : 040 - 2300 6612, 13, 14 ویب سائٹ : www.manuu.ac.in

Printer, Publisher & Owner : Syed Anwar Husain

Editor : Akhtar Barrackpuri • Compiled By: Paragh Rohvi